شدید اخلاقی بگاڑ میں **زندہ زینب** کو کیسے بچایا جائے؟ ۰۹

www.urdudigest.pk urdudigest.pk

اُردو ڈائجسٹ

فروری ۲۰۱۸ء

سُپر پاور کا مسخرا حکمران

تہلکہ خیز کتاب "**فائر اینڈ فیوری**" کے چشم کُشا انکشافات ۵۲

ائیر مارشل اصغر خان

پاک فضائیہ کو عظیم طاقت بنا دینے والے ناقابلِ فراموش راہنما'

کرپشن اُن کا دامن کبھی داغدار نہ کر سکی ۳۰

بے نظیر بُھٹو کا قاتل کون؟

تجسّس و اسرار سے بھرپور ڈرامائی داستان ۶۸

دنیا کے مہنگے ترین ۱۵ مادے

اربوں روپے قیمت رکھنے والے مادوں کی دلچسپ کہانی ۱۱۲

www. urdugom .com

جدید صحافت کے معمار جناب ضیا شاہد چیف ایگزیکٹو خبریں گروپ کی تہلکہ و فکر انگیز کتب

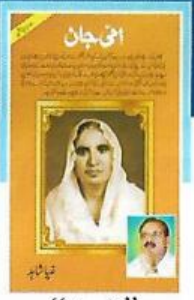

"امی جان"
500 (قیمت)

"باتیں سیاستدانوں کی"
1,200 (قیمت)

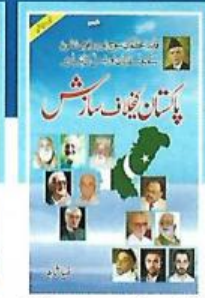

"پاکستان کے خلاف سازش"
800 (قیمت)

"گاندھی کے چیلے"
800 (قیمت)

"ہنستا کھیلتا عدنان"
1,000 (قیمت)

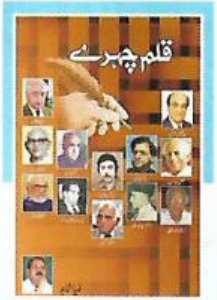

"قلم چہرے"
900 (قیمت)

نورجہاں، دلیپ
900 (قیمت)

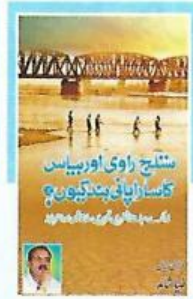

ستلج، راوی اور بیاس (قیمت)
کا سارا پانی بند کیوں؟ 800

○ سنگ میل، لاہور 042-37220100 ○ خزینہ علم و ادب، لاہور 042-37314169 ○ بک کارنر، جہلم 0321-5440882
○ مسٹر بکس، اسلام آباد 051-2278845 ○ سعید بک بنک، اسلام آباد 051-2651656 ○ مقبول اکیڈمی، لاہور 042-37324164
○ ویلکم بک پورٹ، کراچی 021-32633151 ○ گوشہء ادب، کوئٹہ 081-2843229 ○ ہمدرد بک ڈپو، ملتان 0303-9773018
○ کتاب نگر، ملتان 0321-4510444 ○ پارس کتاب گھر، آزاد کشمیر 0300-9545908 ○ شیخ محمد حسن بک سیلر جھنگ 047-7626240

نہ ملنے کی صورت میں قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل، والٹن روڈ لاہور کینٹ سے رابطہ کریں۔
0300-0515101/0333-4393422/0300-8422518/0321-4553271
qalamfoundation3@gmail.com

اللہ کا قرآن

بے شک اے محبوب ہم نے تمہاری طرف وحی بھیجی جیسے وحی نوح اور اس کے بعد پیغمبروں کو بھیجی اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اُن کے بیٹوں اور عیسیٰ اور ایوب اور یونس اور ہارون اور سلیمان کو وحی کی اور ہم نے داؤد کو زبور عطا فرمائی۔ (النِّسآء: ۱۶۳)

پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ آدمی کو خون کی پھٹک سے بنایا۔ پڑھو اور تمہارا رب ہی سب سے بڑا کریم۔ جس نے قلم سے لکھنا سکھایا۔ آدمی کو سکھایا جو نہ جانتا تھا۔ (العلق: ۱ تا ۵)

رسول اللہ ﷺ کا فرمان

حضرت حارث بن ہشامؓ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: یا رسول اللہ! ﷺ آپ کے پاس وحی کیسے آتی ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کبھی وحی میرے پاس گھنٹی کی آواز مثل آتی ہے اور وہ مجھ پر بڑی سخت ہوتی ہے، پس وہ کیفیت وحی مجھ سے دور ہوتی ہے تو میں اُس بات کو یاد کر چکا ہوتا ہوں (جو اس آواز کے ضمن میں کہی جاتی ہے) اور کبھی فرشتہ انسانی شکل میں میرے پاس آتا ہے وہ مجھ سے کلام کرتا ہے۔ پس جو وہ کہتا ہے میں یاد کر لیتا ہوں۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا: میں نے سخت سردی کے دن میں آپ ﷺ پر وحی نازل ہوتی دیکھی۔ جب یہ کیفیت دور ہوتی تو جبین اقدس سے پسینہ بہ رہا ہوتا تھا۔ (بخاری شریف)

www.urdudigest.com

اُردو ڈائجسٹ
فروری 2018ء
جمادی الاول 1439ھ
جلد نمبر 58 شمارہ نمبر 02
urdudigest.pk www.urdudigest.pk

صدر مجلس: ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی
مدیر اعلیٰ: الطاف حسن قریشی
ایگزیکٹو ایڈیٹر: طیب اعجاز قریشی
ڈپٹی ایڈیٹر: سیّد عاصم محمود
سب ایڈیٹر: عافیہ مقبول جہانگیر
مجلس تحریر: ڈاکٹر آصف محمود جاہ، سلمیٰ اعوان
مہتمم طباعت: فاروق اعجاز قریشی
انچارج کمیونیکیشن: افنان کامران قریشی
ڈیزائنر و کمپوزر: کاشف شہزاد، فیصل ایوب

مارکیٹنگ
ڈائریکٹر: ذکی اعجاز قریشی 0300-8460093

اشتہارات
advertisement@urdudigest.pk
مینیجر ایڈورٹائزمنٹ: 0320-4437564
لاہور: ندیم حامد 0300-4242620

سالانہ خریداری 560 روپے کی بچت کے ساتھ
خریداری کے لیے رابطہ subscription@urdudigest.pk
فون: +92-42-35290707
پاکستان 1560 کے بجائے 1000 روپے میں
بیرون ملک 100 امریکی ڈالر
اُردو ڈائجسٹ گھر بیٹھے حاصل کیجیے
اندرون و بیرون ملک کے خریدار اپنی رقم بذریعہ بینک ڈرافٹ
درج ذیل اکاؤنٹ نمبر پر ارسال کریں
URDU DIGEST Current A/C No.
Pk18 BPUN 1100 0280 0380 0000
Bank of Punjab (Samanabad, Lahore.)
Branch Code No. 110

ادارتی آفس
اپنی تحریریں اِس پتے پر بھیجیں
325, G-III جوہر ٹاؤن، لاہور
فون نمبر: +92-42-35290738 • فیکس: +92-42-35290731
ای میل: editor@urdudigest.pk
قیمت: 100 روپے
طابع و ناشر الطاف حسن قریشی نے اردو ڈائجسٹ پرنٹرز 24۔ سرکلر روڈ سے چھپوا کر سمن آباد لاہور سے شائع کیا

تربیت دینے والے ہاتھوں کی تلاش

ایگزیکٹو ایڈیٹر نوٹ

پاکستانی قوم کی یہ خوش قسمتی ہے کہ تمام تر خرابیوں کے باوجود سیاست، فوج اور بیوروکریسی میں ایسے جوہر قابل ضرور سامنے آ گئے جنھوں نے اپنی محنت، ذہانت اور جوش و جذبے سے مملکت خداداد کی بنیادیں رکھ دیں۔

اُن گنی چُنی ہستیوں میں ایک روشن ہستی ائیر مارشل اصغر خان بھی تھے۔ انھوں نے اپنی پوری جوانی پاک فضائیہ کے نام کر دی اور اُسے ایسا توانا و مضبوط ادارہ بنایا کہ قومی تاریخ میں سنہرے حروف سے اپنا نام لکھوا دیا۔ کسی نے اُن جیسے قائدین کے بارے میں ہی کہا ہے: ”میں ایسی فوج سے بالکل نہیں ڈرتا جس میں شیروں کی قیادت ایک بکری کر رہی ہو۔ میں اس فوج سے خوفزدہ ہوتا ہوں جس میں بکریوں کی قیادت و سیادت ایک شیر کے ہاتھ میں ہو۔“

اصغر خان حقیقتاً شیر جیسے دلیر راہنما تھے۔ جذبۂ حب الوطنی سے بھرپور ان کی شاندار راہنمائی میں پاک فضائیہ کے جوان بھی ایسے نڈر و بہادر سپاہی بن گئے جنھوں نے خصوصاً جنگ ستمبر میں اپنی بے مثال کارکردگی سے کہیں زیادہ بڑے و طاقتور دشمن کے دانت کھٹے کر دیے۔ موجودہ شمارے میں دو خصوصی تحریریں (صفحہ نمبر ۳۰ اور ۴۲) اصغر خان مرحوم کی ذی شان و تابناک حیات و خدمات کو خوبصورتی سے اُجاگر کرتی ہیں۔

اصغر خان مرحوم کا کہنا تھا: ”پاکستانی قوم میں بے پناہ جذبۂ تعمیر موجود ہے لیکن اُسے صحیح خطوط پر تربیت دینے والے ہاتھ میسّر نہ آ سکے۔“ یقین واثق ہے، جس دن پاکستان کو اہل اور دیانت دار قیادت نصیب ہوئی، یہ ملک اپنے مسائل سے چھٹکارا پا کر راہِ ترقی پر شان سے گامزن ہو جائے گا۔ پاکستانی قوم بے تابی سے دیانت دار اور تربیت دینے والے ہاتھوں کی منتظر اور کھوج میں ہے۔

تاریخ کا ایک انوکھا اور بے رحم سبق یہ بھی ہے کہ نااہل لیڈر اپنے کرتوتوں سے ایک ترقی یافتہ اور خوشحال ملک کو تباہی و بربادی کے گڑھے میں دھکیل سکتے ہیں۔ گویا کسی خوشحال ملک کو نامعقول راہنما مل جائے، تو اس کے اقبال و عروج کا پہیہ اُلٹی سمت چلنے لگتا ہے۔ ایسے نالائق لیڈروں کی نمایاں و حالیہ مثال امریکی صدر، ڈونلڈ ٹرمپ ہے۔

جناب ٹرمپ کی پے در پے غلطیوں اور احمقانہ پالیسیوں کے باعث صرف ایک برس میں امریکا کُل عالم میں استہزا کا نشانہ بن چکا۔ حتیٰ کہ افریقا کے غریب ممالک میں اس کے خلاف نفرت بڑھ رہی ہے۔ ڈونلڈ ٹرمپ کسی لحاظ سے عہدۂ صدارت پر فائز ہونے کا اہل نہیں تھا۔ اس کی گھٹیا اور بدکردار شخصیت ”فائر اینڈ فیوری“ کتاب نے سنسنی خیز طریقے سے بے نقاب کر دی۔ اسی کی تلخیص ”میں نے کیسا بیٹا پیدا کر دیا“ کے نام سے (صفحہ نمبر ۵۲ پر) شاملِ اشاعت ہے۔ کتاب کے انکشافات سے واضح ہے کہ ٹرمپ ذاتی پسند و ناپسند کی بنیاد پر امریکی حکومت چلا رہا ہے اور اس کا انداز کار بھی بے تکا اور الٹکل پچو ہے۔ عین ممکن ہے کہ اس انوکھے صدر کی نارواحرکات سے امریکا کا زوال تیز تر ہو جائے۔

یہ امریکا ہی ہے جس کے باعث پچھلے تین عشروں سے پاکستان خانہ جنگی کا نشانہ بنا ہوا ہے۔ امریکی پالیسیوں پر عمل درآمد سے پاکستانی معاشرے میں سیاسی، مذہبی اور معاشرتی اختلافات نے جنم لیا اور مختلف گروہ ایک دوسرے سے نبرد آزما ہو گئے۔ شمارے میں شامل چشم کشا داستان ”بے نظیر بھٹو کا قاتل کون؟“ اسی خانہ جنگی کی عبرت ناک قلمی تصویر پیش کرتی ہے۔ (اسے صفحہ نمبر ۶۸ پہ ملاحظہ فرمائیے۔)

ماہنامہ اُردو ڈائجسٹ نے اپنے آفیشل فیس بک پیج پر ایک انعامی مقابلے کے تحت قارئین کو آپ بیتی کی دعوت دی ہے۔ قارئین نے اس تحریری مقابلے کو بہت پذیرائی بخشی۔ انشاء اللہ مستقبل میں بھی یہ انعامی مقابلہ جاری رہے گا۔

اس کو شروع کرنے کا مقصد یہ ہے کہ قارئین اُردو ڈائجسٹ میں دلچسپ و مفید تحریریں لکھنے کا جذبہ پروان چڑھایا جا سکے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس انعامی مقابلے کی بدولت بہت سے قارئین اپنے اندر پوشیدہ قلم کار کو دریافت کر سکیں گے۔

دور جدید میں مختلف وجوہ کی بنا پر کثیر تعداد میں ہم وطن نفسیاتی مسائل کا نشانہ بن رہے ہیں۔ یہ امر پاکستانی معاشرے میں انتشار اور بے چینی بڑھا رہا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا مرد و خواتین کو مناسب راہنمائی نہیں ملتی اور نہ ہی ان کا موزوں علاج ہو پاتا ہے۔

نفسیاتی امراض کی بڑھتی تباہ کاری مدنظر رکھ کر قارئین کے دیرینہ مددگار ڈائجسٹ نے ایک نئے سلسلے ”مشورہ حاضر ہے“ (صفحہ نمبر ۱۲۶) کا آغاز کیا ہے۔ اس میں مستند اسپتال سے وابستہ ماہر نفسیات اپنے تجربے و علم کی روشنی میں نفسیاتی مسائل کے حل پیش کریں گے۔ کسی قاری کو کوئی بھی نفسیاتی مسئلہ درپیش ہو، وہ اس نئے سلسلے کی مدد سے اُسے دور کر سکے گا۔ صحت مند قوم مضبوط پاکستان کی بنیاد ہے۔

طیب اعجاز قریشی

پڑھیے، پڑھائیے، سیکھیے اور لطف اُٹھائیے

www.urdugom.com

فہرست

کچھ اپنی زباں میں

انتہائی سنگین قومی مسئلہ... آزادی کے غلط تصور نے حالات کو گمبھیر بنا دیا ہے — الطاف حسن قریشی — ۰۹

ہم کہاں کھڑے ہیں

اندھی طاقت کا لرزتا نظام... اس معاشرتی زلزے کے آثار پاکستان میں ظاہر ہونے لگے — الطاف حسن قریشی — ۱۲

ملاقات

ائیر مارشل اصغر خان... قومی تاریخ کے ایک اہم راہنما سے لیا گیا تاریخی انٹرویو — الطاف حسن قریشی — ۳۰

یادِ رفتگاں

مسعود احمد برکاتی... بچوں کے محبوب مدیر کا سبق آموز خاکہ — غلام حسین میمن — ۱۹

پاک فضائیہ کا معمار... ایک با اُصول اور دیانت دار فوجی افسر کی سرگزشت — عاصم محمود — ۴۲

اسلامی زندگی

عمال کا حساب... حضرت عمر بن عبدالعزیز کا دورِ حکومت اور عدل و انصاف — رشید اختر ندوی — ۱۷۷

کشمیریات

مسلمانوں کو اقلیت میں بدلنے کی بھارتی سازش... ایک گھناؤنے کھیل کی داستان — افتخار گیلانی — ۲۱

افسانے/کہانیاں

شرارت کی پڑیا... دوسروں کی ناک میں دم کر دینے والے بچے کا سبق آموز ماجرا — صالحہ محبوب — ۶۵

سن سیٹ بلیوارڈ... اُس اداکارہ کی کہانی جو اپنے تابناک ماضی میں ہی جی رہی تھی — گلزار — ۷۸

سونے کا ہار... وہ برادری کے سامنے کسی بھی حال میں سُرخرو ہونا چاہتا تھا — احمد ندیم قاسمی — ۸۴

خاموش دل کی فریاد... ایک نیک انسان کا منفرد قصہ جسے اپنی نیکی کا صلہ خوب ملا — وقار عثمان — ۱۰۶

تلخیص کتب — ۵۲

ٹرمپ کی ماں نے کہا "میں نے کیسا بیٹا پیدا کر دیا!"

بدنام ٹرمپ کی شرمناک سرگرمیاں افشا کرتی تہلکہ کتاب میں پڑھیے

سید عاصم محمود

انکشافات — ۶۸

اُسامہ بن لادن نے حکم دیا "بے نظیر بھٹو کو مار ڈالو"

ابو صارم

نفسیات — ۱۲۶

مشورہ حاضر ہے

ڈاکٹر فیاض ہرل

دلچسپ و عجیب — ۱۱۲

ارم ناز

دنیا کے ۱۵ قیمتی مادے

ثم ربّ کی کس کس نعمت کو... کفر پہ آمادہ ایک نادان لڑکی کی روح پرور داستان — محمد ذکی احمد — ۱۳۹

آپ بیتی/جگ بیتی

قوسِ قزح... سہانے سپنے آنکھوں میں سجا لینے والی ایک عورت کی غمناک کتھا — اکبر بادشاہ — ۵۰

میری چلی موٹر پم پم... پاکستانی بسوں کی دلچسپ تاریخ جو اب لگژری بن چکیں — سعد فاروقی — ۱۰۹

بوائے اسکاؤٹ... دنیا بھر میں سیر و سیاحت کرنے والے سیاح کی دلچسپ یادیں — مقصود احمد چغتائی — ۱۸۶

منتخب کالم

چار بڑے فیصلے... جنہوں نے برطانیہ میں انقلاب برپا کر دیا تھا — جاوید چودھری — ۸۱

غیر ملکی ادب

تقدیر کی چال... سنہرے مستقبل سے محروم ہو جانے والے بدنصیب بوڑھے کا قصۂ الم — عدیل مہدی — ۹۲

آخری پتا... ایک مددگار نے گور کنارے پہنچی مریضہ میں ہمت و توانائی بھر دی تھی — مہر افروز — ۱۳۱

شکستہ پَر... ایک ماں کا لازوال مادرانہ جذبہ عجب امتحان میں گرفتار ہو گیا — سراج الدین احمد نظامی — ۱۷۴

سفرنامے

شاہوں کے دیس میں... ایران میں بسر کیے گئے چند شب و روز کا احوال — ہاجرہ رضا — ۹۷

عرفہ کا مقدس کنواں... اللہ تعالیٰ کے ایک برگزیدہ نبی کی مثالی داستانِ حیات — ڈاکٹر آصف محمود جاہ — ۱۴۵

طنز و مزاح/فکاہیہ

ساس بہو کی دل لگی... اُس خاتون کا قہقہہ بار قصہ جس کے ارمان ادھورے رہ گئے — ابوالفرح ہمایوں — ۱۲۱

تکلیف دہ تکلف... میزبانوں کی مہمان نوازی اس شرمیلے نوجوان کے گلے پڑ گئی — گل رعنا — ۲۲۳

تجرباتِ زندگی

نیکی کا سفر... راہ سے بھٹکی بیٹی کو صحیح راستہ دکھلانے والی جہاں دیدہ ماں کی انمول کتھا — طاہرہ کامران — ۱۲۴

اباجی فارغ ہی ہیں... ملازمت سے سبکدوشی کے بعد پیش آنے والے واقعات — محمد فاروق عزمی — ۱۵۰

www.urdugem.com

کمپیوٹر سائنس

۱۰ بہترین سافٹ وئیرز... کمپیوٹر میں روزمرّہ کا کام سہل بنانے والے پروگرامز — راؤ محمد شاہد اقبال — ۱۳۴

غذائیات

سبز سونا... معدنیات اور حیاتین سے بھرپور ایک قدرتی نعمت — حکیم محمود احمد برکاتی — ۱۴۲

شکاریات

آدم خور کے پیچھے پیچھے... جب درندے کو موت کی گرفت تک پہنچانا کٹھن ہوگیا — کیپٹن ایس ایم خلیل — ۱۶۶

حیوانیات

مکھیوں کی رانی... اللہ تعالیٰ کی ننھی وانوکھی مخلوق کے حیران کُن حقائق — محمد خلیل چودھری — ۸۹

کھیل کھلاڑی

کرکٹ کے دلچسپ واقعات... کھیلوں کی دنیا میں جنم لینے والے دلچسپ واقعات — رانا محمد شاہد — ۱۷۲

قومی ثقافت

بلوچستان کے رسم ورواج... بلوچی تہذیب وتمدن کی دلچسپ قلمی جھلکیاں — شوکت علی شاہ — ۲۰۹

اخلاقیات

نافرمان اولاد... جھوٹی انا اور غرور کے مارے دو انسانوں کی عبرت انگیز کہانی — ڈاکٹر محمد وسیم اکبر شیخ — ۲۱۵

جرم وسزا

رُخِ مرگ... مجرم کے ہاتھوں کی معمولی سی لرزش نے قانون کا پھندا تنگ کردیا — انجم فاروق ساحلی — ۲۱۷

ایجادات

صابن کھانے والی لڑکی... اس نے صفائی ستھرائی کی شے مرغوب غذا بنالی — رانا محمد شاہد — ۲۲۱

مستقل سلسلے

شاعری... ۱۸۹ تبصرۂ کتب..... چمن خیال.....

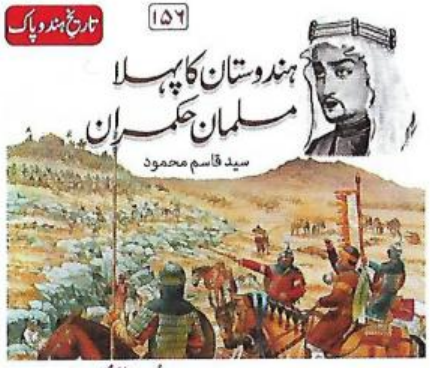

انتہائی سنگین قومی مسئلہ

زوال پزیر معاشرے میں نت نئے مسائل سر اٹھاتے اور ہنگامے اٹھاتے رہتے ہیں۔ گزشتہ دنوں زینب اور عاصمہ کے دل دہلا دینے والے واقعات نے پوری سوسائٹی کو ہلا کے رکھ دیا۔ مجرموں کی گرفتاری کے لیے شہر شہر مظاہرے ہوئے جس پر سپریم کورٹ بھی حرکت میں آ گئی اور پولیس کے اعلیٰ حکام کی سرزنش ہونے لگی۔ انھیں گرفتاری کے لیے ۷۲ گھنٹے کی ڈیڈ لائن بھی دی گئی جس سے یہ خوف پیدا ہوا کہیں پولیس اپنی جان چھڑانے کے لیے کسی بے گناہ کو مجرم قرار نہ دے ڈالے، بالآخر پولیس کا بوسیدہ نظام دو ہفتے گزر جانے کے بعد عمران نامی شخص کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ پولیس ذرائع دعویٰ کررہے ہیں کہ ملزم نے اعتراف جرم بھی کرلیا ہے اور اس کا ڈی این اے ٹیسٹ بھی میچ ہوگیا ہے۔ یہ بھی انکشاف ہوا ہے کہ وہ زینب کے محلے ہی میں رہتا ہے اور اس کا قریبی رشتے دار بھی ہے۔ بلاشبہ عوامی احتجاج، ٹی وی مباحث، فاضل چیف جسٹس میاں ثاقب نثار، وزیراعلیٰ پنجاب شہباز شریف اور مختلف اداروں، ایجنسیوں اور فرانزک لیبارٹری کی مدد سے ملزم گرفت میں آ گیا ہے۔ اس کے بارے میں مزید معلومات سامنے آئی ہیں کہ یہ اس کی آٹھویں واردات تھی اور وہ لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے مقتولہ زینب کے جنازے میں بھی شامل ہوا اور احتجاج کرنے والوں میں پیش پیش تھا۔ اس واقعے سے اندازہ ہوتا ہے صاحبان نظر یہ محسوس کررہے ہیں کہ عوام ایک نہایت ہی خطرناک اخلاقی بحران میں گھرتے جارہے ہیں کیونکہ بچوں کا عدم تحفظ پوری نسل کو نفسیاتی بیماریوں سے دوچار کردے گا، اس لیے ہمارے حکمرانوں، منصوبہ سازوں، تعلیمی اداروں، ماہرین عمرانیات اور بچوں کے والدین کو اس انتہائی سنگین مسئلے کا پائیدار حل تلاش کرنے کے لیے اپنی تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ سرگرم عمل رہنا ہوگا۔

www.urdugem.com

اس ضمن میں سب سے پہلے اُن اسباب کا صحیح طور پر تعین ضروری ہے جو ہمارے معاشرے میں جنسی بے راہ روی پھیلا رہے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ ہم بچوں کے ساتھ زیادتی اور اُن کی ہلاکت کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ کم ظرف لوگوں میں دولت کی فراوانی آجانے سے زندگی کے شریفانہ رویے تبدیل ہوتے گئے اور اخلاقی بندھن ڈھیلے پڑ گئے ہیں۔ بدنامی کے خوف سے ناخوشگوار واقعات پردے میں رکھے جاتے رہے جس کے سبب مجرموں کے حوصلے اس قدر بڑھے کہ انھوں نے دو سال اور چار سال کی بچیوں کو بھی اپنی ہوس کا نشانہ بنانے اور اُنہیں قتل کرنے کا شیطانی کھیل اپنا لیا۔ اب یہ مجرم بہت طاقتور مافیا بن چکے ہیں اور بااثر لوگ اُن کی پشت پر ہیں جن کا کاروبار عوام کے اخلاق تباہ کرنے سے چمکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل نظر سالہا سال سے اس امر پر گہری تشویش کا اظہار کرتے آئے ہیں کہ ہمارے بعض ٹی وی چینلز، کیبلز اور سوشل میڈیا پر بچوں کی نہایت فحش فلمیں دکھائی جا رہی ہیں جن سے لوگوں کے اخلاق بگڑتے اور گھٹیا نفسانی خواہشات پرورش پا رہی ہیں۔ بدقسمتی سے مذہبی راہنماؤں، اخلاق کے علمبرداروں اور سول سوسائٹی کے نمائندوں نے ان فلموں کے خلاف کوئی آگاہی پیدا کی نہ رائے عامہ کو منظم کرنے میں کوئی دلچسپی لی۔ اخبارات بھی خاموش رہے اور عوام کے نمائندے بھی، چنانچہ عریانی اور فحاشی میں اضافہ ہوتا گیا۔ امیر جماعت اسلامی قاضی حسین احمد (مرحوم) نے عریانی کے خلاف سپریم کورٹ میں پٹیشن دائر کی تھی مگر وہاں اہل علم عریانی کی تعریف ہی پر متفق نہ ہو سکے اور کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ برائی بلا روک ٹوک پھل پھول رہی ہے۔ اس تناظر میں ہمیں سب سے پہلے خرابی کا یہ منبع بند کرنا ہوگا جس کے لیے قومی سطح پر کامل شعور کے ساتھ ایک تحریک چلانا اور ایک سائنٹیفک طرز عمل اختیار کرنا ہوگا۔

اس مسئلے کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ والدین اپنے بچوں کی نگہداشت سے بڑی حد تک بے پروا دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ان کی اخلاقی تعلیم و تربیت پر دھیان دیتے ہیں نہ یہ معلوم کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ وہ کہاں جاتے ہیں اور کن کی صحبت میں رہتے ہیں۔ انھوں نے اپنے نونہالوں کو ڈرائیوروں، خادموں، غیر ذمے دار رشتے داروں اور نامعلوم خیر خواہوں کے سپرد کر دیا ہے جو عام طور پر اُن کے اغوا اور ان کے ساتھ زیادتی کا باعث بنتے ہیں۔ فرد کی آزادی کے غلط تصور نے بھی حالات کو گمبھیر بنایا ہے۔ اب محلے کا بزرگ بچے سے نہیں پوچھ سکتا کہ تم کہاں اور کس کے ساتھ جا رہے ہو۔ پہلے اہل محلہ ان باتوں پر نگاہ رکھتے اور غلط روش پر بچوں کو ٹوکتے بھی تھے۔ ماں باپ بھی اپنی کم سن اولاد سے یہ نہیں پوچھ سکتے کہ تم وقت کہاں گزارتے ہو اور تمہارے مشاغل کیا ہیں۔ اس بے پروائی سے بچے تحفظ سے محروم

ہوتے جاتے اور بُری صحبت میں بیٹھنے سے بُری عادتیں اختیار کر لیتے ہیں۔ عدم تحفظ کی روک تھام کے لیے والدین کو اپنے بچوں کی نگہداشت پر پوری توجہ دینا اور ان کی کردار سازی میں گہری دلچسپی لینا ہوگی کہ وہ ان کا اور پوری قوم کا قیمتی سرمایہ ہیں۔

اس مسئلے کے ایک بہت اہم پہلو کا تعلق ہماری پولیس اور عدلیہ کے نظام سے ہے۔ صرف شہر قصور میں بچیوں کی ہلاکت کی سات وارداتیں ہوئیں، مگر کوئی مجرم گرفتار ہوا نہ اسے عبرت ناک سزا دی گئی۔ اس کی بڑی وجہ پولیس کی غفلت، نااہلی اور شرمناک حد تک غیر ذمے دارانہ طرز عمل ہے۔ اس کی مخبری کا نظام کرپشن کی نذر ہو چکا ہے جو جرائم پیشہ عناصر اور اوباش لوگوں پر کڑی نظر رکھتا تھا۔ عدالتوں سے مجرم چھوٹ جاتے ہیں کہ پولیس مقدمہ درست خطوط پر تیار نہیں کرتی اور عدالتیں حکم امتناعی جاری کرنے میں احتیاط سے کام نہیں لیتیں۔ ریاست اور معاشرے کی تمام قوتوں کو اس نظام کے اندر بنیادی تبدیلیوں کے لیے اعلیٰ منصوبہ بندی اور مستقل مزاجی سے کام لینا ہوگا۔ رہی یہ تجویز کہ بچوں کو ہر نوع کی زیادتی سے محفوظ رکھنے کے لیے ان کے نصاب میں جنسی تعلیم شامل کی جائے، ہمارے خیال میں اس کے مضر اثرات زیادہ ہوں گے۔ اس کا مغربی ممالک میں تجربہ نقصان دہ ثابت ہوا ہے۔ وہاں بچوں کو جنسی تعلیم ایک مدت سے دی جا رہی ہے مگر بچوں کے ساتھ زیادتی کی شرح میں اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔ اس کے بجائے اخلاقی تعلیم و تربیت کے اثرات بہت حوصلہ افزا برآمد ہوں گے اور کڑی سزائیں جرائم کی روک تھام اور سدباب میں بہت مددگار ثابت ہوں گی۔ آج وقت کی سب سے اہم ضرورت تحفظ اطفال کمیشن کا قیام ہے جس میں وہ افراد شامل کیے جائیں جو سائنٹیفک طور پر اسباب و عوامل کا جائزہ لیتے ہوئے ہماری اخلاقی اور معاشرتی قدروں کے مطابق اصلاح احوال کا لائحہ عمل ترتیب دیں۔ ہمیں یقین ہے کہ مربوط اور مثبت کوششوں سے بچوں کے لیے ایک صحت مند اور سازگار فضا پروان چڑھے گی جس میں ہماری نئی نسل اعلیٰ صفات سے مزین ہوگی۔ اس کے لیے قومی قیادت اور عوام کو ہر لحظہ چوکس رہنا ہوگا۔ اس امر پر بھی غور و خوض ہونا چاہیے کہ بچوں کے ساتھ زیادتی کرنے والوں کو چوراہوں میں پھانسی دی جائے تاکہ لوگ عبرت پکڑیں اور شیطانی کھیلوں سے باز رہیں۔ یہ تجویز بھی غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے کہ ایسی بھیانک واردات کرنے والوں کا مقدمہ انسداد دہشت گردی کی عدالت میں چلایا جائے۔ ان اقدامات سے ہر لحظہ سنگین تر ہوتے قومی مسئلے کا مؤثر حل دریافت کیا جا سکے گا۔

الطاف حسن قریشی

www.urdugem.com

اندھی طاقت کا لرزتا ہوا نظام

آج دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں ایک بڑی تبدیلی کے دہانے پر کھڑی ہیں، کیونکہ اندھی طاقت کی حکمرانی کا نظام لرزہ براندام ہے۔ اس معاشرتی زلزلے کے اثرات پاکستان میں بھی ظاہر ہونے لگے ہیں۔

الطاف حسن قریشی کے قلم سے

یہ مقولہ غالباً ہر زبان میں مستعمل ہے کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ طویل عرصے تک لاٹھی ہی کی حکمرانی قائم رہی ہے، لیکن جوں جوں شعور بیدار ہوتا گیا، قانون، مساوات اور معاشرتی انصاف کے نظریات اجتماعی زندگی کے بنیادی ستون قرار پائے۔ ان کا پرچار بھی ہوتا رہا اور وہ کہیں کہیں نظامِ حکومت کا حصہ بھی نظر آئے۔ پھر فرد کی آزادی کا غلغلہ بلند ہوا جس نے قوموں کی تاریخ بدل کے رکھ دی۔ لوگوں کے ذہن تبدیل ہونے لگے اور عالمگیر تحریکوں نے بہت سہانے خواب دکھائے۔ اقوامِ متحدہ کا قیام انہی آدرشوں کی تکمیل کے لیے عمل میں آیا تھا کہ اندھی طاقت کو لگام دی جائے، دنیا میں غربت کا خاتمہ ہو اور انسانیت سکھی رہے۔ آج یہ محسوس ہوتا ہے کہ پردۂ زنگاری میں دیو استبداد ہی چھپا ہوا ہے اور اندھی طاقت مختلف صورتوں اور شکلوں میں ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ اندھی طاقت صرف لاٹھی کا نام نہیں۔ دراصل جہالت اور ارتکازِ دولت، نفسانی خواہشات، بے قابو جذباتیت اور سامراجی ذہنیت بھی ہولناک اندھی طاقتیں ہیں جو کرۂ ارض پر خوف طاری کیے ہوئے ہیں۔ پہلے یورپ نے ہتھیار کی طاقت سے غیر یورپی اقوام کو اپنا غلام بنائے رکھا اور اس استحصال کے خطرناک نتائج بیسویں صدی کی دو عظیم جنگوں میں برآمد ہوئے۔ کروڑوں انسان زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے اور علاقے کے علاقے کھنڈرات میں تبدیل ہو گئے۔ امریکا نے ایٹم بم گرا کر جاپان کے دو شہر صفحۂ ہستی سے مٹا دیے اور لاکھوں انسان زندگی اور موت کی جاں گسل کشمکش سے دوچار ہوئے۔

دوسری جنگِ عظیم جس نے پورے یورپ اور جاپان کے بخیے ادھیڑ ڈالے تھے، اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ نوآبادیات یکے بعد دیگرے آزاد ہوتی گئیں۔ اس طرح اقوامِ متحدہ میں ان آزاد شدہ ملکوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ ایک نیا جہان آباد ہو رہا تھا جس میں سامراجی طاقتوں کی بالادستی ختم کرنے کے عزائم انگڑائیاں لینے لگے تھے۔ اس میں بڑے لیڈر اور باغی لیڈر پیدا ہوئے جو اپنے عوام کی طاقت سے امریکی سپر پاور کے لیے بہت بڑے چیلنج کی حیثیت اختیار کر گئے تھے جن

کو دوسری سپر پاور سوویت یونین کی نظریاتی، سیاسی اور مالی اعانت دستیاب تھی۔ دراصل اس نے غیر جانب دار تحریک (نیم) میں ۹۰ سے زائد ممالک شامل کر لیے تھے۔ ان میں انڈونیشیا، بھارت، یوگوسلاویہ، مصر اور افغانستان بڑے نمایاں تھے۔ امریکی قیادت کی بے رخی سے دلبرداشتہ ہو کر جنرل ضیاء الحق نے بھی 'نیم' کی سربراہ کانفرنس میں شرکت کی جو ہوانا میں منعقد ہوئی تھی جس میں افغانستان کے صدر نور محمد ترکئی بھی آئے تھے۔ ترکئی چند ہفتے بعد ہی قتل کر دیے گئے جو فی الواقع غیر جانب دار پالیسی پر کاربند رہنا چاہتے تھے۔ میری ان سے تفصیلی ملاقات ہوئی جس میں انہوں نے کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اُن کی باتیں سن کر مجھے اُن کی سلامتی کے بارے میں خطرہ محسوس ہونے لگا۔ سوویت یونین نے گرم پانیوں تک پہنچنے کے لیے افغانستان میں فوجیں اتار دیں۔ اس پیش قدمی سے پاکستان کی قومی سلامتی کے لیے خطرات پیدا ہوئے۔ جنرل ضیاء الحق نے مسلم اُمہ کے تعاون سے افغانستان کا دفاع کیا۔ بعد میں امریکا بھی افغان مجاہدین کی مدد کو پہنچا اور انہیں جدید اسلحہ اور فوجی تربیت فراہم کی۔ دس برسوں پر محیط جنگ میں روسی فوجوں کو شکست کھا کر واپس جانا پڑا جس کے نتیجے میں سوویت یونین ٹوٹ گیا، وسطی ایشیا کی ریاستیں آزاد ہو گئیں اور امریکا کو دنیا کی واحد سپر پاور کا درجہ حاصل ہو گیا۔ اس مقام پر پہنچ کر اس کے تیور بدل گئے اور اس کی اندھی طاقت نئے نئے گل کھلانے لگی۔

***

افغانستان میں امریکا سے تعاون کی بھاری قیمت پاکستان کو ادا کرنا پڑی جس نے اپنا مقصد حاصل کرنے کے بعد پاکستان کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں اور اس پر سخت پابندیاں عائد کر دیں۔ پہلے امریکا بھارت کے مقابلے میں پاکستان کو ترجیح دیتا اور فوجی اور مالی امداد بھی فراہم کرتا تھا، لیکن واحد سپر پاور بن جانے کے بعد پاکستان اور بھارت کے ساتھ یکساں برتاؤ کرنے کا تاثر دیا۔ بعض امریکی صدر بھارت جانے سے پہلے پاکستان آتے، لیسگن ۲۰۰۰ء میں صدر کلنٹن نے پہلے بھارت میں چھ دن قیام کیا اور واپسی پر صرف چند گھنٹے بڑے ناز نخروں کے بعد اسلام آباد میں گزارے۔ ان کی طرف سے واضح پیغام دیا گیا تھا کہ اب پاکستان کے ساتھ تعلقات کی نوعیت یکسر تبدیل ہو گئی ہے۔ پاکستان کے اندر اس بدسلوکی پر شدید ردِعمل ہوا، مگر ریاست کی سطح پر اس کا اظہار نہ ہو سکا، کیونکہ جنرل پرویز مشرف سے منتخب حکومت کا تختہ اُلٹ دینے کا جرم سرزد ہوا تھا جس سے وہ عالمی برادری میں اچھوت بن گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب امریکا نے افغانستان پر حملہ کرنے کے لیے پاکستان کا تعاون حاصل کرنا چاہا، تو جنرل پرویز مشرف نے ہر حکم کی بے چون و چرا تعمیل کی۔ اسے ہوائی اڈے اور فضائی اسپیس کے علاوہ انٹیلی جنس سروس فراہم کی۔ اس پر خوش ہو کر امریکی صدر جارج بش نے جنرل مشرف کے ساتھ رقص کیا اور پاکستان کو اپنا اسٹریٹیجک پارٹنر قرار دیا۔ یہ بھی کہا کہ اس بار تعلقات کا یہ رشتہ پائیدار ہو گا، مگر یہ ساری باتیں ریت کی لکیریں ثابت ہوئیں۔ امریکا حیرت انگیز تیزی سے بھارت کی طرف جھکتا گیا۔ صدر اوباما نے اسے سول ٹیکنالوجی منتقل کرنے کی پیشکش کی اور اس کے سپلائر گروپ کا رکن بن جانے میں بھی غیر معمولی دلچسپی لی۔ وہ بھارت گئے، مگر پاکستان کی طرف رخ نہیں کیا جبکہ صدر ٹرمپ تو پاکستان کو کھلی دھمکیاں دینے لگے ہیں اور ان دھمکیوں پر عمل کرتے ہوئے کرم ایجنسی میں افغان مہاجرین کیمپ پر ڈرون حملہ بھی کر دیا ہے۔ معاملات ایسا رخ اختیار کرتے جا رہے ہیں جن میں علاقائی اور عالمی امن کو ایک خطرناک حادثہ پیش آسکتا ہے۔ یہ بھی صاف نظر آ رہا ہے کہ اس بار جنوبی ایشیا یا بعید مشرقی ایشیا میدانِ کارزار بنے گا۔

ایک طرف امریکا سرد جنگ کے پرانے حربے استعمال کر رہا ہے اور عالمی اُفق پر جنگ کے بادل منڈلا رہے ہیں، تو

www.urdugem.com

دوسری طرف پاکستان کے اندر اندھی طاقت اپنے پنجے گاڑتی جارہی ہے۔ دہشت گردی اور مذہبی انتہا پسندی، تشدد کی سیاست کاری، دولت کی ہر لحظہ بڑھتی ہوئی حرص، امیر اور غریب کے درمیان ہولناک معاشرتی اور معاشی فرق، روحانی اور اخلاقی اقدار کا شدید انحطاط، طاقت کے ذریعے فیصلے مسلط کرنے کا رجحان اور سیاسی شعور سے تہی دامن معاشرہ، یہ سارے کے سارے اندھی طاقت کے مظہر ہیں۔ جب تعلیم اور سیاست بھی ایک کاروبار بن جائیں، محرم رشتے بھی نفسانی خواہشات کی بھینٹ چڑھ جائیں، یوٹیوب پر فحش مناظر دکھائے جائیں اور بچوں کے ساتھ زیادتیوں کی ویڈیو فلمیں تیار ہونے لگیں اور وہ سمگل بھی کی جائیں، تو حیا کا دامن تار تار ہو جاتا ہے جو مشرقی اور اسلامی تہذیب کی سب سے قیمتی متاع اور سب سے بڑی معاشرتی اور اخلاقی طاقت ہے۔ اسلام کا یہ عظیم الشان تصور کہ اللہ ہر جگہ موجود ہے، دل میں اٹھنے والے ہر خیال اور اندھیرے اور اُجالے میں کیے جانے والے ہر عمل کا حساب رکھتا ہے، قیامت کے روز ہر شخص اپنے اعمال نامے کے ساتھ پیش ہوگا اور اسے ہر عمل کا جواب دینا ہوگا۔ یہ تصور انسان کو بہت ساری خرابیوں سے بچاتا اور اسے ایک ذمے دارانہ رویہ اختیار کرنے کی طرف راغب کرتا ہے۔ دین کے ساتھ تعلق کمزور پڑ جانے سے اللہ کا یہ تصور ذہنوں سے محو ہوتا جارہا ہے اور اس کی جگہ نفس پرستی نے لے لی ہے۔ وہ شخص جو اللہ کو سمیع و بصیر مانتا اور یوم حساب پر ایمان رکھتا ہو، وہ پینے کے پانی، دودھ، غذائی اشیا اور ادویات میں ملاوٹ کر سکتا ہے نہ پھول ایسی بچیوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بنا سکتا ہے۔ گھروں، درس گاہوں اور سماجی مجلسوں میں دین کے بنیادی اصول اور اس کی آفاقی تعلیمات کو حکمت اور شعور کے ساتھ ذہنوں میں اتارنے اور زندگی کو اخلاقی سانچے میں ڈھالنے کا بہت کم اہتمام کیا جاتا ہے۔ بلاشبہ مذہبی مدارس اچھی خاصی تعداد میں قائم ہیں جن میں عام طور پر مسلکی فقہ کی تعلیم دی جاتی ہے، یوں اسلام کا ایک تمدنی طاقت کا تصور پیدا نہیں ہوتا، تاہم اب اُن کے اندر اصلاحات کا عمل جاری ہے اور جدید علوم بھی پڑھائے جارہے ہیں جس کے حوصلہ افزا اثرات پیدا ہو رہے ہیں۔

✲✲✲

شدید اخلاقی گراوٹ اور تعلیم اور سیاست کو کاروبار کے طور پر اختیار کرنے سے ہمارے سیاسی، تعلیمی، معاشرتی اور عدالتی نظام کے اندر اَن گنت خرابیاں در آئی ہیں جن سے اندھی طاقت کے اثر و نفوذ میں بہت اضافہ دیکھنے میں آرہا ہے۔ اندھی طاقت نے ریاست کو دہشت گردی کے طور طریق سکھائے ہیں۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق انسانی جان کا تحفظ ریاست کی اوّلین ذمے داری ہے، مگر پاکستان میں پولیس مقابلوں میں شہریوں کو موت کے گھاٹ اُتار دینا ایک مشغلہ بن گیا ہے۔ یہ روح فرسا عمل اپنی تمام تر خوں آشامیوں کے ساتھ گزشتہ صدی کی آخری دہائی میں نمودار ہوا۔ کراچی میں مہاجروں سے ہونے والی ناانصافیوں کے ردِعمل میں ایم کیو ایم وجود میں آئی جس نے مخالفین کو ایذا پہنچانے کے ہولناک طریقے ایجاد کیے۔ بند بوریوں میں لاشوں کا انسانیت سوز کلچر بھی اسی نے متعارف کروایا۔ اس کے ظلم جب حد سے بڑھ گئے، تو نواز شریف حکومت کو فوجی آپریشن کرنا پڑا جس کے خوف سے الطاف حسین لندن فرار ہو گئے۔ ۱۹۹۲ء کا آپریشن کامیاب نہیں ہوا۔ اگلے سال انتخابات ہوئے، تو محترمہ بے نظیر بھٹو پاکستان کی دوسری بار وزیر اعظم بنیں۔ انہیں شہری سندھ میں ایم کیو ایم کی ریشہ دوانیوں کا سامنا ہوا، تو اُن کے وزیر داخلہ میجر جنرل (ر) نصیر اللہ بابر نے پولیس کے ذریعے آپریشن کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں اعلیٰ پولیس افسروں کا اجلاس طلب کیا گیا اور ہدایات دی گئیں کہ پولیس مقابلوں کے ذریعے ایم کیو ایم کے شر پسند عناصر کا صفایا کر دیا جائے۔ اس پالیسی کے ساتھ ایک اعلیٰ پولیس افسر نے اختلاف کیا جو

تبدیل کر دیے گئے۔ اس پولیس آپریشن میں قانون پامال ہوا اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی روایات قائم ہوئیں۔ پولیس اہل کاروں کے لیے کسی بھی شہری کو مقابلے میں مار دینا بائیں ہاتھ کا کھیل بن گیا۔ اس جاہلانہ اور سفاکانہ ذہنیت کے ساتھ پولیس نے وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کے بھائی میر مرتضیٰ بھٹو کو پولیس مقابلے میں بڑی بے دردی سے چھلنی کر دیا۔ محترمہ کو خبر ہوئی، تو وہ ننگے پاؤں ہسپتال کے اس کمرے میں پہنچیں جہاں اُن کے بھائی کی لاش پڑی تھی۔ مسلسل اشکباری سے اُن کی آنکھیں سوجھ گئی تھیں اور اُن کی سسکیاں تھمنے کا نام ہی نہیں لیتی تھیں۔ اس پولیس مقابلے میں راؤ انوار بھی شامل تھے۔

راؤ انوار ۱۹۹۶ء سے لے کر ۲۰۱۸ء کے اوائل تک زیادہ عرصے کراچی ہی میں رہے۔ ایس ایچ او سے ایس ایس پی بنے اور اُن کا بیشتر وقت ملیر ڈسٹرکٹ میں گزرا۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں غیر قانونی کاروبار کرنے والوں کے ڈیرے ہیں۔ اسمگلر بھی ہیں اور دہشت گرد بھی اور کسی قدر غیر آباد علاقے بھی۔ کہا جاتا ہے کہ انہیں بڑے طاقت ور سیاست دانوں اور بادشاہ گروں کی پشت پناہی حاصل رہی۔ جناب آصف علی زرداری کا نام تو انتخابات میں بھی آچکا ہے۔ اُن میں یقیناً کچھ ایسی غیر معمولی صلاحیتیں ہیں کہ وہ ایک زمانے میں جنرل پرویز مشرف کے خصوصی معتمدین میں شامل رہے۔ ان کے قریبی لوگ بتاتے ہیں کہ جب آرمی چیف کراچی آتے، تو ان کی گاڑی راؤ انوار چلاتے اور ان کے ساتھ ساتھ رہتے۔ کئی بار یہ بھی ہوا کہ انہوں نے کار میں سوار اپنے ساتھیوں کو چلے جانے کا حکم دیا اور صرف راؤ انوار کے ساتھ سفر کیا۔ اس قربت کی بدولت وہ ایم کیو ایم کے لوگوں کو جعلی پولیس مقابلوں میں پار لگا دینے کے باوجود کراچی میں پولیس افسر کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ اسی طرح میر مرتضیٰ بھٹو پر گولیوں کی بوچھاڑ کرنے والے پولیس افسران احتساب کے عمل سے محفوظ رہے۔ اخباری اطلاعات کے مطابق ایس ایس پی راؤ انوار دو چار نہیں، کوئی ساڑھے چار سو کے لگ بھگ شہریوں کو موت کی نیند سلا چکے ہیں۔ اس کے علاوہ پاکستان کے اندر اور پاکستان سے باہر وہ بڑی بڑی جائیدادوں، پلاٹوں، پلازوں اور بینک اکاؤنٹس کے مالک ہیں جن کی فہرست بڑی طویل ہے۔ راؤ صاحب نے ریاست کے سرکاری دہشت گرد کا مرتبہ حاصل کر لیا تھا اور ان کی طرف دہشت گردوں کا لیبل چسپاں کر کے ہلاکتوں کا سلسلہ دراز ہوتا جارہا تھا، لیکن نظامِ فطرت میں دیر ہے اندھیر نہیں۔ ایک خوبصورت نوجوان نقیب اللہ محسود، جس کا تعلق وزیرستان سے تھا، راؤ انوار کی ٹیم کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس کے خلاف متعلقہ تھانے میں یہ رپورٹ بھی درج کرائی گئی کہ نقیب اللہ جو ایک دہشت گرد تھا، اس نے اپنے گھر سے پولیس پر گولیاں چلائیں اور جوابی حملے میں وہ مارا گیا۔ یہی وہ موقع تھا جب سندھ حکومت اپنے آئی جی پولیس جناب اے ڈی خواجہ کو تبدیل کرنے کے آخری مرحلے میں تھی۔ وفاقی حکومت کے ساتھ ناموں کا تبادلہ بھی ہو چکا تھا، مگر سپریم کورٹ نے مداخلت کرتے ہوئے حکومت کو احکام صادر کیے کہ موجودہ آئی جی اپنے منصب پر کام کرتے رہیں گے۔ اسی کے ساتھ نقیب اللہ کی ہلاکت کی تحقیقات کرنے کی ہدایات بھی جاری کی گئیں۔ آئی جی اے ڈی خواجہ نے تین اعلیٰ پولیس افسروں پر مشتمل تحقیقاتی کمیٹی قائم کر دی جس نے رپورٹ دی کہ نقیب اللہ جعلی پولیس مقابلے میں مارا گیا ہے۔ اس تحقیقاتی کمیٹی نے ایس ایس پی ملیر راؤ انوار کو طلب کیا، مگر اس نے پیش ہونے سے صاف انکار کر دیا اور غیر قانونی طریقے سے دبئی جانے کی کوشش کی جسے ایف آئی اے کے فرض شناس انسپکٹر نے ناکام بنا دیا۔ اب وہ کسی طاقت ور شخصیت کی پناہ میں ہیں اور وہاں سے سندھ پولیس کی اعلیٰ قیادت کے خلاف بیانات جاری کر رہے ہیں۔ اُن کے خلاف ایف آئی آر درج ہو چکی ہے اور چھاپے مارے جارہے ہیں۔ لگتا ہے اُن کا یومِ حساب آپہنچا ہے اور ان کا بھی جنہوں نے سرکاری دہشت گرد پال رکھے ہیں۔

✲✲✲

www.urdudigest.com

جعلی پولیس مقابلوں کے خلاف عوام کے اندر شعور کی ایک لہر اُٹھی ہے۔ میڈیا جس میں پرنٹ، الیکٹرانک کے علاوہ سوشل میڈیا بھی شامل ہے، وہ اگر فرض شناسی کا ثبوت دے، تو یہ لہر ایک بہت بڑی تبدیلی کا زبردست محرک ثابت ہوسکتی ہے۔ پولیس جس پر گاہے گاہے ایک اندھی طاقت ہونے کا گمان گزرتا ہے، اسے شہریوں اور قانون کی محافظ اور پیشہ ورانہ اور اخلاقی طور پر تربیت یافتہ فورس میں ڈھالنا ہوگا۔ اس کے لیے سب سے پہلے اسے سیاسی اثرات سے نجات دلانا اور اس میں خوفِ خدا پیدا کرنا ہوگا۔ سندھ میں سیاسی مداخلت نے پولیس فورس کو امن و امان قائم کرنے کے قابل نہیں چھوڑا۔ یہی وجہ ہے کہ جرائم اور دہشت گردی کا سدِ باب ناممکن ہوگیا تھا۔ روزانہ درجنوں لاشیں گرتیں اور اتنی ہی تعداد میں شہری تاوان کے لیے اغوا کر لیے جاتے۔ ہم سالہا سال سے کراچی کو ڈوبتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ حکمران طبقہ غیر قانونی کام کاج اور عوام کا استحصال کرنے کے لیے پولیس کو استعمال کرنے کا خواہش مند رہتا ہے، اس لیے بدعنوان پولیس افسروں کو اعلیٰ مناصب سونپے جاتے اور تھانے داروں کو فری ہینڈ دیا جاتا ہے۔

صوبہ خیبر پختونخواہ میں آئی جی ناصر درانی نے قابلِ قدر کارنامے سرانجام دیے اور وہ پولیس کے نظام میں ایک تبدیلی لے آئے تھے۔ اُن کے چلے جانے کے بعد مختلف نوعیت کی آوازیں سننے میں آرہی ہیں۔ مردان میں چار سالہ عاصمہ کے ساتھ جنسی تشدد اور ہلاکت کا ذمے دار شخص ابھی تک گرفتار نہیں ہوا۔ نظر نہ لگے پنجاب میں تمام امور وزیر اعلیٰ جناب محمد شہباز شریف انجام دیتے ہیں۔ عام تاثر یہ ہے کہ آئی جی پولیس پنجاب اپنے فیصلوں میں آزاد نہیں، اس لیے پولیس ہر وقت سیاسی دباؤ میں رہتی ہے۔ وزیر اعلیٰ بلاشبہ بڑے متحرک اور بیدار مغز ہیں، لیکن وہ ایک ایسا نظام وضع کرنے میں بری طرح ناکام رہے جو معمول کے مطابق نازک سے نازک اور سنگین سے سنگین معاملات چلانے اور سنبھالنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ قصور شہر میں گزشتہ دو تین برسوں میں دس کے لگ بھگ بچوں اور بچیوں کے ساتھ زیادتیاں اور ہلاکتیں ہوئیں اور بچوں کے ساتھ جنسی زیادتی کی بلیو فلمیں بنتی اور اسمگل ہوتی رہیں، مگر ان جرائم کا تدارک اور سدِ باب نہ ہوسکا، بلکہ پولیس ان بہیمانہ جرائم سے بھی مال بناتی اور مجرمانہ غفلت کا مرتکب ہوتی رہی۔ اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ نظام کس قدر سفاک، بے حس اور خوفِ خدا سے تہی دامن ہے۔ اس سے پہلے کہ اس کے خلاف بغاوت عام ہوجائے، سیاسی قائدین، دینی اسکالرز اور غیر جانب دار منتظمین کو اصلاحِ احوال پر بھرپور توجہ دینا اور اخلاقی روح کو بیدار رکھنا ہوگا۔ اندھی طاقت قوم کو اندھا کر دیتی اور اسے عذاب کا مستحق بنا دیتی ہے۔ اس عذاب سے محفوظ رہنے کے لیے کانسٹیبل سے لے کر تھانیدار اور اعلیٰ مدارج تک پولیس کو شائستگی اور خیر خواہی کا مظہر بنانا اور اسے مختلف ہنگامی صورتوں سے نبرد آزما ہونے کی بہترین تربیت دینا ہوگی۔

***

عدلیہ اندھی طاقت کا استعمال روکنے اور اسے قابو میں رکھنے کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔ ایگزیکٹو اگر اختیارات سے تجاوز کرے یا آئین اور قانون سے بے اعتنائی برتنے لگے، تو اعلیٰ عدالتوں کو ازخود نوٹس لینے کا اختیار حاصل ہے۔ شہریوں کو بروقت انصاف مہیا کرنا بہت بھاری ذمے داری ہے جسے ادا کرنے کے لیے اچھے قانونی دماغ اور مالی وسائل درکار ہیں۔ یہ امر قابلِ تحسین ہے کہ جج صاحبان کے مشاہرے بہت اچھے ہوگئے ہیں اور انہیں ہر ممکن سہولتیں بھی فراہم کی جارہی ہیں، لیکن یہ عوامی احساس شدت اختیار کرتا جارہا ہے کہ عدالتوں سے انصاف ملنے تک بعض اوقات ایک نسل ختم ہوجاتی ہے۔ دادا اگر انصاف حاصل کرنے عدالت گیا تھا، تو مقدمے کا فیصلہ اس کا پوتا سنتا ہے۔ اس نوع کے واقعات بھی ظہور

پزیر ہوئے ہیں کہ مجرم کو پندرہ بیس سال جیل میں گزارنے کے بعد عدالتوں نے بے گناہ قرار دے دیا۔ یہ شکایت عام ہے کہ ماتحت عدالتوں میں کرپشن بھی ہے اور تاخیری حربوں کا چلن بھی عام ہے۔ چیف جسٹس افتخار محمد چودھری جن کو صدر پرویز مشرف نے ملازمت سے برطرف اور گھر میں قید کر دیا تھا، اُن کی بحالی میں وکلا برادری نے سرگرم حصہ لیا۔ بعد میں اس کا ایک منفی پہلو یہ سامنے آیا کہ وکلا کا ایک طبقہ اپنے آپ کو بہت طاقت ور سمجھنے لگا اور اس نے جج صاحبان سے اُلجھنا اور اپنی مرضی کے فیصلوں پر اصرار کرنا شروع کر دیا۔ پھر بار ایسوسی ایشنز کے عہدے داروں نے بڑی تعداد میں مقدمات لینے اور اپنی پوزیشن کا غلط فائدہ اُٹھاتے ہوئے جج صاحبان پر دباؤ ڈالنے کا وطیرہ اختیار کیا۔ اعلیٰ عدالتوں کو سیاسی مقدمات کی بھرمار سے فوجداری اور سول مقدمات غیر معمولی تاخیر کا شکار ہوئے۔ تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق عدالتوں میں اٹھارہ لاکھ سے زائد مقدمات زیرِ التوا ہیں۔ انگریزی کہاوت کے مطابق انصاف میں تاخیر انصاف کے انکار کے مترادف ہے۔ اس کے علاوہ سوموٹو کا جو اختیار آئین میں دیا گیا ہے، اس میں کوئی اپیل نہیں کی جاسکتی۔ اپیل کا حق نہ دینا اسلامی تعلیمات کے منافی اور فطری انصاف کے تصور کے سراسر خلاف ہے۔ اس آئینی اختیار کے تحت سپریم کورٹ کے پانچ فاضل جج صاحبان نے وزیر اعظم نواز شریف کو نااہل قرار دے دیا اور وہ اقتدار سے سبکدوش ہوگئے۔ اس فیصلے نے قانونی اور عوامی حلقوں میں شدید اضطراب پیدا کیا اور قومی سیاست میں زہر گھول دیا ہے۔ اسی سے ووٹ کے تقدس کا ایشو اُبھر کر سامنے آیا ہے۔ ان مختلف اسباب سے عدالتیں دباؤ میں ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ فاضل چیف جسٹس میاں ثاقب نثار عوام کے مسائل میں گہری دلچسپی لینے لگے ہیں۔ اب وہ ہفتے اور اتوار کو بھی عدالت لگاتے اور یہ معلوم کرنے کے لیے عدالتی کارروائی کرتے ہیں کہ جو پانی شہروں اور قصبوں میں پیا جاتا ہے، اس میں غلاظت کتنی ہے اور صحت کو تباہ کرنے والے جراثیم کس قدر ہیں۔ وہ اس امر کی بھی تحقیق کرتے ہیں کہ پرائیویٹ سیکٹر میں جو میڈیکل کالج کھلے ہیں، وہاں تعلیم کا معیار کیسا ہے اور طلبہ سے کتنی بھاری فیسیں لی جاتی ہیں۔ ان کی جوڈیشل ایکٹویزم سے یقیناً عوام کو فائدہ پہنچے گا، مگر اس پر یہ سوالات بھی اُٹھنے لگے ہیں کہ انہیں اپنی عدالتوں کی صحت کے بارے میں بھی فکر کرنی چاہیے جو روز بروز گرتی جارہی ہے، چنانچہ عدالتی اصلاحات کا ان دنوں بہت چرچا سننے میں آرہا ہے۔ جج صاحبان اور قانون سازوں کو مل کر سوچنا ہوگا کہ اعلیٰ معیار کے جج صاحبان کا تقرر کس طرح ممکن ہے اور عدالتوں کو سیاسی نوعیت کے مقدمات سے کیونکر رہائی دلائی جاسکتی ہے اور ماتحت عدالتوں کے جج صاحبان کو مقدمات کے فیصلے بروقت لکھنے کا پابند کیسے بنایا جاسکے گا۔ اس پہلو پر بھی غور کرنا ہوگا کہ وکلا کی مداخلت عدالتی امور میں کس طرح ختم کی جائے۔ یہ بھی محسوس کیا جارہا ہے کہ ازخود نوٹس مقدمات میں اپیل کا حق آئین میں ترمیم کر کے فراہم کیا جائے، ورنہ یہ تاثر قائم ہوسکتا ہے کہ یہ بھی غیر متوازن طاقت کا ایک شاخسانہ ہے۔ سٹے آرڈر کا غیر متعین مدت کے لیے بے محابا اجرا بھی جلد انصاف کے حصول میں رکاوٹ بنا ہوا ہے۔

***

اندھی طاقت آمرانہ رویوں کا دوسرا نام ہے جو ہماری معاشرتی زندگی میں بھی کارفرما ہیں اور سیاسی اور تعلیمی دائروں میں بھی۔ ہم اختلاف اور تنقید کو پسند نہیں کرتے اور خوشامدیوں میں خوش رہتے اور اقتدار، اختیار اپنی ذات اور اپنے خاندان تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ اس بلاخیز رجحان کے منفی اثرات ہماری اجتماعی زندگی میں نمایاں ہیں۔ اس ذہنیت کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا ہے کہ اختیار کو اپنی ذات تک محدود رکھنے کے لیے جھوٹ اور مکر و فریب کا سہارا لینا اور مفادات کا ایک جال بننا

www.urdudigest.com

پڑتا ہے۔ اس عمل میں سیاست جو کبھی عبادت اور خدمتِ خلق کا ایک عظیم جذبہ شمار ہوتی تھی، وہ جھوٹ اور مفادات کا ایک گھٹیا کاروبار بن کے رہ گئی ہے۔ سیاسی شعور سے نابلد معاشرے میں جہالت اور تشدد کے میلانات پروان چڑھ رہے ہیں اور طلبہ سیاست کو شجرِ ممنوعہ سمجھ بیٹھے ہیں جن کے اندر سے ایک زمانے میں سیاسی قیادت فروغ پاتی تھی۔ اب جو ہر طرف قیادت کے فقدان کا ماتم ہے، اس کا بہت بڑا سبب سٹوڈنٹس یونینز کا فقدان ہے۔ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں سٹوڈنٹس یونین کے زیرِ اہتمام تقریری مقابلے ہوتے، فلسفیانہ مباحثے منعقد کیے جاتے جو طلبہ کی شخصیت میں نکھار پیدا کرتے اور اُن کی قائدانہ صلاحیتوں کو جِلا بخشتے تھے۔ مشاعرے اور ادبی محفلوں سے نوجوانوں کے مزاج میں تہذیب اور شائستگاء رچ بس جاتی تھی۔ یونین کے انتخابات طلبہ میں مسابقت اور مفاہمت کے اعلیٰ اوصاف پیدا کرتے اور انہیں قیادت کے لیے تیار کرتے تھے۔ اب تعلیم یافتہ نوجوان سیاسی جماعتوں میں دلچسپی لیتے نہ انہیں تازہ خون فراہم کرتے ہیں۔ اگر اُن کی طرف رُخ کرتے ہیں، تو سیاسی قیادتوں کے غیر جمہوری رویوں اور 'جھوٹوں کی جنت' سے بہت جلد مایوس ہو جاتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سیاسی جماعتوں کی بعض کمزوریوں کے باوجود سیاسی عمل کے نتیجے میں ہونے والے انتخابات معاشرے کو یک جان بنانے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ ۲۰۰۸ء اور ۲۰۱۳ء کے انتخابات اس کی روشن مثالیں ہیں۔ ماضی کے تجربات سے جناب نواز شریف اور محترمہ بے نظیر بھٹو اس نتیجے تک پہنچے تھے کہ جمہوریت کو استحکام صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ انتخابات کے مینڈیٹ کا پورا پورا احترام اور اس کے خلاف غیر جمہوری طاقتوں کے ساتھ ساز باز کرنے سے مکمل اجتناب کیا جائے۔ ۲۰۰۸ء کے انتخابات کے بعد ان دونوں جماعتوں کے مابین مفاہمت کا جذبہ اس قدر غالب آیا کہ انہوں نے مخلوط حکومت قائم کی جو ججوں کی بحالی پر اختلاف پیدا ہونے سے ٹوٹ گئی۔ اس سے قبل میثاقِ جمہوریت پر دستخط کرنے کے باوجود پرویز مشرف کے ساتھ این آر او کر لیا تھا جس کے نتیجے میں پیپلز پارٹی کے رہنماؤں کے خلاف بدعنوانی اور ایم کیو ایم کے خلاف قتل کے مقدمات واپس لے لیے گئے تھے۔ معاہدے کے مطابق پیپلز پارٹی نے حکومت کی آئینی مدت مکمل کی اور ۲۰۱۳ء میں ایک جماعت نے دوسری سیاسی جماعت کو پُرامن طریقے سے اقتدار منتقل کیا، چنانچہ اب یہ امید کی جا رہی ہے کہ ۲۰۱۸ء میں بھی اقتدار پُرامن طریقے سے منتقل ہو جائے گا، البتہ دیکھنے میں آیا ہے کہ مسلم لیگ نون کی حکومت سہی رہی ہے۔ اس کی بڑی وجہ اس کا مقامی حکومتوں کے ساتھ ایک کمزور سا رشتہ تھا۔ اس نے دو لاکھ نمائندوں کے بجائے فقط ایک ہزار نمائندوں پر انحصار کیا۔ مقامی کونسلوں کے نمائندے صوبائی اور مرکزی حکومتوں کو سیاسی طاقت فراہم کرتے اور ان کے دست و بازو بنتے ہیں، مگر مرکزی اور صوبائی حکومتیں اپنے اقتدار و اختیار میں مقامی حکومتوں کو شامل کرنے پر کسی طور آمادہ نہیں تھیں۔ انہوں نے مقامی حکومتوں کے انتخابات سپریم کورٹ کے احکام پر منعقد کیے، مگر انہیں مالی وسائل اور آئین میں دیے ہوئے اختیارات دینے میں بخل سے کام لیا۔ اس بنا پر اندر ہی اندر کشمکش جاری رہی اور مقامی سطح پر تعمیری منصوبوں کی منصوبہ بندی ہوئی نہ عوام کو حقیقی معنوں میں قومی اہداف میں شامل کیا جا سکا۔ امریکا کی ترقی کا راز اس کی خود مختار مقامی حکومتوں میں مضمر ہے۔ برطانیہ میں لندن کا میئر اپنی جگہ برطانوی وزیرِ اعظم سے طاقت ور شمار ہوتا ہے۔ اس تجزیے کے پیشِ نظر اندھی طاقت کو تبدیلی کے ایک صحت مند عمل میں ڈھالنے کے لیے قوم کو سیاسی طور پر باشعور بنانا، نوجوانوں کو سیاسی معاملات کی تعلیم دینا اور مقامی حکومتوں کو اختیارات اور وسائل سے لیس کرنا ہوگا۔ تب داخلی استحکام بھی آئے گا، ہمارا گھر بھی درست رہے گا اور قوم بیرونی چیلنجوں کا پامردی سے مقابلہ بھی کر سکے گی۔ اس کے علاوہ تعلیم کی روشنی سے ہم آمرانہ ذہنیت کے اندھیروں پر بھی قابو پا سکیں گے۔ ◆◆◆

غلام حسین میمن

بچوں کے محبوب مدیر کا سبق آموز خاکہ

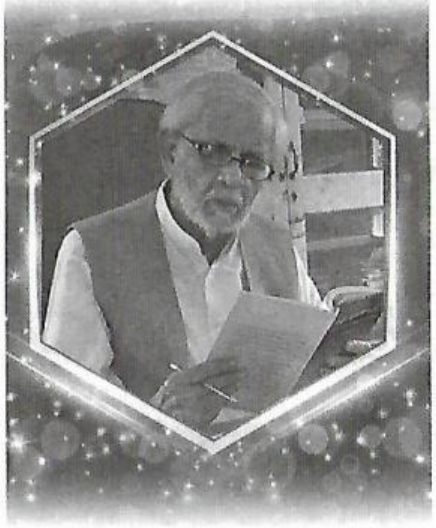

مسعود احمد برکاتی

یہ ۱۹۶۰ء کے عشرے کی بات ہے، پاکستان میں ہمدرد ''کا کاروبار وسعت اختیار کر رہا تھا۔ حکیم محمد سعید اس ادارے کے توسّط سے پاکستان میں بسنے والے شہری اور بالخصوص بچوں کی تعلیمی ضروریات پوری کرنے کے لیے جہاں دیگر کئی اور منصوبوں پر عملی کام کا آغاز کر رہے تھے، وہیں انھوں نے بچوں کے لیے ایک خوب صورت رسالہ ''نونہال'' جاری کیا۔

یہ جولائی ۱۹۵۳ء کا مہینا تھا جب چند رسالوں میں ایک اور ماہنامے کا اضافہ بچوں میں خوشی کی نوید لے کر آ گیا۔ اس رسالے معاونت اور ادارت کے لیے انھیں ایک ایسے ادیب کی ضرورت تھی جو بچوں سے عملی محبت بھی کرتا ہو۔ ایسے میں اُن کی نظرِ انتخاب سید مسعود احمد برکاتی پر پڑی۔

مسعود احمد برکاتی کے دادا اور والد بھی علم و ادب سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ اُن کے دادا حکیم برکات احمد جیّد عالم تھے۔ مسعود احمد برکاتی کو ادب کی آبیاری کا یہ درس اُن کے گھر سے ملا، جسے پروان چڑھانا انھوں نے اپنا فرض جانا۔ وہ حکیم محمد سعید کے ہمراہ اس ننھے سے پودے ''ہمدرد نونہال'' کو دن رات بڑھانے اور بہتر سے بہتر کرنے میں لگے رہے۔

ہمدرد نونہال کو جاری کرنے کا مقصد تفریح کے ساتھ ساتھ بچوں کے اخلاق کی تعمیر اور تعلیم سے آگاہی دلانا تھا تاکہ وہ مستقبل کی باگ ڈور سنبھال سکیں۔

ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والے حکیم محمد سعید اور مسعود احمد برکاتی کے لاشعور میں یہ بات پنہاں تھی کہ اپنی زبان ''اُردو'' سے بچوں کا رشتہ بچپن ہی سے مضبوط کر دیا جائے تاکہ بچے اس محاذ پر بھی مضبوطی سے ڈٹے رہیں۔

کام سے لگن اور ذمہ داری کا جو درس سیّد مسعود احمد برکاتی کو والدین اور اساتذہ سے ملا تھا، انھوں نے اسے یاد رکھا اور اس پر عمل کیا۔ ہمدرد نونہال جیسے ننھے پودے کی پرورش میں انھوں نے کوئی کسر نہ چھوڑی اور پھر چند ہی سالوں میں یہ بچوں کا ایسا با اعتماد رسالہ بن گیا کہ والدین اسے خوشی اور فخر کے ساتھ اپنے بچوں کو پڑھانے لگے۔ اب بھی والدین یہ رسالہ اپنے بچوں کو دے کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اس کے مطالعے سے نہ صرف اُن کی اُردو صحیح ہوگی بلکہ وہ علم اور اخلاق کی دولت بھی پالیں گے۔

☆☆☆

www.urdugem.com

سیّد مسعود احمد برکاتی ۱۵/ اگست ۱۹۳۳ء کو بھارت کے شہر ٹونک میں پیدا ہوئے۔ سیّد مسعود احمد برکاتی نے اُردو، فارسی، عربی اور طب کی تعلیم اسکول اور انگریزی کی تعلیم گھر پر اتالیق سے حاصل کی۔ عمر کے چودھویں سال میں تھے کہ دادا حکیم برکات احمد کے نام پر ایک رسالہ ''البرکات'' نکالا جو خالصتاً علمی و ادبی رسالہ تھا۔ گویا پوت کے پاؤں پالنے میں ہی نظر آنے لگے تھے۔

دو سال بعد جب عمر ۱۶ سال ہوئی تو انھوں نے انجمن ترقی اُردو پاکستان کے رسالے میں سلسلہ وار مضامین لکھنے شروع کیے جن پر بابائے اُردو مولوی عبدالحق سے بھی دادِ تحسین ملی۔ اس کے بعد وہ ''ہمدرد پاکستان'' میں شہید حکیم محمد سعید کا انتخاب بن کر آئے اور ''رفیق خاص'' بنے۔ انھوں نے رفیق کا حق ادا کرتے ہوئے شہیدِ پاکستان، حکیم محمد سعید کے خواب کو حقیقت بنا کر دکھایا۔

آج ہمدرد نونہال کو کامیابی کی منزلیں طے کرتے ہوئے ایک دو نہیں چونسٹھ سال ہو چکے اور یہ اب ساتویں عشرے میں ہے۔ اُردو میں ایسی مثال خال خال ہے کہ اپنے آغاز سے آج تک اس کی اشاعت میں ایک ماہ کا بھی وقفہ نہیں آیا۔ اس طرح اُن کا عرصۂ ادارت بھی چونسٹھ سال پر مشتمل ہے۔

بچوں کے ادب میں اتنا طویل عرصہ ادارت کی دوسری کوئی مثال تاحال دستیاب نہیں۔ اس دوران کئی خاص نمبر اور شہید پاکستان حکیم محمد سعید کی شہادت والے مہینے میں خاص شمارہ بھی شائع ہوتا ہے۔

سید مسعود احمد برکاتی اس کے علاوہ ہمدرد صحت کے ندیر و منتظم بھی رہے۔ وہ یونیسکو کے ماہنامہ ''کوریئر'' کے اُردو ایڈیشن ''کیامی'' کے حکیم محمد سعید شہید کے ہمراہ شریک ندیر رہے۔ ایک اور ریکارڈ بھی اُن کی ذات سے وابستہ ہو چکا جسے توڑنا اب ناممکن ہے۔ وہ یہ کہ انھوں نے اُردو میں بچوں کے لیے سب سے پہلا سفرنامہ ''دو مسافر دو ملک'' کے نام سے لکھا۔ اس سفر میں اُن کے ہمراہ شہید حکیم محمد سعید بھی تھے۔

دو مسافر دو ملک سے علاوہ انھوں نے مولانا محمد علی جوہر کے سو سالہ ولادت کے موقع پر ایک مختصر کتاب ''جوہر قابل'' لکھی جو اُن کی شخصیت کام کے حوالے سے جامع حوالہ جاتی کتاب ہے۔ انھوں نے بچوں کے لیے کئی نامور ملکی و غیر ملکی ادیبوں کے ناولوں کو اُردو کے قالب میں ڈھالا جو بچوں کے ادب میں خوش گوار اضافہ ثابت ہوئے۔

سیّد مسعود احمد برکاتی نے ہمدرد نونہال کے لیے الیگزینڈر ڈوما کے ناول کا ترجمہ ''مونٹی کرسٹو کا نواب''، چارلس ڈکنز کے ناول کا ترجمہ ''ہزاروں خواہشیں'' اور تھری میسکیٹرز کا ترجمہ کیا جو بہت خوبصورت نثر کا نمونہ ہے۔ انھوں نے بچوں کے لیے صحت کردہ اور معلوماتی کتابیں بھی لکھیں۔ جن میں ''صحت کی الف بے'' اور ''صحت کے ۹۹ نکتے'' نمایاں ہیں۔

ڈاکٹر طاہر مسعود نے اُن کا بھرپور تعارف مختصر الفاظ میں یوں کروایا ہے: ''مخلص، ملنسار، وضع دار، بزلہ سنج، زندہ دل اور وسیع المطالعہ''۔ گو کہ حکومتی سطح پر تو اُن کا اعتراف نہ ہوا مگر اُن کے لاتعداد چاہنے والے، شاگرد اور ہمدرد نونہال کے قارئین اور لکھاری جو آج کسی نہ کسی مقام پہ ہیں، اُن کی خدمات کے دل سے معترف ہیں، اور یہی بات اُن کی طمانیت کا باعث تھی۔ انھوں نے کہا تھا: ''میں ناکام نہیں ہوا اور نہ ہی اپنی زندگی ضائع ہونے دی۔''

بلاشبہ اُن کا نام، کام اور اُن کے لاتعداد قارئین آج تاریخ کا حوالہ بن کر اپنی کرنیں بکھیر رہے ہیں۔

۱۰/ دسمبر ۲۰۱۷ء کی رات بچوں کا ادبی محسن اور عاجزی و انکساری کا یہ پیکر خاموشی کے ساتھ اپنے ابدی سفر پر روانہ ہو گیا۔

افتخار گیلانی

مسلمانوں کو اقلیت میں بدلنے کی بھارتی سازش

مودی سرکار کے گھناؤنے کھیل کی چشم کشا داستان

دسمبر ۲۰۱۴ء میں انتخابات کے بعد جب مقبوضہ جموں کشمیر میں معلق اسمبلی وجود میں آئی اور پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی (پی ڈی پی) بھارتیہ جنتا پارٹی (بی جے پی) کی بیساکھی کے سہارے ایوانِ اقتدار میں پہنچی تو طے ہوا تھا کہ بی جے پی ہندو ستانی آئین کی دفعہ ۳۷۰ کے تحت کشمیر کو دیے گئے خصوصی اختیارات کو موضوعِ بحث نہیں لائے گی۔ بظاہر یہ وعدہ ایفا تو ہوا مگر چور دروازے سے بی جے پی کی مربی تنظیم، آر ایس ایس سے وابستہ ایک تھنک ٹینک نے سپریم کورٹ میں رٹ دائر کر دی، جس میں دفعہ ۳۷۰ کے بجائے دفعہ ۳۵ اے کو نشانہ بنایا گیا اور عدالت نے یہ پٹیشن سماعت کے لیے منظور بھی کر لی۔ اب حال ہی میں ایک اسپیشل بینچ قائم کر کے اس کی سماعت اگلے چند ماہ میں شروع کرنے کا عندیہ دیا گیا ہے۔

اسی دفعہ کے تحت جموں و کشمیر میں غیر ریاستی باشندوں کے نوکری حاصل کرنے، ووٹ دینے اور غیر منقولہ جائیداد خریدنے پر پابندی عائد ہے۔ اگر یہ دفعہ ختم کر دی گئی تو اس کے نتائج دفعہ ۳۷۰ کے خاتمے سے بھی زیادہ خطرناک ہوں گے۔ اسی طرح کی شقیں دیگر علاقوں یعنی ناگالینڈ، میزورم، سکم، اروناچل پردیش، آسام، منی پور، آندھرا پردیش اور گوا کو بھی خاص اور منفرد حیثیت عطا کرتی ہیں۔ وہاں بھی ملک کے دیگر شہریوں کو غیر منقولہ جائیدادیں خریدنے پر پابندی عائد ہے یا اس کے لیے خصوصی اجازت کی ضرورت ہوتی ہے۔

مگر مسلم دشمنی اور متعصب ذہنیت کے حامل بھارتی لیڈروں کو ہندوستانی آئین کی یہ شقیں نظر نہیں آتیں اور طرہ یہ کہ مرکزی حکومت جو آئین کی محافظ اور نگراں ہے، اس نے سپریم کورٹ میں آئین کی اس شق کا دفاع کرنے کے بجائے غیر جانبدار رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اگر عدلیہ اس شق کو منسوخ کرتی ہے، تو مودی حکومت دُنیا کو یہ باور کروائے گی کہ یہ آزاد عدلیہ کا معاملہ ہے اور حکومت کا اس کے ساتھ کچھ لینا دینا نہیں۔ مگر دہلی کے حکومتی ایوانوں میں سبھی جانتے ہیں کہ دو سال تک اس پٹیشن کو التوا میں رکھ کر حکومت جسٹس دیپک مشرا کے چیف جسٹس بننے کا انتظار کر رہی تھی۔ خدشہ تھا کہ اگر پٹیشن کی سماعت اس سے قبل ہوتی، تو حال ہی میں ریٹائرڈ چیف جسٹس، جسٹس ایم کے کیہر اور ان کے پیش رو جسٹس ٹی ایس ٹھاکر اس کو مسترد کر سکتے تھے۔

دو برس قبل دہلی کے کانسٹیچوشن کلب میں ایک مذاکرے کے دوران وزیر خزانہ، اروِن جیٹلی نے کہا ''کشمیر کا واحد مسئلہ اس کا مسلم اکثریتی کردار ہے اور آئین میں اس کی خصوصی پوزیشن نے اسے اور بھی پیچیدہ بنایا ہے۔ ان کے

www.urdugem.com

مطابق کشمیر کی ترقی میں بھی یہ سب سے بڑی رکاوٹ ہے، کیونکہ بھارت کے دیگر علاقوں کے لوگ وہاں بس نہیں سکتے، جس کی وجہ سے سرمایہ کاری نہیں ہوسکتی۔ حتیٰ کہ کئی دہائیوں تک کشمیر میں خدمات انجام دینے والے انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس (آئی اے ایس) اور پولیس سروس سے وابستہ غیر ریاستی افراد بھی ریٹائرمنٹ کے بعد باہر زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے وہ ملازمت میں رہتے ہوئے بھی خطے کے معاملات سے بیگانے رہتے ہیں۔ بیوروکریٹک سروس اور فوج ہی دو ایسے ادارے ہیں، جو بھارت کو متحد رکھنے اور اس کے مختلف علاقوں کو ایک لڑی میں پروکر رکھنے میں ریڑھ کی ہڈی کا کام کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر جنوبی ریاست کیرالا کے کسی نوجوان کو سول سروس کا امتحان پاس کرنے کے بعد جب پنجاب کا کیڈر دیا جاتا ہے، تو باقی زندگی وہ عملاً پنجابی ہی کہلائے گا۔ اکثر اعلیٰ بیوروکریسی میں تعینات یہ نوجوان اپنی پیدائشی ریاست کو پس پشت ڈال کر شادیاں اور رشتہ داریاں کیڈر والی ریاست ہی میں کرتے ہیں اور پھر تیس سال سے زائد عرصہ سروس دینے کے بعد اسی صوبے میں ریٹائرڈ زندگی گزارتے ہیں۔ سابق وزیر اعظم من موہن سنگھ کے پرنسپل سیکرٹری ٹی کے اے نائیر اس کی ایک واضح مثال ہیں۔

گو جیٹلی بی جے پی اور آر ایس ایس کے لبرل چہرے مانے جاتے ہیں، انھوں نے سوال کیا کہ آخر مسلمان جہاں بھی تھوڑی اکثریت میں ہوں، وہ اپنی شناخت کیوں الگ رکھنا چاہتے ہیں؟ ان کے مطابق مسلمانوں کی اوّلین شناخت بھارتی ہونا اور اس کی ثقافت کو ترجیح دینا ہونا چاہیے۔ میں ایک رپورٹر کی حیثیت سے اس مذاکرے میں سامع تھا، لیکن میں نے جیٹلی صاحب کو یاد دلایا کہ آئین کی جن شقوں سے انھیں پریشانی لاحق ہے، وہ ایک ہندو ڈوگرہ مہاراجا ہری سنگھ کی دین ہیں جن کو بحال رکھنے کی گارنٹی دے کر ۱۹۴۷ء میں شیخ محمد عبداللہ کو شیشے میں اُتارا گیا تھا۔

وادیٔ کشمیر میں پنڈت لیڈر شنکر لال کول اور جموں میں ڈوگرہ سبھا کی ایما پر ۱۹۲۷ء میں مہاراجا نے یہ قانون نافذ کیا، جس کی رو سے اس کی اجازت کے بغیر کوئی بھی غیر ریاستی شخص ریاستی حکومت میں ملازمت کا حقدار ہوگا نہ ہی غیر منقولہ جائیداد رکھنے کا مجاز ہوگا۔ تاریخ کے اوراق پلٹتے ہوئے میں نے یہ بھی یاد دلانے کی کوشش کی کہ جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ یا دیگر آزادی نواز تنظیموں کے منظرِ عام پر آنے سے بہت پہلے مئی ۱۹۴۷ء میں آر ایس ایس کی ایما پر ہندو مہاسبھا کی ورکنگ کمیٹی نے جموں میں بلائے گئے ورکنگ کمیٹی کے ایک اجلاس میں پاس کی گئی قرارداد میں آزاد ریاست جموں کشمیر کی حمایت کی تھی۔

اس قرارداد کے مطابق ایک ''ہندو اسٹیٹ'' کو سیکولر بھارت کے ساتھ اپنی شناخت ضم نہیں کرنی چاہیے۔ وہ مہاراجا کو ہندو مفادات کا نگراں تصور کرتے تھے۔ یہ پینترے بازی شاید اس وجہ سے ہو رہی تھی کہ ریاست کے پاکستان کے ساتھ الحاق کی صورت میں ہندو آبادی کے حقوق محفوظ کیے جاسکیں۔ تاریخ کے موڑ نے جب کشمیر کو بھارت کی جھولی میں گرا دیا تو شناخت اور حقوق کے تحفظ کا مسئلہ مسلمانوں کی طرف پلٹ گیا۔

جموں و کشمیر کی مسلم اکثریتی شناخت نہ صرف ہندو فرقہ پرستوں بلکہ خود کو سیکولر کہلوانے والی سیاسی جماعتوں کی آنکھوں میں بھی کھٹکتی رہی ہے۔ فروری ۲۰۱۵ء میں جموں میں اپنی رہائش گاہ پر پی ڈی پی کے سرپرست اور سابق وزیر اعلیٰ مرحوم مفتی محمد سعید سے ایک انٹرویو کے دوران میں نے پوچھا تھا کہ کہیں بی جے پی کو اقتدار میں شریک کروا کے وہ کشمیریوں کے مصائب کی رات مزید تاریک کروانے کے مرتکب تو نہیں ہوں گے؟ انھوں نے کہا کہ کشمیر کی خصوصی پوزیشن اور شناخت کے حوالے سے بھارت کی دونوں قومی جماعتوں کا موقف تقریباً ایک جیسا ہے۔

اس سلسلے میں انھوں نے ایک واقعہ سنایا۔ مارچ

۱۹۸۶ء میں جب وہ ریاستی کانگریس کے سربراہ تھے اور انھوں نے اس وقت کے وزیر اعلیٰ غلام محمد شاہ کی حکومت سے حمایت واپس لی، تو وزیر اعظم آنجہانی راجیو گاندھی کی خواہش تھی کہ اگلے دو سال تک اب سرینگر میں کانگریس کو حکومت کا موقع ملنا چاہیے۔ حکومت سازی پر بات چیت کے لیے ان کو دہلی بلایا گیا۔ وزیر اعظم ہاؤس میں ہوئی میٹنگ میں کانگریس کے قومی کارگزار صدر ارجن سنگھ بھی شامل تھے۔

راجیو گاندھی نے ارجن سنگھ کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے پوچھا کہ کانگریسی حکومت کے برسر اقتدار آنے کے بعد کیا ترجیحات ہونی چاہئیں؟ ارجن سنگھ نے جواب دیا کہ پورا ملک جموں و کشمیر کے انڈین یونین میں مکمل انضمام کا خواہش مند ہے۔ یہ عمل ۱۹۷۵ء کے بعد شیخ عبداللہ کے برسر اقتدار آنے سے رُک گیا تھا۔ اس عمل کو دوبارہ شروع کروانے اور منطقی انجام تک پہنچانے کی ضرورت ہے اور یہ ہماری حکومت کا سب سے بڑا کارنامہ ہوگا۔

اسی دوران راجیو گاندھی نے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری سے کہا کہ گورنر ہاؤس اور مفتی سعید سے رابطہ رکھ کر ان کی بطور کانگریسی وزیر اعلیٰ کی حلف برداری کی تقریب کا تعین اس طرح کریں تاکہ وہ بھی جموں جا کر تقریب میں شامل ہو سکیں۔ مفتی نے مزید کہا، وہ اس بات چیت سے انتہائی دلبرداشتہ ہو گئے اور واپس جموں پہنچ کر بقول ان کے، انھوں نے در پردہ خاموشی سے ایسی پیچیدگیاں پیدا کیں کہ کانگریس کی حکومت سازی کا پلان چوپٹ ہو گیا۔ بعد میں ایک سال بعد راجیو۔ فاروق معاہدے کے نتیجے میں فاروق عبداللہ کی قیادت میں نیشنل کانفرنس اور کانگریس کی مشترکہ حکومت قائم ہوئی۔

مفتی سعید نے اعتراف کیا کہ ۱۹۵۳ء سے ۱۹۷۵ء تک کشمیر کی انفرادیت اور شناخت کو بری طرح مسخ کیا گیا۔ یوں ایک طرح سے کشمیریوں کی عزت و آبرو کو تار تار کر کے برہنہ کر دیا گیا۔ بھارت کے آئین کی دفعہ ۳۷۰ کی حالیہ شکل میں تو اب صرف زیرِ جامہ بچا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ بھارت نواز کشمیری پارٹیاں، چاہے نیشنل کانفرنس ہو یا پی ڈی کا فرض ہے کہ اس زیرِ جامہ کو بچا کر رکھے، جب تک مسئلہ کشمیر کے دائمی حل کی کوئی سبیل پیدا ہو۔

مگر یہ بات اب سرینگر میں زبان زدِ عام و خاص ہے کہ یہ وہ پی ڈی پی نہیں جس نے ۲۰۰۳ء اور ۲۰۰۵ء کے درمیان دہلی کی روایتی کٹھ پتلی حکومت کے بجائے کشمیری عوام کے مفادات اور ترجیحات کے ترجمان کے طور پر نئی تاریخ رقم کی تھی۔ اس سے قبل اقتدار کی شدید ہوس نے کشمیر کی سب سے بڑی قوم پرست پارٹی نیشنل کانفرنس کو بزدل بنا کر رکھ دیا تھا۔ یہی حال اب کچھ پی ڈی پی کا بھی ہے۔ فی الحال بدقسمتی سے اس جماعت کا یہ محور بنا ہوا ہے کہ اقتدار کی نیل پری سے آشنائی کس طرح برقرار رکھی جائے۔

دفعہ ۳۵ اے دراصل ہندوستانی آئین کی دفعہ ۳۷۰ ہی کی ایک توسیع اور توضیح ہے۔ معروف قانون داں، اے جی نورانی کے بقول آرٹیکل ۳۷۰ گو ایک عبوری انتظام تھا کیونکہ بھارتی حکومت کی ۱۹۶۰ء کی دہائی تک یہ پالیسی تھی کہ جموں و کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ استصواب رائے سے کیا جائے گا۔ ۱۹۴۸ء میں جموں و کشمیر پر بھارتی حکومت نے ایک وائٹ پیپر جاری کیا تھا، جس میں سردار پٹیل کا یہ بیان موجود ہے: ''الحاق کو تسلیم کرتے ہوئے حکومت بھارت نے یہ واضح کر دیا ہے کہ وہ اسے بالکل عارضی مانتی ہے جب تک کہ اس بارے میں ریاست کے لوگوں سے ان کی رائے نہیں معلوم کی جائے گی''۔

نورانی کے بقول ارجن سنگھ کے حامی شیاما پرساد مکھرجی نے، جن کا نام آرٹیکل ۳۷۰ کی مخالفت کرتے وقت بی جے پی اچھالتی ہے، انھوں نے اس کی مکمل حمایت کی تھی۔ بی جے پی تب کے وزیر داخلہ سردار پٹیل کا نام بھی اس پروپیگنڈا کے لیے استعمال کرتی ہے کہ انھوں نے اس مسئلے پر پنڈت

www.urdudigest.com

جواہر لعل نہرو کی مخالفت کی تھی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ پٹیل نے بھی آئین کی اس دفعہ کی مکمل تائید کی تھی۔

جناب نورانی کا کہنا ہے کہ کشمیر واحد ریاست تھی جس نے الحاق کے لیے اپنی شرائط پر حکومت سے مذاکرات کیے تھے۔ وہ بھارت میں ضم نہیں ہوئی بلکہ اس نے الحاق کیا تھا، اس لیے ان کے مطابق آرٹیکل ۳۷۰ دونوں کے درمیان ایک مقدس معاہدہ ہے، جس کی کسی شق کو کوئی بھی فریق یک طرفہ ترمیم نہیں کرسکتا۔ نورانی تذکرہ کرتے ہیں کہ این گوپال سوامی نے ۱۶/۱۷ اکتوبر ۱۹۴۹ء کو اس سلسلے میں پہلی خلاف ورزی اس وقت کی جب انھوں نے یک طرفہ طور پر مسودے میں تبدیلی کے لیے پارلیمنٹ کی لابی میں حتمی شکل دی تھی۔

جیسے ہی شیخ عبداللہ اور مرزا افضل بیگ کو اس تبدیلی کا علم ہوا وہ دونوں ایوان کی طرف دوڑے لیکن تب تک یہ ترمیمی بل پاس ہوچکا تھا۔ بقول ان کے یہ افسوسناک اعتماد شکنی کا معاملہ تھا جس نے بداعتمادی کو جنم دیا۔ اگر اصل مسودہ پاس کیا جاتا تو ۱۹۵۳ء میں شیخ عبداللہ کو اقتدار سے بے دخل کیا جانا ممکن نہ تھا۔ ۱۹۵۱ء میں کشمیر اسمبلی کے لیے جو انتخابات منعقد کیے گئے، ان سے بھارت کے جمہوری دعووں کی کشمیر میں قلعی اسی وقت کھل گئی تھی۔ انتخابی دھاندلیوں کے تمام ریکارڈ توڑ ڈالے گئے۔ تمام امیدوار ”بلامقابلہ“ منتخب، قرار پائے۔ یہ وہی اسمبلی تھی جس نے ریاست کا دستور وضع کیا اور الحاق کے دستاویز کی توثیق کی تھی۔

اس کشمیر اسمبلی کے جواز پر سوال کھڑا کیا جاسکتا ہے کیونکہ پانچ فیصد سے بھی کم لوگوں نے اس کی تشکیل میں اپنے حق رائے دہی کا استعمال کیا تھا۔ یہ اسمبلی ریاست کے مستقبل اور اس کی حیثیت طے کرنے کے سلسلے میں دستور ساز اسمبلی کا درجہ رکھتی تھی۔ کشمیر کی اس آئین ساز اسمبلی کی حقیقت اور حیثیت کی قلعی خود تب کے انٹیلی جنس سربراہ، بی این ملک نے کھول رکھی ہے۔ ان کے بقول ”ایسے امیدواروں کے کاغذات نامزدگی مسترد کردیے گئے، جو حزب مخالف کا کردار ادا کرنے کی اہلیت رکھتے تھے“۔

اس حقیقت سے یہ بات واضح ہے کہ الحاق کی دستاویز کی توثیق اور کشمیر کے آئین کی منظوری کو کوئی عوامی تائید حاصل نہیں تھی۔ بہرحال پچھلے ۶۹ برسوں میں بھارتی حکومتوں نے آرٹیکل ۳۷۰ کو اس بری طرح مسخ کردیا کہ اس کا اصلی چہرہ اب نظر ہی نہیں آتا۔ کئی مواقع پر خود کشمیری لیڈروں نے اپنی عزت نفس کا خیال نہ کرتے ہوئے ان آئینی خلاف ورزیوں کے لیے راہ ہموار کی۔ اگر کہا جائے کہ آئین کی اس شق نے کشمیریوں کو سیاسی گرداب سے بچنے کے لیے جو کپڑے فراہم کیے تھے، وہ سب اُتر چکے اور اب صرف دفعہ ۳۵ اے کی صورت میں ایک نیکر بچی ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

اقتدار پرست عناصر اب اسی نیکر کو اتارنے، کشمیریوں کی عزت نیلام کرنے اور ان کو اپنے ہی وطن میں اقلیت میں تبدیل کروانے کے لیے گھناؤنا کھیل کھیل رہے ہیں، جس کے لیے عدالتی نظام کا سہارا لیا جارہا ہے۔ عدالت میں یہ معاملہ لے جاکر آر ایس ایس نے جموں و کشمیر کی آبادیاتی ساخت کی تبدیلی کی خاطر اپنے مکروہ عزائم واضح کردیے ہیں۔ کانگریس کے سابق ریاستی صدر اور سابق مرکزی وزیر سیف الدین سوز کا کہنا ہے کہ سپریم کورٹ کی طرف سے اس پٹیشن کو سماعت کے لیے منظور کرنا ہی ان کے لیے باعث حیرت ہے۔

اٹانومی اور سلیف رول کے ایجنڈوں کے خواب دیکھنا دور کی بات ہے۔ فی الحال جس تیز رفتاری سے مودی سرکار اور اس کی ہم نوا ریاستی حکومت کشمیریوں کے تشخص اور انفرادیت کو پامال کرنے کے حوالے سے جنگ آزمائی کے راستے پر چل نکلی ہے، اس کا توڑ کرنے میں نیشنل کانفرنس، پی ڈی پی کے باضمیر افراد اور حریت پسند جماعتوں کو باہمی تعاون کرنے کی کوئی سبیل نکالنی چاہیے۔ ◆◆◆

”آپ کی زکوٰۃ نے بدل دیا مقدر“

کاروان علم فاؤنڈیشن
کے مالی تعاون سے کم وسیلہ، یتیم اور معذور مگر باصلاحیت طلباء و طالبات اعلیٰ پیشہ وارانہ تعلیم حاصل کررہے ہیں
اپنے خاندان کا سہارا بن رہے ہیں اور قومی ترقی کے دھارے میں شامل ہورہے ہیں

5,786 طلباء وطالبات کو -/139,683,855 روپے کے وظائف جاری کیے جاچکے ہیں

986
یتیم طلباء وطالبات کو پیشہ وارانہ اعلیٰ تعلیم کے لئے مالی اعانت فراہم کی گئی۔

355
نابینا، پولیو زدہ اور حادثے کی وجہ سے معذور طلباء کو مالی اعانت فراہم کی گئی

سکالرشپ حاصل کرنے والے طلباء وطالبات کی تعداد اور شعبہ جات

ایم بی بی ایس	1377	ایم اے	140	بی کام آنرز	161	ایل ایل بی	15	ایف ایس سی	529
بی ڈی ایس	52	ایم کام	41	بی ایس آنرز	777	بی اے آنرز	48	ایف اے	95
فزیوتھراپی	49	ایم بی اے	58	بی بی اے	64	بی اے	74	آئی کام	56
ڈی وی ایم	123	ایم پی اے	05	اے سی اے	19	سی ایس ایس	01	ڈی کام	05
ڈی فارمیسی	108	ایم فل	20	سی اے	04	بی ٹیک	24	آئی سی ایس	17
ایم ایس سی	144	بی ایس سی انجینئرنگ	1443	بی ایس ایڈ/بی ایڈ	42	ڈپلومہ ایسوسی ایٹ انجینئرنگ	164	میٹرک	131

زیر کفالت اور زیر غور طلباء کی مالی اعانت کے لئے 3 کروڑ روپے درکار ہیں

زکوٰۃ وعطیات دیجیے
علم و ہنر سے آراستہ روشن اور باوقار پاکستان کے لئے!

کاروان علم فاؤنڈیشن

Meezan Bank
The Premier Islamic Bank
میزان بنک سمن آباد، لاہور پاکستان اکاؤنٹ نمبر 0240 0100882859
BOP
THE BANK OF PUNJAB
بنک آف پنجاب سمن آباد، لاہور پاکستان اکاؤنٹ نمبر 0110 002 000424 0003
بنک آف پنجاب شاہراہ فیصل کراچی پاکستان اکاؤنٹ نمبر 0247 002 000827 0003

گھر سے عطیات کی وصولی کے لئے رابطہ
لاہور: مہدی رضا
0305-4133173
اسلام آباد: کلیم اللہ چوہدری
0321-5587250

معلومات وراہنمائی کے لئے رابطہ کیجیے

67- کشمیر بلاک حفیظ تائب روڈ نزد رحیم سٹور علامہ اقبال ٹاؤن لاہور۔
فون: 0321-8461122, 0345-8461122, 0333-8461122

www. urdugem. com

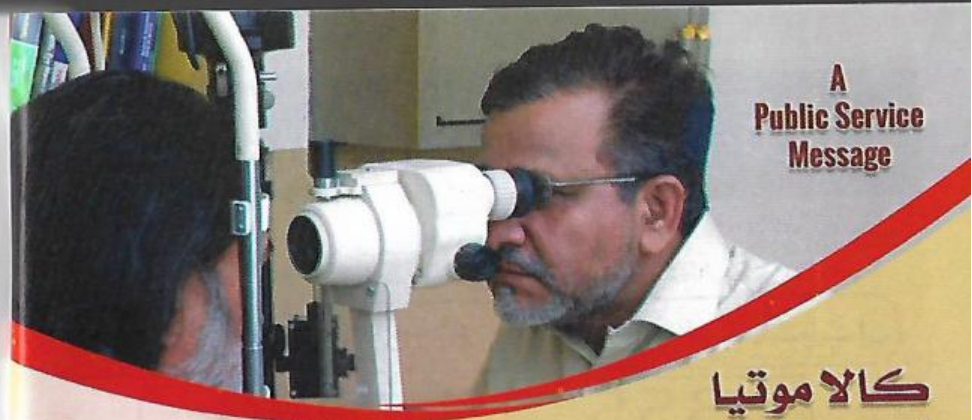

کالا موتیا

(Glaucoma) کیا ہے؟

کالا موتیا بنیادی طور پر وہ بیماری ہے جس میں آنکھ کا دماغ کے ساتھ رابطہ منقطع ہو جاتا ہے۔ کالا موتیا کی کئی اقسام میں کچھ وقتاً فوقتاً لاعلاج ہیں لیکن اہم بات یہ ہے کہ علاج بیماری کے کس مرحلے پر شروع کیا گیا۔ شروع میں بیماری ۱۰۰ فیصد قابل علاج ہے۔

کالا موتیا کی پہلی قسم (Narrow Angle Glaucoma) کی علامات

۱۔ ابتدائی مرحلے کو پروڈرومل سٹیج (Prodromal Stage) کہتے ہیں۔ اس میں ہلکی سر درد ہوتی ہے لیکن تھوڑے وقفے کے بعد یہ تکلیف خود ہی ٹھیک ہو جاتی ہے۔ بہت سارے مریضوں کو اس سٹیج پر کالا موتیا تشخیص نہیں ہو پاتا۔

۲۔ دوسرے مرحلے میں آنکھوں کے آگے کچھ دھندلا پن بھی محسوس ہونے لگتا ہے اور بلب کی طرف دیکھنے پر رنگدار دائرے بھی نظر آنے لگتے ہیں۔

۳۔ تیسرے مرحلے پر سر کے ساتھ ساتھ آنکھوں میں بھی درد شروع ہو جاتا ہے اور آنکھوں میں سرخی رہنا شروع ہو جاتی ہے۔

۴۔ اس مرحلے کو شدید اٹیک (Acute Congestive Attack) کہتے ہیں۔ اس مرحلے کو عرف عام میں کالا موتیا کہتے ہیں۔ اس میں شدید الٹیاں آتی ہیں۔ مدہوشی کی سی کیفیت رہتی ہے۔ نظر میں یک دم شدید کمی آجاتی ہے۔

کالا موتیا کی دوسری قسم (Open Angle Glaucoma)

کئی دفعہ ایسے ہوتا ہے کہ مریض کی 80 فیصد نظر ضائع ہو چکی ہوتی ہے۔ ۱۔ بے چینی یا بھاری پن رہتا ہے۔
۲۔ رات کی نظر میں آہستہ آہستہ کمی ہو جاتی ہے۔ ۳۔ بہت سے لوگوں کا عینک کا نمبر جلدی تبدیل ہونے لگتا ہے۔

کالا موتیا کے علاج کیلئے مختلف آپشنز میسر ہیں۔ عام طور پر یہ مشہور ہے کہ کالا موتیا لاعلاج ہے لیکن حقیقت میں بروقت تشخیص اور علاج انتہائی اہم ہے۔ تاخیر سے کالا موتیا لاعلاج ہو جاتا ہے۔ علاج کے مختلف طریقے ہیں کچھ عمر بھر چلتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جن سے مسلسل علاج سے جان چھوٹ سکتی ہے۔ مثلاً لیزر کے ذریعے اگر بروقت علاج ہو جائے تو مسلسل دوائیاں استعمال نہیں کرنی پڑتیں۔ کالا موتیا کا جب علاج کیا جاتا ہے تو علاج کے وقت پر جتنی نظر موجود ہوتی ہے وہ بچالی جاتی ہے لیکن جو نظر ختم ہو چکی ہوتی ہے وہ واپس نہیں آتی۔

ڈاکٹر آصف کھوکھر

ایم بی بی ایس (پنجاب) ایم سی پی ایس (آئی) ایم اے (علوم اسلامیہ)

Vitreoretinal, phaco, laser,

آئی سرجن لاہور میڈی کیئر انسٹیٹیوٹ آف اوفتھیلمالوجی لاہور

AMERICAN ACADEMY OF OPHTHALMOLOGY
The Eye M.D. Association
MEMBER

فیروزپور روڈ بالمقابل قذافی سٹیڈیم
ایام معائنہ: منگل، جمعرات، ہفتہ 2 بجے دوپہر سے 5 بجے شام تک
www.drasifkhokhar.com
Cell: 0333-4102300 Email: drasifkhokhar@hotmail.com

www.urdugem.com

نکاح کرنا میری سنت ہے (فرمانِ رسول ﷺ)

زنا ایک قرض ہے، اگر تم نے لے لیا تو وہ گھر والوں کو کرنا پڑے گا۔ (قول جناب امام حسنؓ)
اسلامی نظام زندگی۔۔۔ مکمل ضابطہ حیات اور خوشحالی کا ضامن ہے

نکاح آسان تحریک پاکستان

نکاح آسان تحریک پاکستان

۱۵ سالہ مثالی خدمات

قابل اعتماد، پائیدار اور معیاری اسلامی رشتوں کا مرکز | اب والدین اچھے رشتوں کے لیے پریشان نہ ہوں!

شعبہ جات:

۱۔ ہم سفر (Marriage Bureau): ہر برادری، زبان، مسلک اور ہر قسم کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہزاروں رشتوں پر مشتمل ملکی اور غیر ملکی اسلامی رشتہ سینٹر (شیخ القرآن والحدیث، مفتی، عالم دین، حافظ قرآن، جج، پروفیسر، لیکچرار، آرمی آفیسر، سرجن، ڈاکٹر، BDS، انجینئر، وکیل، صحافی، بزنس مین، زمیندار، صنعتکار، CA، ACCA، MBA، MSc.، M.A، M.Com، M.Phil، PhD، ڈپلوما ہولڈر اور مختلف شعبہ زندگی)

۲۔ کتب (Library): شادی و بیاہ، رشتہ و رسومات، دینی و فقہی مسائل، معلومات عامہ، معاشرتی و نفسیاتی، سماجی و معاشی، عائلی قوانین اور دیگر عصر حاضر کے پیچیدہ موضوعات پر مشتمل ایک لاکھ کتب پر مبنی وسیع و عریض لائبریری اور اسلامک بک سینٹر کا قیام

۳۔ تحقیق و نفسیات (Research & Psychology): 30 اہم ترین سنہری اصول جو کامیاب شادی کی بنیاد ہیں، جن کی روشنی میں رشتے کروائے جاتے ہیں۔

۴۔ تصانیف و تالیف (Publishing): طبی، قانونی، خاندانی، معاشرتی، نفسیاتی، روحانی، سیاسی مسائل اور نت نئے موضوعات پر پیغامات، مضامین، کتابچے اور کتب کا اجراء، مثلاً: صحیح استخارہ، تین طلاقیں، حلالہ، وٹہ سٹہ، تھیلیسیمیا ٹیسٹ، لیٹ میرج، چار شادیاں، کزن میرج، جہیز، ٹیسٹ ٹیوب بے بی وغیرہ
صحیح استخارہ پر مشتمل کتابچہ اور 30 سنہری اصول مفت حاصل کرنے نیز خود مختار، لیٹ میرج، سیکنڈ میرج، بیوہ، رنڈوا، مطلقہ، خلع یافتہ، غرباء، مساکین، معذور، گونگے بہرے، نابینا، بے سہارا، مجبور، ضرورت مند، مستحق احباب بھی رابطہ کریں۔

مشاورتی بورڈ

زیر سرپرستی	بانی چیئرمین	قانونی مشیران	نکاح خواں
پروفیسر ابوالحسنین عبدالحمید محمد قرنی	عبداللہ ابوبکر صدیق حسنی	عطاء اللہ عاطف خانزادہ ایڈووکیٹ	مفتی حافظ محمد ایوب صابر
ڈاکٹر فرید احمد پراچہ	سیکرٹری جنرل	نصر اللہ خان اولکھ ایڈووکیٹ	مولانا محمد طیب خاں میئو
پروفیسر سید وقار علی کاری	بیگم فرزانہ پروین	محمد رفیق نظامی ایڈووکیٹ	محمد سلیم قریشی المعصومی
چودھری محمد اعجاز آرائیں	باجی قیصر سلطانہ	مہوش چودھری ایڈووکیٹ	قاری رشید احمد ہمدانی
خورشید احمد خان	محمد فرقان انصاری		

مشورہ، معلومات اور رجسٹریشن

Ufone 0333-2661312
Warid 0321-2661312
WhatsApp

خط و کتابت: پاکستان ہاؤس، سرور حیات کالونی، ریلوے روڈ نزد تبلیغی مرکز، رائیونڈ، لاہور

نیٹ ورک: پاکستان ہاؤس، بحریہ آرچرڈ، گیٹ نمبر 2، رائیونڈ روڈ، لاہور
سید مودودیؒ مارکیٹ، منصورہ ڈگری کالج، وحدت روڈ، ملتان چونگی، لاہور
کراچی، اسلام آباد، فیصل آباد، ملتان، گوجرانوالہ، حیدرآباد، سکھر، کوئٹہ، پشاور، مردان
جہلم، گلگت، چترال، سوات، مظفر آباد، میرپور، وادی نیلم، گجرات، رحیم یار خان

nikahatpakistan2002@gmail.com
icpp313pakistan@gmail.com
nikahatpakistan2002

alBaraka البركة Bank
Title: Abdullah Abubaker Siddique
A/C # :0103397721401
Branch Code: 0321 Raiwind

قارئین اردو ڈائجسٹ کے لیے انتہائی خوشخبری شادی بیاہ کے لیے تسلی بخش آن لائن مسنون استخارہ بھی کیا جاتا ہے۔

www.urdugem.com

نصف صدی قبل قومی تاریخ کے ایک اہم راہنما سے لیا گیا
یادگار تاریخی انٹرویو جس میں نہاں بیش بہا خیالات اور
واقعات کی خوشبو برسوں گزر جانے کے باوجود ماند نہیں پڑی

ائیر مارشل اصغر خان

الطاف حسن قریشی

یہ غالباً اگست ۱۹۶۵ء کے پہلے ہفتے کی بات ہے، ایمبیسڈر ہوٹل لاہور میں پی آئی اے کی طرف سے دوپہر کی دعوت کا انتظام تھا۔ ائیر مارشل اصغر خان نے حال ہی اس تنظیم کی صدارت کا عہدہ سنبھالا تھا۔ وہ پریس سے ملنے آئے تھے۔ ہم نے ائیر مارشل اصغر خاں کا خیر مقدم کیا۔ چیچے ٹلے قدم اُٹھاتے ہوئے وہ ہماری طرف آئے اور اُردو کے چھوٹے چھوٹے فقروں میں ہمارا حال پُوچھا۔ حُسن اتفاق سے مجھے اُن کے بالکل قریب جگہ ملی۔ اُن میں انکسار اور ملنساری کا لطیف امتزاج پایا۔ ہلکی ہلکی مُسکراہٹوں کے دائرے اُن کی معصوم آنکھوں سے اٹھکیلیاں کر رہے تھے۔ تقریباً سبھی صحافیوں نے ائیر مارشل کی دلآویز شخصیت سے گہرا تاثر قبول کیا۔

دوسری ملاقات ۶ ستمبر ۱۹۶۷ء کو ہوئی۔ میں اُس روز کراچی میں تھا۔ بلدیہ کراچی نے جانبازوں اور شہیدوں کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے تقریب کا اہتمام کیا تھا۔ اگلی صفوں میں ائیر مارشل اصغر خاں تشریف فرما تھے۔ سچ پُوچھیے تو میں انھی سے ملنے آیا تھا۔ تقریب کے اختتام پر اُن کی طرف لپکا اور ڈرتے ڈرتے سلام کیا۔ پہلی ملاقات کو دو برس سے زیادہ ہو چکے تھے اور میرا خیال تھا وہ مجھے نہیں پہچانیں گے، لیکن انھوں نے ٹھہری ٹھہری مگر خلوص سے مہکی ہوئی آواز میں میرا نام اس محبت سے پکارا کہ ایک لمحے کے لیے میں کانپ اُٹھا۔

دس منٹ تک ائیر مارشل سے باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے آخر میں کہا: ”کیا عرض تمنا کر سکتا ہوں؟“

”ہاں، ہاں، فرمائیے۔“

”آپ سے انٹرویو لینا چاہتا ہوں۔“

خاموشی.....

”میں نے کچھ عرض کیا تھا۔“

”میں اسی پر غور کر رہا ہوں۔ سوچتا ہوں مدت ہوئی انٹرویو دیے۔“

پھر وہ اپنے مخصوص انداز میں مُسکرائے اور قدرے آنکھیں جُھکاتے ہوئے کہا: ”آپ کل فون کر لیجیے۔“

وعدہ فردا لے کر لاہور پہنچا تو ٹائفائیڈ کے بچے کھچے اثرات نے ایسی یلغار کی کہ شکن بستر بن گیا اور کراچی نہ جا سکا۔ اس کے بعد شرق اوسط اور مشرقی پاکستان کے مے کدوں سے شراب محبت پیتا رہا۔ فروری کے وسط میں ائیر مارشل اصغر خاں سے انٹرویو لینے کا زنم شوق ایک بار پھر ہرا ہوا۔ رابطے بڑھے اور ۱۳ مارچ ۱۹۶۸ء کی تاریخ صبح ملاقات قرار پائی۔

ٹھیک ساڑھے نو بجے میں ائیر مارشل کے کمرے میں تھا۔ وسیع مگر سادہ سا کمرہ سامنے دُنیا کا دیوار قد نقشہ آویزاں روشنی کی سکوں بخش لہریں رقصاں اور ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا کی مست خرامیاں آئینہ بنی ہوئی تھی۔ ان کے ہاتھوں سے دل کی گرمی اور آنکھوں سے آبشار شرافت پھوٹ رہی تھی۔ بلند و بالا قامت کو عظمت و انکسار نے قد آور شخصیت بنا دیا تھا۔ جسم اور روح انسانیت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے۔ مستعد اتنے کہ ضمیر کی ہلکی سی آواز بھی سُن لیتے ہیں۔

”آیئے قریشی صاحب، اب کے ملاقات بہت دیر بعد ہوئی“ انھوں نے مجھ سے گلے ملتے ہوئے کہا۔

”نہیں تو پچھلے ستمبر میں تو نیاز حاصل ہوئے تھے۔“

”مجھے یوں محسوس ہوا جیسے طویل عرصہ گزر گیا۔ آپ اچھے تو ہیں؟“

”جی ہاں زندگی کو بہلا رہا ہوں اور کبھی کبھی اپنے آپ کو بہلانے لگتا ہوں۔“

”آپ پی آئی اے کے بارے میں کچھ بتائیے۔ عوام کو

www.urdugem.com

اس تنظیم سے بہت شکایتیں ہیں۔" میں یہ کہہ کر رک گیا اور نظریں ائیر مارشل کے چہرے پر گاڑ دیں۔ انھوں نے بڑے سکون کے ساتھ کہا:

"ہمیں بتائیے وہ شکایتیں کیا ہیں۔ ہم دیانت دار پریس سے یہی توقع رکھتے ہیں کہ وہ لاگ لپیٹ کے بغیر ہماری خامیوں کا محاسبہ کرتا رہے۔ صحت مند عوامی زندگی کے لیے احتساب بہت ضروری ہے۔"

"اگر آپ بُرا نہ مانیں تو عرض کروں کہ اداروں میں عام رجحان یہ ہے کہ وہ پریس کی نکتہ چینی پسند نہیں کرتے۔"

"یہ رجحان کسی اعتبار سے بھی اچھا نہیں۔ سچی بات سامنے آنی چاہیے۔ ہماری تنظیم صحت مند تنقید کا ہمیشہ خیر مقدم کرتی ہے۔ ہمارے سرمایے کا نوّے فیصد ٹیکس ادا کرنے والے حضرات فراہم کرتے ہیں۔ انھیں ہم پر کڑی نظر رکھنے کا پُورا پُورا حق ہے۔"

"ائیر مارشل صاحب، آپ کے خیالات سُن کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ کاش! یہ جذبہ عام ہو جائے۔ اس سلسلے میں یہ بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ عوام آپ کے معاملات میں اس لیے زیادہ دلچسپی نہیں لیتے کیونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں شکایت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں، انتظامیہ ان کی شکایات پر کان نہیں دھرتی اور وہ اپنے فیصلوں میں رائے عامہ کو شامل نہیں کرتی۔"

میرا دائرہ تنقید سخت ہوتا جا رہا تھا۔ جناب عُمر قریشی، پی آئی اے تعلقات عامہ کے ڈائریکٹر ہیں۔ وہ بھی کمرے میں موجود تھے۔ اُن کا چہرہ بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ لیکن ائیر مارشل کے نقش ونگار اور خوشگوار ہو گئے۔ وہ میری باتوں میں غیر معمولی دلچسپی لے رہے تھے۔

"قریشی صاحب، خبر نہیں عوام کو یہ کیوں احساس ہو گیا کہ ان کی شکایات پر توجہ نہیں دی جاتی۔ ہمارے ہاں طریق کار یہ ہے کہ شکایت کرنے والے کو فرداً فرداً جواب دیا جاتا ہے۔ اس کام کے لیے ایک بڑا عملہ مخصوص ہے۔"

"جناب اس سلسلے میں میرا اپنا تجربہ یہ ہے کہ میں نے تین شکایتیں لکھیں لیکن ایک کا بھی جواب نہ ملا۔ پھر سوچا جب بننا کچھ نہیں تو ائیر ہوسٹسوں کی ناراضی کیوں مول لی جائے۔"

"آپ نے براہ راست مجھے کیوں نہیں لکھا۔"

"آپ کو چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا۔"

"یہ آپ نے کچھ اچھا نہیں کیا۔ ہمارا کام قوم کی خدمت کرنا ہے۔ منصب جس قدر بڑا ہو، اس کی ذمہ داری بھی اسی لحاظ سے بڑی اور نازک ہوتی ہے۔ میں اپنے آپ کو چھوٹی سے چھوٹی بات کے لیے ذمہ دار سمجھتا ہوں۔ اچھا یہ تو بتائیے کہ آپ کی شکایتیں کیا تھیں؟"

"ایک بار مجھے نہایت ضروری کام سے راولپنڈی جانا تھا۔ غالباً دن کے بارہ بجے کی پرواز تھی۔ میں نے ساڑھے گیارہ بجے ہوائی اڈے پر فون کر کے پوچھا کہ راولپنڈی ہوائی جہاز وقت پر جا رہا ہے؟ ایک خاتون نے جواب دیا:

"آپ ابھی تک فون ہی کر رہے ہیں۔ جہاز عین وقت پر جا رہا ہے، فوراً چلے آئیے۔"

اس روز لاہور میں بھی کام کی بہت زیادتی تھی۔ میں نے گھبراہٹ کے عالم میں کچھ سامان لیا، کچھ چھوڑا اور ہوائی اڈے کی طرف روانہ ہو گیا۔ سُوئے اتفاق سے اُس روز کار بھی قدرے خراب تھی اس لیے تیز نہ چل سکی۔ خیر ہانپتے کانپتے ہوائی اڈے پر پہنچے۔ ہوائی اڈے کا ہال خالی پڑا تھا۔ میں یہی سمجھا جہاز نکل گیا لیکن گھڑی پر ابھی چودہ منٹ باقی تھے۔ ذہنی کشمکش کو ساتھ ساتھ کھینچتا ہوا کاؤنٹر پر پہنچا۔ وہاں بھی ہُو کا عالم طاری تھا۔ ایک صاحب بولے:

"ہوائی جہاز تین گھنٹے لیٹ ہے اور ہم اس کا اعلان تقریباً پون گھنٹہ پہلے کر چکے۔"

میں نے کہا "مگر مجھے تھوڑی دیر پہلے بتایا گیا ہے کہ جہاز وقت پر جا رہا ہے۔"

"میں انکوائری کا ذمہ دار نہیں۔"

"مجھے سخت تکلیف پہنچی ہے۔"

"میں اسے خوشی میں تبدیل نہیں کر سکتا۔"

ان کی شیریں گفتگو سے لطف اندوز ہونے کے بعد مجھے یہ احساس ہوا کہ کار جا چکی ہے۔ تین گھنٹے ہوائی اڈے پر ضائع نہیں کیے جا سکتے تھے۔ ٹیکسی اور رکشا بھی کہیں نظر نہ آیا۔ میں نے پی آئی اے کے ایک ذمے دار افسر سے درخواست کی کہ مجھے پی آئی اے کی گاڑی پر شہر بھجوا دیا جائے۔ انھوں نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا: "اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم آپ کے چونچلے ہی سہتے رہیں۔"

غرض ایک درویش کی طرح میں اپنے غصے کا لہو خود ہی پیتا رہا۔"

جناب اصغر خاں میری اس آپ بیتی سے خاصے متاثر ہوئے۔ انھوں نے اپنی وضعدار آواز میں کہا:

"مجھے ذاتی طور پر تکلیف پہنچی ہے۔ اگر آپ اُسی وقت یہ واقعہ مجھے لکھ بھیجتے تو میں اس کی پوری طرح تفتیش کرتا۔ اس کا بڑا فائدہ یہ ہوتا کہ آئندہ اس قسم کا رویہ دُہرایا نہ جاتا۔ قریشی صاحب، ہماری دشواری یہ ہے کہ کام تیزی سے پھیل رہا ہے اور ہمارے پاس تجربہ کار آدمیوں کی کمی ہے۔ سات آٹھ برس پہلے پی آئی اے کے ملازمین سات آٹھ ہزار تھے اب ان کی تعداد چودہ ہزار تک پہنچ گئی ہے۔ اتنی بڑی تعداد کو معیار کے شکنجوں میں کسنے کے لیے سخت نظام تربیت کی ضرورت ہے مگر کام کی رفتار اس کی پوری طرح اجازت نہیں دیتی۔ اچھا اب دوسرا واقعہ سُنائیے۔"

"وہ ذرا دوسری نوعیت کا ہے۔ میں کراچی سے لاہور سفر کر رہا تھا۔ غالباً رات کے گیارہ بارہ بجے کی پرواز تھی۔ گرمی کا موسم آخری دموں پر تھا۔ ہوائی جہاز میں بیٹھتے ہی مجھے شدید پیاس کا احساس ہونے لگا۔ میں نے ایک ائیر ہوسٹس سے پانی مانگا۔ کہنے لگی: "ذرا ہوائی جہاز کی پرواز ہموار ہو جائے تو پانی لے آؤں گی" میں ہموار رفتار کا انتظار کرنے لگا۔ پیاس کی شدت لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے خشک آواز میں ایک اور ائیر ہوسٹس سے پانی مانگا۔ "ابھی لاتی ہوں۔" وہ بجلی کی طرح میرے قریب سے گزر کر میری تشنہ کامی بڑھاتی رہی۔ آدھ گھنٹے سے زیادہ گزر گیا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے حلق میں کانٹوں کا کھیت اُگ گیا ہے۔

ایک اور ہوسٹس چائے لے کر قریب سے گزری تو میں نے اشاروں سے پانی مانگا۔ وہ بولی، "دیکھتے نہیں میں مصروف

اپنے طیارے کے ساتھ فخر و شان کا عالم

ہوں۔ لادیتی ہوں پانی بھی"، میں جوئے آب کے کنارے پانی سے مایوس ہو گیا۔ اب حلق میں آگ سی بھڑکنے لگی۔ میرے لیے سانس لینا دشوار ہو گیا۔ ڈیڑھ گھنٹہ اسی کیفیت میں گزرا۔ میں نے پھر کسی سے پانی نہیں مانگا اور نہ کسی کو خیال آیا کہ ایک تشنہ لب پر کیا گزر رہی ہے۔"

ائیر مارشل بڑے شوق سے میری داستان سُنتے رہے اور پھر ذرا رُک رُک کر بولے:

www.urdudigest.com

"ہماری ایئر ہوسٹس زیادہ دیر تک ملازمت میں نہیں رہتیں۔ ملازمت کی اوسط میعاد مشکل سے ڈیڑھ دو برس بنتی ہے۔ نئی نئی ائیر ہوسٹسوں کو ذمے داری کا وہ احساس نہیں ہوتا جو ایک تجربہ کار ائیر ہوسٹس کو ہوسکتا ہے۔ پچھلے دنوں میں ہوائی جہاز میں سفر کررہا تھا۔ اس میں سب سے زیادہ تجربہ کار ائیر ہوسٹس کی ملازمت صرف چار ماہ تھی۔ بہرحال ہم ان کے نظام تربیت کو اور بہتر بنانے کی کوشش کریں گے۔ میں آپ کے یہ تلخ واقعات ابھی متعلقہ محکمے تک پہنچا دیتا ہوں۔"

ائیر مارشل اصغر خاں نے پھر ذرا اضطراب آمیز لہجے میں کہا "قریشی صاحب، سچی بات یہ ہے کہ پوری قوم کا کردار روبہ تنزل ہے۔ پی آئی اے بھی اس سے متاثر ہے۔ ان خامیوں کے باوجود یہ تنظیم کارکردگی کا اعلیٰ معیار رکھتی ہے۔ ہم پاکستانی ہر معاملے میں بہت اُونچا آئیڈیل تراشتے ہیں اور اس اعتبار سے ہماری تنقید کڑی ہوتی ہے۔ ذرا پی آئی اے کو دنیا کی دوسری ائیر لائنوں کے مقابلے میں رکھ کر دیکھیے، تب آپ کو صحیح صحیح احساس ہوگا کہ اس کی کارکردگی کا معیار کس قدر بلند ہے۔ غیر ملکی مسافر پی آئی اے کے بارے میں کیا تاثرات رکھتے ہیں، یہ میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔ فی الحال پی آئی اے کے چند بنیادی پہلو آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ اپنی کرسی سے اُٹھے میز تک گئے اور ایک خوبصورت چھپا ہوا پمفلٹ اُٹھا لائے۔ کہنے لگے: "ہوائی جہازوں کی کارکردگی ناپنے کے دو بڑے پیمانے ہیں:

(ا) ایک جہاز کی پرواز میں تاخیر کتنی پروازوں کے بعد ہوئی؟

(ب) ایک جہاز ایک دن میں کتنے گھنٹے استعمال ہوتا رہا؟

"ان پیمانوں کے مطابق وہ ائیر لائن کارکردگی کے اعتبار سے سب سے اچھی ہوگی جس کے ہوائی جہازوں کی زیادہ پروازیں وقت پر ہوتی ہیں اور اس کے ہوائی جہاز استعمال بھی سب سے زیادہ ہوتے ہوں۔ پی آئی اے کے پاس تین قسم کے ہوائی جہاز ہیں: فوکر، ٹائیڈنٹ اور بوئنگ۔ اب ہم ان تینوں ہوائی جہازوں کی کارکردگی کا سکیل پیش کرتے ہیں۔" یہ کارکردگی ۶۶ تا ۱۹۶۷ کی ہے۔

"پی آئی اے کے علاوہ دنیا کی پانچ اور ہوائی کمپنیاں فوکر استعمال کرتی ہیں۔ پی آئی اے کی کارکردگی یہ ہے کہ ۸۷ پروازوں کے بعد فوکر کی پرواز میں تاخیر ہوتی ہے۔ فوکر کی باقاعدہ پرواز میں ایک اور ہوائی کمپنی ہم سے سبقت لے گئی ہے۔ اس کے فوکر کی پرواز میں ۱۰۱ پروازوں کے بعد تاخیر ہوتی ہے، لیکن فوکر کی مدت استعمال میں پی آئی اے کا ریکارڈ سب سے بہتر ہے۔ ہمارا فوکر ایک دن میں ۷ء۳ گھنٹے پرواز کرتا ہے جبکہ دنیا کی دوسری بہترین کمپنی کا ریکارڈ ۲ء۴ گھنٹے پرواز پر مشتمل ہے۔

اس حُسن کارکردگی پر میرا سر فخر سے اُونچا ہونے لگا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ فنی معیار کے لحاظ سے پی آئی اے دنیا کی بہترین ہوائی کمپنی ہے۔ میری تلخیاں آہستہ آہستہ خوشیوں میں تبدیل ہونے لگیں۔ خیال آیا اگر پی آئی اے کا عملہ اور خوش اخلاق ہوجائے تو اس میدان میں بھی ہم سبقت لے جائیں گے۔

جناب اصغر خاں کا چہرہ گل تازہ کی طرح شاداب تھا۔ وہ سوالات کا سامنا کرنے میں خوشی محسوس کررہے تھے۔ میں نے ایک سوال اور چھیڑ دیا: "پاکستان کے سٹیٹ بینک نے پاکستانیوں پر یہ پابندی عائد کررکھی ہے کہ وہ ملک سے باہر صرف پی آئی اے کے ذریعے جاسکتے ہیں۔ اگر یہ پابندی ہٹا دی جائے تو کیا اس سے پی آئی اے متاثر ہوگا؟"

"جی نہیں، ہم پر اس پابندی کے ہٹ جانے سے ذرا بھی فرق نہیں پڑے گا۔ ہمیں اپنے معیار پر پورا پورا اعتماد ہے۔ وہ حضرات جنہوں نے دنیا بھر کی ہوائی کمپنیوں سے

اصغر خان، مادرِ ملت فاطمہ جناح اور اپنی اہلیہ کے ساتھ

سفر کیا ہے پی آئی اے کے بارے میں بہت اچھی رائے رکھتے ہیں۔ پچھلے دنوں نیویارک سے نلز ہٹسن آئے۔ انھوں نے ایک مضمون میں پی آئی اے کے متعلق لکھا:

"ہم نے ہوائی جہازوں کو بہت آرام دہ پایا۔ کھانا عمدہ تھا۔ عملے کے بارے میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے لاکھوں میل کے سفر میں اس سے زیادہ مہماں نواز اور بااخلاق عملہ نہیں دیکھا۔"

ایک اور مبصر نے پی آئی اے کو دنیا کی بہترین ملکی سروس (DOMESTIC SERVICE) قرار دیا۔ ایسے تبصرے دو چار نہیں سینکڑوں ہیں۔ میں چند ہی پر اکتفا کرتا ہوں۔"

گیارہ بجنے والے تھے۔ میں نے ائیر مارشل سے دوسری نوعیت کا سوال کیا: "کیا آپ بتا سکتے ہیں آپ نے پاک فضائیہ کو کن خطوط پر منظم کیا؟"

"میں اس سوال کے لیے تیار ہو کر نہیں آیا۔"

"اچھا تو پھر زندگی کے بارے میں کچھ بتا دیجیے۔"

"قریشی صاحب، میں اپنے بارے میں کیا بتاؤں۔ ہزاروں انسانوں نے میری زندگی دیکھی ہے۔ یہ کوئی غیر مطبوعہ کتاب نہیں۔ میرے متعلق اُن سے پُوچھیے جن کے درمیان میں رہتا آیا ہوں اور آپ میری زندگی کا کھوج لگا کر کریں گے کیا؟"

"ایک درخواست اور ہے۔"

"فرمائیے۔"

"میں ایک بار اور ملنا چاہتا ہوں۔"

"بڑی خوشی سے۔"

"میں آپ کی اہلیہ سے بھی ملنا چاہتا ہوں۔"

"ہمارے گھر آج شام ہی آجائیے۔ میں ان سے کہہ دوں گا کہیں نہ جائیں۔"

گیارہ بجے پہلی ملاقات ختم ہوگئی۔

پورے ساڑھے پانچ بجے میں اپنے بھائی انیس کی معیت میں جناب اصغر خاں کی اقامت گاہ پر پہنچ گیا۔ وہ مجھے ایک وسیع ڈرائنگ روم میں لے آئے۔ ڈرائنگ روم کی ہر چیز سادگی سے آراستہ تھی۔ اتنے میں مسز اصغر آگئیں۔ قمیص شلوار میں ملبوس بہت ہی سادہ۔ ان کی آمد پر اصغر خاں صاحب یہ کہہ کر چلے گئے: "یہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

میں نے بے تکلفی سے اپنا مدعا بیان کیا۔ کہنے لگیں: "میں ان کے بارے میں کیا بتاؤں، بس عام سے انسان ہیں۔"

"آپ نے انھیں بحیثیت شوہر کیسا پایا؟"

"اچھے ہیں۔ گھر کے معاملات میں دلچسپی لیتے ہیں۔ بچوں کی تربیت کا خاص خیال رکھتے ہیں۔"

"ان کی عادتیں کیسی ہیں؟"

"کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں۔ اتنا کہہ سکتی ہوں، بلند آواز سے نہیں بولتے۔ غصہ بہت کم آتا ہے۔ مزاح کی

www.urdugem.com

چاشنی طبیعت میں ہے۔"

"کچھ اور بھی بتائیے۔"

"ہاں یاد آیا، نظم وضبط کے بڑے پابند ہیں مگر اتنی سختی نہیں کہ بچے خوف کھانے لگیں۔ بس اور کیا بتاؤں۔"

"آپ نے ان کے ساتھ بیس برس گزارے ہیں۔ کیا آپ بیس منٹ بھی اس کا تذکرہ نہیں کرسکتیں؟"

"واقعی سوچتی ہوں میرے پاس کہنے کو کچھ بھی تو نہیں۔ ہاں ایک بات اور کہنا چاہتی ہوں۔ میں ان کی حد درجہ احسان مند ہوں۔ انھوں نے مجھے کسی مرحلے پر بھی بڑے آدمی کی بیوی ہونے کا احساس نہیں ہونے دیا۔ گھر میں اس قسم کا ماحول رکھا کہ ہمارے ذہنوں میں کسی قسم کی بو پیدا ہونے نہیں پائی۔ بچوں کو آرام اور آسائشوں کا خوگر ہونے نہیں دیا۔ وہ سخت سے سخت ماحول میں بھی مسکراتے رہیں گے۔ اصغر سگریٹ نہیں پیتے اور فلم بہت کم دیکھتے ہیں۔ میں خود بھی ایک مدت تک پکچر نہ دیکھ سکی۔ اب بچے بڑے ہوئے ہیں تو ان کے ساتھ چلی جاتی ہوں۔ یہ بات حیرت اور خوشی کی ہے کہ ان کے تمام بھائی ایک ہی جیسی طبیعت کے ہیں، گویا ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوں۔"

"محترمہ، آپ اصغر خاں صاحب کے خاندان کے بارے میں معلومات دے سکتی ہیں؟"

"جی ہاں ان کے والد، جواب فوت ہو چکے، کشمیر کی فوج میں بریگیڈیئر تھے۔ ضابطوں کے سخت پابند اور نہایت بارعب شخصیت کے مالک تھے لیکن اس سختی میں بچوں کے لیے شفقت پوشیدہ تھی۔ صوم وصلوٰۃ کے عادی تھے۔ اصغر کی والدہ حد درجہ سادہ ہیں۔ کہتی ہیں جوانی بھی آرائش وزیبائش سے پاک گزری۔ ان کے والد کو بچوں کی تربیت کا اس قدر خیال تھا کہ اگرچہ انھیں موسیقی سے بڑا لگاؤ رہا لیکن اس لیے کہ کہیں بچوں پر اس کا بُرا اثر نہ پڑے، اس کے نشانات گھریلو زندگی سے بالکل مٹا دیے۔"

اتنے میں ائیر مارشل تشریف لے آئے اور ہمارے ساتھ چائے میں شامل ہوگئے۔ میں نے ان سے مسکراتے ہوئے کہا: "آپ کی بیگم آپ سے بھی زیادہ کم سخن نکلیں۔"

"وہ کہیں بھی کیا۔ کہنے کی کوئی بات تو ہو، البتہ کرنے کی بہت سی باتیں ہیں۔"

"وہ کیا؟"

"مجھے ایک زمانے سے اس کی فکر ہے کہ بچوں کے لیے خوبصورت، دلچسپ اور آسان اسلامی کتابیں لکھی جائیں۔ میرا خیال ہے بچپن میں جو کچھ پڑھا جاتا ہے، اس کا اثر بہت گہرا ہوتا ہے۔ میں نے جو کتابیں دیکھیں وہ غیر دلچسپ اور مشکل تھیں۔ بچہ دلچسپ تحریر کی طرف لپکتا ہے۔ میں نے اس سلسلے میں کتابوں کا ایک سیٹ بھی تیار کروایا تھا۔ چاہتا ہوں اس سے بھی بہتر کتابیں عام ہونی چاہئیں۔"

"ائیر مارشل صاحب، آپ بچوں کو اسلامی تعلیم دلوانا کیوں ضروری سمجھتے ہیں؟"

"اس لیے کہ اسلامی تعلیمات کے بغیر اچھا کردار تشکیل نہیں ہوگا۔"

"آخر وہ لوگ بھی اپنا کردار تعمیر کرتے ہیں جن کے ہاں اسلامی تعلیمات نافذ نہیں ہیں۔"

"وہ بھی کسی نہ کسی اخلاقی یا ذہنی نظام کا سہارا لیتے ہیں۔"

"ہم بھی انہی کا سہارا کیوں نہ لیں؟"

"یہ تو ہماری نادانی ہوگی کہ ایک طاقتور نظام کے ہوتے ہوئے ہم کمزور باتوں کا سہارا لیں۔ اسلام کے حقیقی نظام اقدار کی ہمیں سخت ضرورت ہے۔ پاکستان میں ہمارے پاس پہلے سے ایک مضبوط بنیاد موجود ہے۔ ہم اسے تباہ کر کے نئی بنیاد کبھی تعمیر نہ کرسکیں گے اور آخر ہم ایسا کریں کیوں؟ اپنی قوتوں کو منفی راہوں میں ضائع کرنے کے بجائے انھیں مثبت طریقوں سے کردار کی تعمیر میں لگا دیں۔"

"کیا آپ نے پاک ائیر فورس کے جوانوں میں اسلامی علوم کا شوق پیدا کرنے کی کوشش کی؟"

"جی ہاں! میں یہ چاہتا تھا کہ اسلامی علوم کے لیے ایسے اساتذہ لیے جائیں جن کی ذہنی سطح بلند ہو۔ جدید علوم سے بھی باخبر ہوں اور ان کی معاشرتی حیثیت اچھی ہوتا کہ نوجوان افسر ان کی باتوں کو اہمیت دیں۔ جدید علوم سے آراستہ نوجوان کو پڑھانے کے لیے اگر ایک کم علم مولوی مقرر کر دیا جائے تو وہ اُسے اور اُس کی باتوں کو کچھ بھی وزن نہ دیں گے۔ بار بار کی کوشش کے باوجود میں اس معیار کے عالم حاصل نہ کرسکا۔ مجھے یقین ہے اسلامی انداز نظر سے زندگی میں بڑا توازن اور اعتدال آجاتا ہے اور ایسا کردار تعمیر ہوتا ہے جس پر اعتماد کیا جاسکتا ہو۔"

"ہمیں ستمبر کی جنگ میں جو عظیم الشان کامیابی نصیب ہوئی کیا اس میں جذبہ ایمانی کا بھی کوئی دخل ہے؟"

"یقیناً جذبہ ایمانی کا بڑا دخل ہے اور اللہ تعالیٰ کی نصرت بھی ہمارے ساتھ رہی، لیکن یہ سب کچھ اُسی وقت ہوتا ہے جب ہم اپنا فرض ادا کرتے ہیں۔"

اتنے میں ان کا ایک بچہ ادھر سے گزرا۔ عمر یہی کوئی دس برس ہوگی۔ سادہ سے کپڑے، چہرے پر انکسار، چال ڈھال میں بلا کی تیزی مگر سنبھلی ہوئی۔ وہ ہمیں سلام کر کے دوسری طرف چلا گیا۔

"ہمیں اس عمر کے بچے کے لیے اچھی اسلامی کتابیں چاہئیں۔" ائیر مارشل صاحب نے کہا۔

"میں بھی اُردو کی کتابیں پڑھنا چاہتی ہوں لیکن میری اُردو اچھی نہیں۔ کانونٹ اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے اُردو زبان نہ آئی"۔ مسز اصغر نے بڑے بھولپن سے کہا۔

"میں نے اسی لیے اپنے بچوں کو کانونٹ اسکولوں میں نہیں بھیجا۔ مجھے یہ اسکول ذرا اچھے نہیں لگتے۔ قومی جذبہ اور شعور تو پیدا ہی نہیں ہونے دیتے۔" جناب اصغر خاں نے اپنی مخصوص ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔

مغرب کی نماز کا وقت قریب آرہا تھا۔ ہم نے اجازت لی۔ چلتے وقت ماہِ مارچ کا اُردو ڈائجسٹ مسز اصغر کو دیا کہ ذرا اسے پڑھ کر تو دیکھیے شاید یہ آپ کی اُردو کو آپ کی سیرت کی طرح دلکش بنا دے۔

دوسری ملاقات ختم ہوگئی۔

☆☆☆☆

۱۵ مارچ کو پھر ان سے ملنے پہنچا۔ وہ ایک وضعدار انسان کی طرح میرے استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ کمرے میں ہمارے سوا اور کوئی نہ تھا۔

"مجھے آپ سے محبت ہوگئی ہے اسی لیے بار بار ملنے آتا ہوں۔" یہ فقرہ بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔

"محبت تو اچھی چیز ہے اگر سچی ہو۔" وہ آنکھوں سے مسکرائے۔

"جناب قوم کے نام کوئی پیغام ہی دے دیجیے۔"

"پیغام دینے والوں کی پہلے ہی کب کمی ہے اور میں کس قابل ہوں۔"

"آپ نے سخت محنت اور ریاضت کی زندگی گزاری ہے۔ کچھ ہمیں بھی تو بتائیے، ریاضت کی عادت کیونکر پڑتی ہے؟"

"میری رائے میں ہماری قوم حد درجہ محنتی اور جذبے والی ہے۔ باہر جا کر معلوم ہوتا ہے کہ اس قوم میں کیا کیا جواہر ہیں۔"

"جناب اگر ہماری قوم میں محنت کی صفات پائی جاتی ہیں تو معاشرے میں صحت مند زندگی پنپ کیوں نہیں رہی؟"

"اس کی وجہ کچھ اور ہے۔ مختلف سطحوں پر بے لوث اور بے غرض قیادت مقصود ہے۔ قوم میں بے پناہ جذبہ اور ولولہ ہے لیکن اسے صحیح خطوط پر تربیت دینے والے ہاتھ نظر نہیں آتے۔ میری آنکھوں نے تین مواقع پر قوم کا عدیم المثال

www.urdugem.com

اصغر خان ۱۹۴۸ میں قائدِ اعظم کے ساتھ

جوش وخروش دیکھا لیکن ہم اسے مستقل حیثیت نہ دے سکے۔"

میں ذہن ہی ذہن میں تین مواقع تلاش کرتا رہا۔ ایک جب پاکستان بنا تھا۔ شاید دوسرا وہ جب مارشل لا نافذ ہوا اور تیسرا جب ہم نے بھارت کے خلاف اپنی آزادی اور بقا کی جنگ لڑی۔ واقعی ان تینوں مواقع پر قوم نے عظیم الشان زندگی کا ثبوت دیا مگر ہماری روش زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ شاید اس لیے کہ ہنگامی رویے غباروں کی طرح پھٹ جاتے ہیں۔ میں نے اپنا یہ احساس ائیر مارشل صاحب کی طرف منتقل کرتے ہوئے کہا:

"وقتی جذبوں سے کیا کوئی تعمیری کام لیا جاسکتا ہے؟"

"کیوں نہیں۔ غالباً مسلمان قوم کا مزاج ہی کچھ ایسا ہے کہ وہ ہمیشہ سخت حالات میں اپنی صلاحیتوں سے کام لیتی ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو ہم قائداعظم سے ملے تھے۔ میں تو تب ایک جونیئر افسر تھا اس لیے پیچھے کھڑا رہا البتہ جنرل اکبر خاں پیش پیش تھے۔ دوران گفتگو قائداعظمؒ نے ایک مرحلے پر فرمایا:

"مسلمانوں کی پوری تاریخ دیکھ لیجیے، ان پر جب کبھی برا وقت آیا، اسی وقت ان کے اندر سے عمل اور کردار کی بے پناہ قوتیں اُمڈ پڑیں۔ ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ انشاءاللہ ہماری قوم ایک عظیم تاریخ بنائے گی۔"

"میرے کانوں میں قائداعظمؒ کے یہ الفاظ آج بھی گونج رہے ہیں اور میں پُرامید ہوں کہ ہمارا حال اور مستقبل درخشندہ رہے گا۔

"ہم مستقل طور پر بیرونی خطروں میں گھرے ہوئے

ہیں۔ بھارت نے پاکستان کو قبول نہیں کیا۔ پاکستان بننے سے ایک دو روز پہلے ایک عجیب وغریب واقعہ پیش آیا جس سے مجھے صورت حال کی نزاکت کا شروع ہی سے شدید احساس ہوگیا۔ غالباً یہ گیارہ یا بارہ اگست کی بات ہے۔ برصغیر آزاد ہونے والا تھا اور پریڈ کے سلسلے میں ہم بھارت کے جنرل تھمیا کے ساتھ کھڑے تھے۔ زیادہ تر غیر مسلم فوجی حکام تھے۔ اتنے میں ہند پارلیمنٹ کا ایک ہندو رکن جنرل کے پاس آیا۔ وہ سمجھا کہ وہاں سبھی غیر مسلم حکام کھڑے ہیں۔ اس نے جنرل کا دامن پکڑتے ہوئے پوچھا:

"مجھے یہ بتاؤ، ہم پاکستان کو کتنے گھنٹے میں فتح کرلیں گے۔"

"جنرل میری موجودگی کی وجہ سے اُسے ٹالتا رہا لیکن اس شخص نے پیچھا نہ چھوڑا۔ وہ بار بار یہی پوچھتا تھا کہ آپ پاکستان پر کب حملہ کررہے ہیں۔"

"اس منظر نے میرے دل پر گہرا اثر کیا اور مجھے یہ یقین ہوگیا کہ پاکستان کو زندہ رہنے کے لیے ہر وقت چاق وچوبند رہنا پڑے گا۔ میں نے پاک فضائیہ کی تربیت اسی اصول پر کی تھی کہ بس اب حملہ ہوا اور اب ہوا۔ ہماری اسی تیاری نے ستمبر میں دشمن کے ناپاک ارادوں کو ناکام بنایا۔ ہمارے پاس مادی اسباب کم ہیں اور وہ مسلمانوں کے پاس ہمیشہ کم رہے ہیں، لیکن اسلحہ سے زیادہ انسان کا فولادی جذبہ اور اس کی ناقابل تسخیر روح اہم ہے۔ مجھے یقین ہے دشمن ہمیں ہر وقت تیار اور مستعد پائے گا۔"

انھوں نے پھر پہلو بدلتے ہوئے کہا: "قریشی صاحب، مجھے افسوس ہے، میں آپ سے زیادہ باتیں نہ کرسکا۔ میں سمجھتا ہوں ہمیں اچھی باتیں بھی کرنی چاہییں، لیکن زیادہ ضروری اچھی مثالیں قائم کرنا ہے۔ آپ دعا کیجیے یہ زندگی کوئی اچھی مثال بن سکے۔"

آخری ملاقات بھی عہد جوانی کی طرح مختصر تھی۔ میں ائیر مارشل کی زندگی کے صرف چند موڑ جمع کرسکا۔

ائیر مارشل اصغر خاں کا تعلق آفریدی قبیلے سے ہے۔ ان کے والد بریگیڈیئر رحمت اللہ زیادہ عرصہ کشمیر میں رہے۔ اصغر خان کے آٹھ بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ آٹھ میں سے دو بھائیوں نے پاک فضائیہ پر اپنی جانیں قربان کردیں۔ دونوں ہوائی حادثے کا شکار ہوئے۔

ائیر مارشل کی شخصیت کے پھول آنکھوں سے چنے۔ اس کے لیے پشاور سے لے کر کراچی تک بہت سے اصحاب سے ملا۔ ان میں مدح سرا شامل تھے اور نکتہ چیں بھی۔ ایک صاحب نے ملتے ہی کہا:

"اگر ہمارے پاس اصغر خاں جیسے پانچ افراد اور ہوں تو قومی زندگی میں انقلاب آجائے۔"

میں نے شروع میں اس جملے کو ایک جذباتی دھماکے سے زیادہ اہمیت نہ دی لیکن بعد میں میرے جذبات بھی دامن خرد کو کھینچتے تھے۔ اس حقیقت کا مخالفین بھی اعتراف کرتے ہیں کہ ائیر مارشل اصغر خاں بلا کی نظر رکھتے ہیں اور ان کا دماغ حیرت انگیز طور پر کام کرتا ہے۔ ایک صاحب نے بڑا دلچسپ واقعہ سنایا:

"ائیر مارشل نے ڈیفنس سوسائٹی کراچی میں اپنا ایک مکان بنوایا۔ مکان کی ڈیزائننگ مشہور آرکیٹیکٹ مسٹر بلوم فیلڈ نے کی تھی۔ ایک روز ائیر مارشل اسی فرم کے ایک کہنہ مشق انجینئر مسٹر لٹن کے ساتھ مکان دیکھنے گئے۔ ائیر مارشل سیڑھیوں سے اُوپر چلے گئے اور واپس اُترتے ہوئے ایک سیڑھی پر آڑکے۔ کہنے لگے:

"مسٹر لٹن، یہ سیڑھی چھوٹی ہے۔"

"جی نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔"

"میرے خیال میں یہ ۸/۱۱ انچ چھوٹی ہے۔"

مسٹر لٹن اختلاف کرتے رہے۔ فیتہ منگوا کر پیمائش کی گئی تو سیڑھی واقعی ٹھیک ۸/۱۱ انچ چھوٹی تھی۔ سب

www.urdugem.com

حیران رہ گئے۔

ایک صاحب نے بتایا کہ ایک موقع پر ائیر مارشل کو ساری پریڈ کا معائنہ کرنا تھا۔ کمانڈر انچیف کے معائنے سے پہلے کئی اور ذمہ دار افسر پریڈ کا معائنہ کر چکے تھے۔ ائیر مارشل آئے، پریڈ پر سرسری نظر ڈالی، ایک جگہ آ کر رُک گئے اور بولے:

"چار فیتے نظر آ رہے ہیں۔"

ہوتا یہ ہے کہ بوٹ پر پٹی اس طرح باندھی جاتی ہے کہ اس کے تین فیتے نظر آنے چاہئیں۔ فاصلے سے اتنے باریک فرق کو صرف ائیر مارشل کی نظر ہی دیکھ سکتی تھی۔

ائیر مارشل کے ساتھیوں نے ان کے حافظے کے بے شمار دلچسپ واقعات سنائے۔ اختصار کے طور پر یہ سمجھ لیجیے کہ جس شخص کو ایک بار دیکھ لیا بیس برس کے بعد بھی بڑی آسانی سے پہچان لیں گے۔ وہ اکثر رفیقوں اور کارکنوں کا نام لے کر پکارتے ہیں۔

فوجی صلاحیتوں کے بارے میں جب میں نے مختلف احباب سے سوال کیا تو ان سب کا ایک ہی جواب تھا:

"ستمبر کی جنگ میں پاک فضائیہ کی برتری ائیر مارشل کی فوجی صلاحیتوں کا جیتا جاگتا کرشمہ ہے۔ انھوں نے اس جنگ میں جو کردار پیش کیا، ارباب بصیرت اچھی طرح واقف ہیں۔ پہلے رسالپور میں ایک تربیتی کالج کی بنیاد رکھی۔ ہوابازوں کو تربیت دی اور پھر انہیں فضا میں اس طرح تیار کیا کہ ان کی پُھرتی، شجاعت اور حیرت انگیز کارکردگی پر پوری دُنیا حیرت زدہ رہ گئی۔"

ایک قریبی دوست نے بتایا:

"ائیر مارشل نوجوانوں میں جذبہ اور اعتماد پھونکنے میں کیونکر کامیاب ہوئے یہ ایک بڑی دلچسپ داستان ہے۔ ان کا اصول یہ تھا کہ مشکل کام کا حکم دینے سے پہلے اُسے خود کر کے دکھاتے۔ سخت سے سخت مشقوں کا آغاز اپنی ذات سے کرتے۔ خطرناک مُہموں پر سب سے پہلے خود جاتے۔ اس عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے کسی بھی ہواباز میں کبھی بے یقینی کی کیفیت پیدا نہیں ہوئی۔

"اصغر خان کا دوسرا اصول یہ تھا کہ نوجوانوں کو پورا پورا آرام ملے۔ جسمانی آرام کے ساتھ ساتھ ان کے ذہنی سکون کا بھی بڑا خیال رکھتے۔ انھیں احساس تھا کہ اگر ایک ہواباز کی گھریلو زندگی پریشان سی ہو تو وہ فضا میں خوفناک حادثے کا شکار ہو سکتا ہے۔ اس مقصد کے لیے ائیر مارشل نے سائنسی رپورٹ مرتب کروائی جس میں ہواباز کے ذہنی خلفشار کے مہلک نتائج کا جائزہ لیا گیا تھا۔ اس رپورٹ کی روشنی میں انھوں نے خواتین کی ایک ٹیم تیار کی جو ہوابازوں کی بیگمات کو یہ بتاتی تھی کہ تمہاری ذرا سی جھک جھک سے تمہارے خاوند کی زندگی کس طرح خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ ان کوششوں کے بہت اچھے نتائج برآمد ہوئے۔

"تیسرا اصول یہ تھا کہ پاک فضائیہ کو دفاعی جنگ کے لیے تیار کیا جائے۔ ان کا اندازہ تھا کہ جنگ جب بھی ہوئی بہت شدید اور بہت تیز ہوگی اور اس جنگ کا فیصلہ شروع کے دو تین روز ہی میں ہو جائے گا۔ اپنے اس اندازے کے مطابق انہوں نے تربیت، ہمہ وقت تربیت اور مکمل مکمل تربیت پر زور دیا۔ ان کی تربیت سے ہماری فضائیہ اس انجام سے بچ گئی جو شرق اوسط میں عرب فضائیہ کا ہوا۔ ہماری مختصر سی فضائیہ نے ایک بہت بڑے دشمن کو ٹھنڈا کر دیا۔"

ائیر مارشل کے کردار کے متعلق ایک جواں سال افسر نے کیا خوب بات کہی:

"وہ با اصول، باضمیر، صابر اور بُردبار سبھی کچھ ہیں، مگر مجھے ان کی یہ ادا سب سے زیادہ پسند ہے کہ انھیں اپنے جسم اور روح پر پُورا پُورا کنٹرول ہے۔ ان کا منضبط ذہن اور کردار اخلاقی قدروں سے غذا حاصل کرتا ہے۔"

ایک دوسرے صاحب نے بتایا، وہ ہر کام قاعدے کے مطابق کرتے ہیں خواہ اس میں کتنا ہی وقت لگے اور کتنا ہی ایثار کرنا پڑے۔ وہ جب پی آئی اے میں آئے اور انہوں نے پرواز کے لیے لائسنس لینا چاہا، تو وہ اُن تمام ضابطوں سے گزرے جن سے ایک عام ہواباز گزرتا ہے۔ بلکہ اپنے اُوپر اور زیادہ پابندیاں عائد کر دیں۔ ایک عام ہواباز کو پاکستان ہی میں امتحان دے کر لائسنس مل جاتا ہے! مگر انھوں نے کہا، آپ لوگ مجھے ایسے ہی پاس کر دیں گے؛ چنانچہ امریکا کی بین الاقوامی تنظیم کے سامنے امتحان دیا اور وہاں سے لائسنس حاصل کیا۔

سفارش انہیں سخت ناپسند ہے ان کی نظر ہر وقت آدمی کے کردار اس کی کارکردگی پر رہتی ہے۔ بڑے بڑے نازک مواقع آئے لیکن انھوں نے سفارش کے آگے سر نہ جُھکایا۔ قیافہ شناس ایسے کہ ایک نظر ڈالتے ہی انسان کی خوبیوں اور خرابیوں کو بھانپ لیتے ہیں۔ اگر کسی میں خرابی ہو اس کی اصلاح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر وہ صاحب اصلاح قبول کرنے سے مسلسل انکار کرتے رہیں تو پھر معاف نہیں کرتے، خواہ وہ قریبی رشتے دار ہی کیوں نہ ہوں۔

دولت اور مناصب سے انہیں ذرا محبت نہیں بلکہ ان سے دُور بھاگتے ہیں۔ جب وہ پاک فضائیہ سے ریٹائر ہونے لگے تو اُن کے ایک رشتے دار نے کہا:

"آپ پاک فضائیہ میں ابھی اور قیام کریں، قوم کو آپ کی صلاحیتوں اور تجربوں کی سخت ضرورت ہے۔"

اصغر خان نے کہا "میں نے کمان تیار کر دی ہے۔ میں اس پر مسلط نہیں رہنا چاہتا۔ یہ بات کسی تنظیم کے لیے بھی اچھی نہیں کہ وہ ایک شخص کے گرد گھومتی رہے۔"

اب وہ پی آئی اے سے بھی جا رہے ہیں۔ کہتے ہیں:

"نوجوانوں کو کام کرنے کا موقع ملنا چاہیے۔ آخر ہم مناصب سے کیوں چپکے رہیں۔"

ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنا بدل ضرور تیار کرتے ہیں، کسی جگہ خلا چھوڑ کر نہیں جاتے۔ شاید وہ اپنے رفقاء پر بہت اعتماد کرتے اور اپنی موجودگی میں انھیں ذمہ داریاں سنبھالنے کے اہل بنا جاتے ہیں۔

عوامی زندگی کے وقار کا انھیں حد درجہ خیال رہتا۔ خود تو انھوں نے دولت کو کبھی اپنا معبود نہیں بنایا اور نہ اپنے دامن کو رنگ ہوس سے داغدار ہونے دیا، مگر وہ اس بات کی بھی بہت احتیاط کرتے ہیں کہ ان کے منصب سے رشتہ دار اور دوست احباب ناجائز فائدہ نہ اُٹھالیں۔ وہ تو جائز فائدہ بھی نہیں اُٹھانے دیتے۔ دراصل وہ اعلیٰ پائے کی صحت مند روایات قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ایک واقعے سے ان کی روحِ تقویٰ کا اندازہ لگائیے:

ائیر مارشل کے بھائی، بریگیڈیئر افضل خاں کا ایک ڈیری فارم ہے۔ وہ عرصے سے پی آئی اے کو کچھ چیزیں مہیا کرتے تھے۔ جب ائیر مارشل نے پی آئی اے کا چارج سنبھالا، تو پہلا کام یہ کیا، اپنے بھائی کو خط لکھا کہ آج کے بعد آپ کی فرم کا پی آئی اے اور شہری ہوابازی کے محکمے سے کوئی کاروباری لین دین نہیں ہونا چاہیے۔ اس خط سے کرنل افضل خاں کو ہر ماہ اسی ہزار روپے کا نقصان ہوا، مگر ائیر مارشل نے ایک اچھی مثال قائم کرنے کے لیے ہنسی خوشی یہ قربانی دے دی۔

راست گو اتنے کہ حق بات کہتے ہوئے کسی سے خوف محسوس نہیں کرتے۔ اس سے بڑی بات یہ کہ سچ بات سُننے کا بھی پُورا پُورا حوصلہ رکھتے ہیں۔ ماتحتوں سے عمدہ سلوک کرتے ہیں۔ ایک بار کسی ملک کے سربراہ آ رہے تھے۔ ائیر مارشل کو ان کی آمد کا وقت غلط بتایا گیا جس وجہ سے وہ وقت پر نہ پہنچ سکے۔ جن صاحب سے غلطی ہوئی تھی انھوں نے کہا، "میری ذہنی حالت کچھ ایسی تھی کہ مجھ سے غلطی ہو گئی۔"

ائیر مارشل نے کہا:

"اچھا کوئی بات نہیں۔"

www.urdugem.com

عاصم محمود

ایک بااصول اور دیانت دار فوجی افسر کی سرگزشت جو تمام عمر اپنے محبوب وطن کو کرپٹ نظام سے نجات دلانے کی جدوجہد کرتے رہے

نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاک باز

پاک فضائیہ کا معمار

یہ ۱۹۶۲ء کی بات ہے، سربراہِ پاک فضائیہ کی بیگم کے قریبی رشتے دار کراچی میں وفات پا گئے۔ وہ خود راولپنڈی میں مقیم تھیں۔ اب وہ جلد از جلد کراچی جانا چاہتی تھیں۔ پی آئی اے سے رابطہ کیا تو پتا چلا کہ کسی طیارے میں کوئی نشست خالی نہیں۔ اب کیا کیا جائے؟

اتفاق سے اسی دن ایک سی ون تھرٹی طیارہ پنڈی سے کراچی جا رہا تھا۔ نائین نے اپنے کمانڈر کو مشورہ دیا کہ بیگم صاحبہ اس میں بیٹھ کر چلی جائیں۔ سربراہ پاک فضائیہ نجی کاموں کی خاطر کوئی سرکاری چیز استعمال نہیں کرتے تھے مگر اِبھی ایمرجنسی تھی لہٰذا انھوں نے بادلِ نخواستہ ہامی بھر لی۔

جب وہ بیگم کو سوار کروانے سی ون تھرٹی پہنچے تو وہاں انھوں نے دیکھا، عام سپاہیوں کے لیے مختص کرسیاں ہٹا کر آرام دہ وی آئی پی نشستیں لگائی گئی ہیں۔ یہ دیکھ کر سربراہ پاک فضائیہ بہت ناراض ہوئے۔ انھوں نے حکم دیا کہ فوراً یہ وی آئی پی نشستیں ہٹا کر عام سپاہیوں والی کرسیاں لگائی جائیں اور یہ بھی کہا کہ آئندہ ان کے لیے یا ان کے اہلِ خانہ کی خاطر کوئی وی آئی پی بندوبست نہ کیا جائے۔

پاک فضائیہ کے اس بااُصول سربراہ کو دنیا اصغر خان کے نام سے جانتی ہے جو ۵ جنوری ۲۰۱۸ء کو اپنے رب کے حضور حاضر ہو گئے۔ صرف دو ہفتے بعد ان کی ستانوے (۹۷) سالگرہ آنے والی تھی۔

قیامِ پاکستان کے بعد اس نئے وطن کی تعمیر میں جن لوگوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ان میں اصغر خان کا نام نمایاں ہے۔ آپ ایک نڈر فوجی، فرض شناس انسان، دیانت دار لیڈر، محبِ وطن راہنما اور اعتدال پسند دانشور تھے۔ بشر ہونے کے ناتے مرحوم سے غلطیاں بھی ہوئیں مگر تاعمر ان کی یہی سعی رہی کہ خیر کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ وہ ان گنے چُنے لیڈروں میں سے تھے جو سچ اور جھوٹ میں تمیز کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اصغر خان کی داستانِ حیات میں خصوصاً نئی نسل کے لیے بہت سے سبق پوشیدہ ہیں۔ مثال کے طور پر یہ کہ جذبہ حبُ الوطنی سے سرشار ہو کر محنت و لگن سے کام کیا جائے، تو نہ صرف انفرادی طور پر کامیابیاں ملتی ہیں بلکہ ملک و قوم کو بھی فائدہ ہوتا ہے۔ اصغر خان نے کبھی ذاتی مفادات کو اوّلیت نہ دی اور ہمیشہ قومی و اجتماعی مفاد مدِنظر رکھا۔

ابتدائی زندگی

محمد اصغر خان ۱۷ر جنوری ۱۹۲۱ء کو جموں و کشمیر کے صدر مقام، سری نگر میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد، سردار رحمت اللہ خان کا تعلق قبائلی علاقے کی وادیٔ تیرا سے تھا۔ ریاست جموں و کشمیر میں وہ شاہی فوج کے افسر تھے۔ والد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے بھائیوں میں سے چار نے سپاہیانہ پیشہ ہی اپنایا۔ ان میں اصغر خان بھی شامل تھے۔

۱۹۴۰ء میں عسکری تعلیم پا کر اصغر خان برطانوی ہند کی فوج میں شامل ہو گئے مگر وہ بچپن سے پائلٹ بننے کا خواب

اصغر خان کے والد، بریگیڈیر (ر) رحمت اللہ

www.urdugem.com

دیکھ رہے تھے۔ یہی وجہ ہے، جب کچھ عرصے بعد ہندوستانی شاہی فضائیہ میں پائلٹوں کی اسامیاں نکلیں، تو انھوں نے بھی درخواست دے ڈالی جو قبول ہوئی۔ چنانچہ اصغر خان نے والٹن (لاہور) اور حیدر آباد دکن میں ہوا بازی کی تربیت پائی۔ تربیت مکمل ہوئی تو انھیں ہندوستانی شاہی فضائیہ کے اسکواڈرن ۹ بھجوا دیا گیا۔

اصغر خان پھر مختلف علاقوں میں تعینات رہے۔ انھوں نے وزیرستان کی جنگی مہمات میں بھی حصہ لیا مگر کئی برس بعد انکشاف کرتے ہوئے بتایا کہ وہ خالی دیہات میں بم باری کر کے پلٹ آتے تھے۔ ظاہر ہے ان کے ضمیر نے یہ گوارا نہ کیا کہ ہم وطنوں کے خون سے ہاتھ رنگے جائیں۔

انگریز حاکموں کی حکم عدولی

۱۹۴۲ء میں سندھ میں حروں کے لیڈر، صبغت اللہ شاہ راشدی انگریز حکومت کے خلاف جدوجہد شروع کر چکے تھے۔ ایک دن اصغر خان کو حکم ملا کہ سانگھڑ کے نزدیک گوٹھ نواز جام علی نامی علاقے میں حروں نے اپنا مرکز قائم کر رکھا ہے، اُسے بم باری سے اُڑا دیا جائے۔ اس بار دو اور ہوا باز بھی ان کے ہمراہ تھے۔

جب اصغر خان اپنے بمبار پر سوار گوٹھ نوز جام علی پہنچے، تو دیکھا کہ مرد و خواتین کھیتوں میں کام کر رہے ہیں۔ بچے گلیوں میں کھیل رہے تھے۔ غرض وہ کسی طور "دہشت گرد" نظر نہیں آتے تھے جبکہ انگریز حکومت نے حروں کو فسادیوں کے طور پر مشہور کر رکھا تھا۔ یہ دیکھ کر انھوں نے بم باری کرنے سے انکار کر دیا۔

جب اصغر خان واپس اپنے مستقر پہنچے، تو ان کے ساتھیوں نے انگریز افسروں کو بتایا کہ انھوں نے بم باری میں حصہ نہیں لیا۔ افسروں کے استفسار پر اصغر خان نے کہا کہ وہ نہتے لوگوں کو دہشت گرد نہیں سمجھتے۔ حکم عدولی پر انھیں اظہار وجوہ کا نوٹس جاری کر دیا گیا۔ ایسے عمل پر اصغر خان

قومی مسائل کے حل کی کھوج میں استغراق کا ایک لمحہ

اپنی پسندیدہ ملازمت سے ہاتھ دھو سکتے تھے مگر انھوں نے وہی کیا جسے درست و برحق سمجھا۔

جب جنوب مشرق ایشیا میں دوسری جنگ عظیم کے شعلے بھڑکے تو اصغر خان کو برما کے محاذ پر بھجوا دیا گیا۔ وہاں انھوں نے اخیاب کے علاقے میں جاپانی فوج کا مقابلہ کیا۔ اخیاب ہی میں روہنگیا مسلمان بہ کثرت آباد تھے جو اب برمی حکمرانوں کے خوفناک ظلم و ستم کا شکار ہیں۔

دوسری جنگ عظیم ختم ہوئی تو اصغر خان اعلیٰ عسکری تعلیم حاصل کرنے برطانیہ چلے گئے۔ انھوں نے وہاں عسکری اخلاقیات میں بی ایس سی کیا نیز ان کو برطانیہ میں جیٹ طیارہ، گلوسٹر میٹور چلانے والے پہلے ہندوستانی پائلٹ بننے کا بھی اعزاز حاصل ہوا۔ ۱۹۴۷ء تک درحقیقت اصغر خان ہندوستانی شاہی فضائیہ کے سب سے سینئر مقامی افسر بن چکے تھے۔

یہی وجہ ہے، جب ہندوستان دو مملکتوں، بھارت اور پاکستان میں تقسیم ہوا۔ تو اصغر خان اس کمیٹی میں شامل تھے جس نے عسکری ساز و سامان دونوں نئے ملکوں کے مابین بانٹا

تھا۔ تب تک وہ قائداعظم محمد علی جناحؒ سے ملاقات کر چکے تھے۔ آہنی عزم و حوصلے کے مالک قائد نے انھیں از حد متاثر کیا۔

ائیر فورس کی تعمیر و تشکیل

قیام پاکستان کے وقت اصغر خان نے دو بھائیوں کے ساتھ پاک فضائیہ میں شمولیت اختیار کر لی۔ تیسرے بھائی پاک فوج میں شامل ہوئے۔ بھارت سے پاکستان آتے ہوئے اصغر خان موت کا شکار ہونے سے بال بال بچے۔ ہوا یہ کہ انھیں بیگم اور بچوں کے ساتھ نئی دہلی سے بذریعہ ریل لاہور پہنچنا تھا مگر نئی دہلی میں ان کے ساتھی افسروں نے ہوائی جہاز سے ان کے لیے سفری بندوبست کر دیا۔ بعد ازاں اصغر خان پر منکشف ہوا کہ جس ریل سے انھیں لاہور جانا تھا، بلوائیوں نے راہ میں اُسے روکا اور اس پر سوار سبھی مسلمانوں کو شہید کر دیا۔

تقسیم ہند کے قتل و غارت نے اصغر خان کو احساس دلا دیا کہ ارض پاک بڑی قربانیوں کے بعد حاصل کیا گیا ہے۔ چنانچہ وہ تن من دھن سے پاکستان کو مضبوط و توانا بنانے کی تگ و دو میں لگ گئے۔ پاکستانی حکومت نے انھیں رسال پور میں ائیر فورس اکیڈمی کا پرنسپل مقرر کیا۔ مقصد یہ تھا کہ وہ پاک فضائیہ کے لیے بہترین تربیت یافتہ ہوا باز تیار کر سکیں۔ اصغر خان نے نہایت ذمہ داری اور فرض شناسی سے یہ اہم کام انجام دیا۔

رسال پور میں اصغر خان کی زیر ہدایت پائلٹوں کے لیے تربیتی نصاب تیار ہوا۔ مزید برآں ان کی نگرانی میں شعبہ انجینئرنگ میزائل بھی تیار کرنے لگا۔ ۱۹۵۰ء میں ان کا تجربہ و مہارت مدنظر رکھتے ہوئے اصغر خان کو ڈی جی (ڈائریکٹر جنرل) ائیر آپریشن بنا دیا گیا۔ اس حیثیت سے انھوں نے پاک فضائیہ میں بحث و مباحث کو رواج دیا اور دشمن کا مقابلہ کرنے کی خاطر جامع حکمت عملی وضع کی۔

۱۹۵۵ء میں اصغر خان اسسٹنٹ چیف آف دی آف ائیر سٹاف بنا دیے گئے۔ دو سال بعد جولائی ۱۹۵۷ء میں پاک فضائیہ کے پہلے مقامی سربراہ مقرر ہوئے۔ تب ان کی

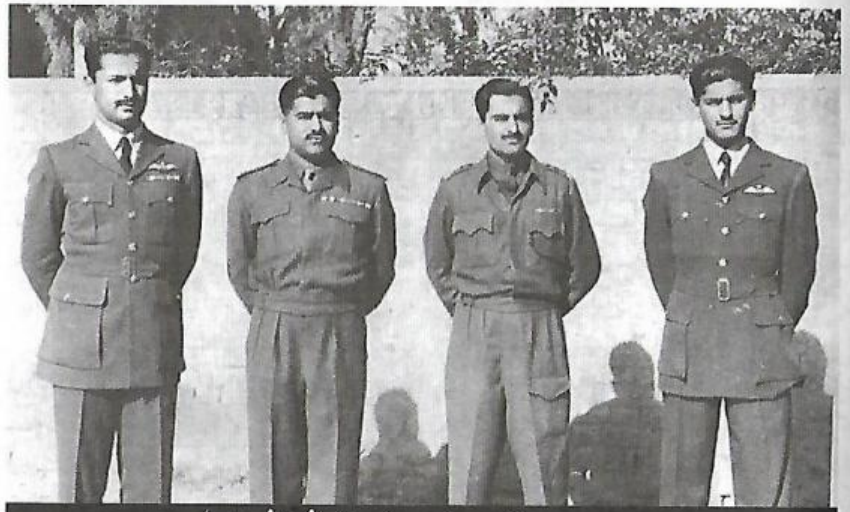

اصغر خان اپنے فوجی بھائیوں کے ساتھ، فخر و خوشی کا عالم

www.urdugem.com

عمر صرف ۳۴ سال تھی۔ نابغۂ روزگار انسان ہی اتنی کم عمری میں اعلیٰ ترین عہدوں پر پہنچ پاتے ہیں۔

اصغر خان اب ایک بااختیار عہدے پر فائز تھے۔ وہ پاک فضائیہ کو ہر لحاظ سے طاقتور بنانے کی بھرپور جدوجہد کرنے لگے۔ انھوں نے سب سے پہلے سمنگلی (نزد کوئٹہ)، پشاور اور سرگودھا میں نئے جنگی اڈے تعمیر کروائے۔ اس کے بعد پاک فضائیہ کے اسکواڈرنوں میں اضافہ کر دیا۔ پہلے صرف ۴ سکواڈرن تھے۔ جب اصغر خان سبکدوش ہوئے تو ان کی تعداد ۹ تک پہنچ چکی تھی۔

سربراہِ پاک فضائیہ نے ان اسکواڈرنوں کو جدید ترین جنگی ولڑاکا طیاروں سے لیس کیا۔ اس دوران سیکسر اور بدین کے علاقوں میں ریڈار اسٹیشن قائم کیے تاکہ دشمن پر کڑی نظر رکھی جاسکے۔ اصغر خان تقسیم ہند کے وقت ہی جان چکے تھے کہ بھارتی حکمران طبقے نے پاکستان کو دل سے تسلیم نہیں کیا۔ لہٰذا مستقبل میں کسی بھی وقت پاک بھارت جنگ ہو سکتی ہے۔ اسی لیے وہ پاک فضائیہ کو بہترین دفاعی قوت کی شکل میں ڈھال دینا چاہتے تھے۔

اصغر خان نے مملکت کے طول وعرض میں پائلٹوں اور دیگر عملے کی تعلیم وتربیت کے لیے ادارے بھی قائم کیے۔ ان میں کمبائٹ کمانڈر اسکول (سرگودھا)، ائیر وار کالج (کراچی) اور ایرو ناٹیکل کمپلیکس شامل ہیں۔ آج اسی کمپلیکس میں جے۔ کے تھنڈر جیسے لڑاکا طیارے بنتے اور زیر استعمال طیاروں کی مرمت ہوتی ہے۔ یہ اصغر خان کی محنت و دوراندیشی کا ثمر ہے کہ آج پاک فضائیہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے تقریباً ہر شعبے میں خود انحصار ہے۔

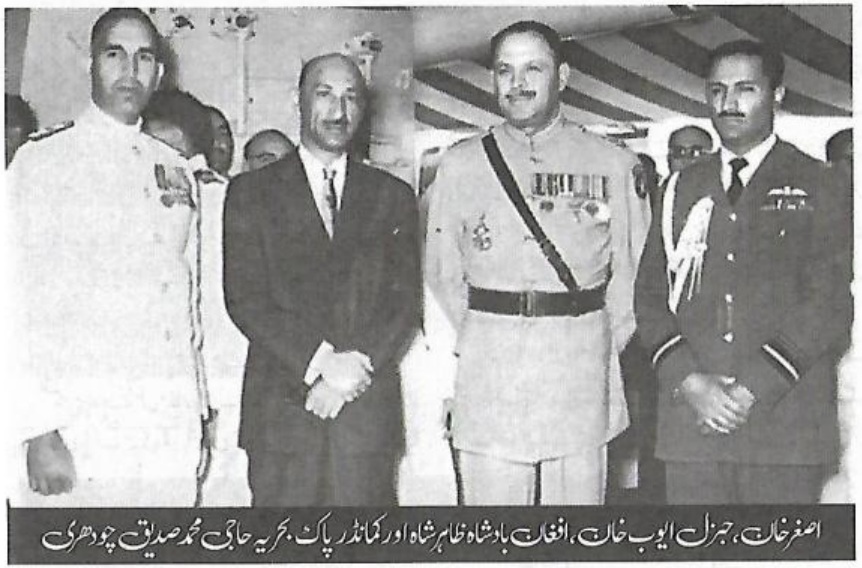
اصغر خان، جنرل ایوب خان، افغان بادشاہ ظاہر شاہ اور کمانڈر پاک بحریہ حاجی محمد صدیق چودھری

سربراہِ پاک فضائیہ بااُصول ہونے کے باعث سخت مزاج بھی تھے۔ اسی لیے ان سے قربت نہ رکھنے والے انھیں مغرور اور آمر سمجھتے مگر حقیقت یہ نہ تھی۔ اصغر خان فرض شناس اور محنتی لوگوں کی بہت مدد کرتے اور ان سے خوش رہتے۔ اگر کوئی جونیئر افسر باصلاحیت ہوتا تو اُسے اعلیٰ عہدے پر فائز

کر دیتے۔ وہ سفارش کو سخت ناپسند کرتے اور اقربا پروری سے تو شدید نفرت تھی۔ اسی چلن کے باعث پاک فضائیہ کے عملے میں اُوپر سے نیچے تک باصلاحیت اور اہل لوگوں کا تقرر کیا گیا۔

ارجن سنگھ کو کامیاب دھمکی

۱۹۶۵ء کے اوائل میں اچانک برصغیر پاک وہند پر جنگ کے بادل منڈلانے لگے۔ ماہ اپریل میں رن آف کچھ کے متنازع علاقے میں بھارتی اور پاکستانی افواج کے مابین جھڑپیں ہونے لگیں۔ اپنی فوج کی مدد کے لیے بھارتی طیارے علاقے میں منڈلانے لگے۔ یہ ایک خطرناک عمل تھا کیونکہ بھارتی طیارے پاک فوج کے مورچوں پر بمباری کر کے شدید جانی ومالی نقصان پہنچا سکتے تھے۔

بھارتی فضائیہ رن آف کچھ کے قریب واقع ریاست گجرات میں ائیر بیس رکھتی تھی۔ جبکہ پاک فضائیہ کی ائیر بیس بہت دور کراچی میں تھی۔ اس لحاظ سے بھارتی فضائیہ کو جھڑپوں میں برتری حاصل تھی۔ اب سوال یہ تھا کہ رن آف کچھ میں پاک فوج کے دستوں کو بھارتی فضائیہ سے کیونکر محفوظ رکھا جائے؟ اس موقع پر اصغر خان نے ایک ایسی چال چلی کہ کمزور ہوتے ہوئے بھی جیت انہی کا مقدر ٹھہری۔

اس وقت ارجن سنگھ بھارتی فضائیہ کا سربراہ تھا۔ وہ ہندوستان کی شاہی فضائیہ میں اصغر خان کا جونیئر ساتھی رہ چکا تھا۔ اصغر خان نے ہاٹ لائن پر اس سے رابطہ کیا اور اسے بتایا ''اگر بھارتی طیارے رن آف کچھ میں دیکھے گئے، تو پاک فضائیہ کے لیے پھر میدان کھلا ہوگا۔'' یعنی مستور الفاظ میں اصغر خان نے ارجن سنگھ کو دھمکی دی کہ پاک فضائیہ پھر بھارت میں کسی بھی جگہ کارروائی کرنے کو آزاد ہوگی۔

اس دھمکی کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ ارجن سنگھ نے اپنے وزیر اعظم شاستری سے مشورہ کیا اور بھارتی طیاروں کو رن آف کچھ سے دور کر دیا۔ اسی طرح علاقے میں تعینات پاک فوج کے دستے بھارتی طیاروں کے حملوں سے محفوظ ہو گئے۔ ان کی حفاظت اصغر خان کی ذہانت وفطانت کا کرشمہ تھی۔

جولائی ۱۹۶۵ء میں اصغر خان پاک فضائیہ سے ریٹائر ہو گئے۔ یہ سبکدوشی بعد ازاں متنازع بن گئی۔ بعض مورخین کا دعویٰ ہے، اصغر خان کو پتا چل گیا تھا کہ عنقریب ایوب خان کی حکومت مقبوضہ کشمیر میں ''آپریشن جبرالٹر'' شروع کرنے والی ہے۔ چونکہ اس آپریشن کے سلسلے میں اصغر خان سے مشورہ نہیں کیا گیا لہٰذا انھوں نے بطور احتجاج استعفیٰ دے دیا۔ بعض مورخ یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ اصغر خان نے صدر ایوب خان کو بتائے بغیر ارجن سنگھ سے رابطہ کر لیا تھا۔ اس لیے صدر ایوب خان ان سے ناراض تھے۔

لیکن اصغر خان کے قریبی ساتھیوں کا کہنا ہے کہ ان کی ریٹائرمنٹ قانونی تقاضا تھا۔ صدر ایوب خان نے تو انھیں پیش کش کی تھی کہ وہ مدت ملازمت میں اضافہ کروالیں، مگر اصغر خان نے اس عمل کو ناپسند کیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ مدت ملازمت میں توسیع سے جونیئر افسروں کی حق تلفی ہوگی لہٰذا انھوں نے ریٹائر ہونے کو ترجیح دی۔

اصغر خان کی سبکدوشی کے صرف دو ماہ بعد پاک بھارت جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ میں پاک فضائیہ کے شاہینوں نے فقید المثال کارنامے دکھائے جو پاکستانی عسکری تاریخ میں تاابدزرّیں حروف سے لکھے جائیں گے۔ اصغر خان کے ہاتھوں پلے بڑھے شاہینوں نے لاہور سے کشمیر تک پھیلے محاذ جنگ پر نام نہاد بھارتی سورماؤں پر ایسے تابڑ توڑ حملے کیے کہ انھیں چھٹی کا دودھ یاد دلا دیا۔ انھوں نے خاص طور پر لاہور پر حملہ آور بھارتی فوج کو تہس نہس کر ڈالا اور ہندو حکمرانوں کا غرور قدموں تلے روند دیا۔ پاک فضائیہ کی حیرت انگیز اور شاندار کامیابیوں کا اہم ترین سبب یہ تھا کہ اصغر خان نے اپنے دور میں اُسے نہایت طاقتور اور مضبوط بنا دیا تھا۔

ریٹائرمنٹ کے بعد اصغر خان جلد ہی قومی ائیر لائن، پی آئی اے کے سربراہ بن گئے۔ یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ ان

www.urdugem.com

کے تب ایوب خان سے تعلقات خوشگوار تھے۔ اب وہ پی آئی اے میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھانے لگے۔ چند سال کے اندر اندر اصغر خان نے پی آئی اے کو ایشیا ہی نہیں دنیا کی بہترین ایئر لائن بنا دیا۔ اس کا شمار پانچ بہترین ایئر لائنوں میں ہونے لگا۔

بین الاقوامی مسافروں کو من پسند خدمات ملیں تو وہ جوق در جوق پی آئی اے کے جہازوں میں سفر کرنے لگے۔ کاروبار میں وسعت آئی تو اصغر خان نے مزید جہاز خریدے اور وہ نئے روٹس پر چلنے لگے۔ منافع کی رقم سے انھوں نے امریکا و یورپ میں شاندار ہوٹل خریدے جو پی آئی اے کو اضافی آمدن دینے لگے۔ غرض اصغر خان نے ایسے حسن تدبر سے پی آئی اے کا انتظام سنبھالا کہ اُسے بہترین قومی ادارہ بنا دیا۔ اصغر خان کا دور پی آئی اے کی تاریخ میں سب سے زیادہ تابناک و روشن کہلاتا ہے۔

میدانِ سیاست میں داخلہ

اسی دوران پاکستان کی سیاسی فضا میں ہلچل ہونے لگی۔ ۱۹۶۸ء کے اواخر تک مختلف وجوہ کی بنا پر پاکستانی عوام ایوب خان حکومت سے اُکتا چکے تھے۔ ایک وجہ یہ ہے کہ صدر ایوب خان اپنے آپ کو عقل کل سمجھنے لگے تھے۔ وہ اپنی غلطیاں بھی تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے۔ چناں چہ رفتہ رفتہ انھیں زوال آنے لگا۔ حتیٰ کہ ایوب خان کے چہیتے وزیر، ذوالفقار علی بھٹو بھی ان کے خلاف ہو گئے۔

ذوالفقار علی بھٹو ایک پُرجوش نوجوان تھے۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ ترقی کی راہ پر سفر کرتے ہوئے وہ ناجائز ذرائع استعمال کرنے سے بھی نہ چوکتے۔ صدر اسکندر مرزا انھیں اقتدار کے ایوانوں میں لائے تھے۔ یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ بھٹو نے اپنے ایک خط میں اسکندر مرزا کو قائداعظم سے بھی بڑا لیڈر قرار دے رکھا ہے۔ ایوب خان کی بھی خوشامد کر کے وہ وزیر خارجہ بن بیٹھے۔ طاقت ور سوخ پاکران کی جیسی بھی صلاحیتیں تھیں، وہ چمک گئیں۔

اصغر خان جنگ ستمبر کو ایک خطرناک کھیل سمجھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ایوب خان، بھٹو اور عزیز احمد نے مل کر یہ خطرناک کھیل کھیلا۔ اگر خدانخواستہ بھارتی فوج مغربی پاکستان پر قبضہ کر لیتی، تو دنیا کے نقشے سے وطن عزیز کا وجود مٹ سکتا تھا۔ اسی لیے وہ بھٹو کو اقتدار کا بھوکا اور طالع آزما سمجھتے۔

جنگِ ستمبر ۱۹۶۵ء شروع ہوئی تو اصغر خان نے چین، ایران، انڈونیشیا اور دیگر اسلامی ممالک کے دورے کیے تھے تاکہ پاکستان کے لیے حمایت حاصل کر سکیں۔ وہ اپنی انگریزی کتاب ''دی فرسٹ راؤنڈ'' میں رقم طراز ہیں:

ذوالفقار علی بھٹو ۱۹۶۷ء میں جب پی پی پی کی بنیاد رکھی گئی

''چین کے وزیراعظم چواین لائی نے پاکستان کو اسلحہ دینے کی ہامی بھر لی۔ وہ براہِ راست پاکستان کو چینی اسلحہ بھجوانا چاہتے تھے مگر ایوب خان نے ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ ایوب خان کو خطرہ تھا کہ چینی اسلحہ لینے سے امریکی حکمران ناراض ہو جائیں گے۔

''اُدھر چواین لائی پاکستان کی سالمیت کے لیے بہت

بقیہ صفحہ نمبر ۱۹۳ پر

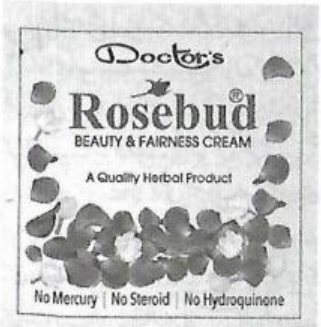

ایکنی، کیل، مہاسے، چھائیاں، جھریاں اور سیاہ حلقے دور کرتی ہے۔ شوگر کے مریضوں کے پاؤں کی درد، جلن، اکڑاؤ۔ مختلف ایگزیما اور پوسٹ ہرپز زوسٹر کا یقینی علاج

Doctor's
Unpasteurized, Unfiltered & Living
Natural
APPLE CIDER VINEGAR
With the Mother
100% خالص
روزبڈ شیمپو
DOCTOR'S ROSEBUD CREAM

ایپل سائیڈر ونیگر، بادام ناریل اور گلاب سے بنا منفرد شیمپو
بال گرنے، بند، خشکی، سکری ختم، بال لمبے گھنے
اور مضبوط، سر کی جوؤں کا خاتمہ

ڈاکٹر اصغر علی (ایم بی بی ایس)

''میں نے ڈاکٹر اصغر علی کی تیار کردہ مصنوعات خصوصاً شیمپو کو بہت مفید پایا ہے۔ اب میرا پورا خاندان یہ شیمپو استعمال کرتا ہے۔ میں اپنے حلقۂ احباب میں بھی اس کا تعارف کرواتا اور انھیں استعمال کرنے کا کہتا ہوں۔ یہ شیمپو خواتین کے بالوں کی کئی بیماریوں کا علاج ہے''۔ ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی (اُردو ڈائجسٹ)

ڈاکٹر'ز ایپل سائیڈر ونیگر

وزن کم کرتا ہے۔ کولیسٹرول کنٹرول کرتا ہے۔ جگر اور پیٹ کے بہت سارے امراض کا حل ہے۔ فالتو چربی ختم کرتا اور اسمارٹ بناتا ہے۔ ڈاکٹر'ز ایپل سائیڈر ونیگر سو فیصد خالص Unpasturised, unfiltered,living and the Mother ہے۔ جو پاکستان کے بہت سارے شہروں میں استعمال ہو رہا ہے اور لوگ مثبت رائے کا اظہار کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر'ز روز بڈ کریم

ڈاکٹر'ز روز بڈ کریم میں شامل گلاب، بادام روغن، ناریل کا تیل، ایپل سائیڈر ونیگر اور قیمتی جڑی بوٹیاں خشک اور سرد موسم میں چہرے کی حفاظت کر کے چہرے کو گلاب کی طرح شاداب، تر و تازہ، دلکش اور جاذبِ نظر بنا کر رنگ بھی گورا کرتی ہے۔

آئیے ہم آپ کو اسمارٹ، صحت منداور توانا بنائیں

موٹاپے میں مبتلا افراد بڑی آسانی سے شوگر، بلڈ پریشر اور دل کے امراض کے شکار ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ صحت مند زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو قدرتی طریقۂ علاج سے مثلاً ڈاکٹر'ز ٹانک، خوراک کنٹرول اور مناسب ورزش سے وزن کم، پیٹ چھوٹا، صحتمند، اسمارٹ، توانا، شوگر، بلڈ پریشر اور دل کے امراض سے بغیر کسی سائیڈ ایفیکٹ کے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ کئی مریضوں کو دوائی کی بھی ضرورت نہیں رہتی اور وہ دوبارہ آئیڈیل صحت مند زندگی گزارتے ہیں۔

اتوار کے علاوہ شام چھ بجے سے رات آٹھ بجے تک اطلاع دے کر تشریف لا سکتے ہیں۔

برائے مشورہ: ڈاکٹر اصغر علی (ایم بی بی ایس)
کلینک: P-62 مرغزار کالونی ملتان روڈ لاہور
0321-8823321, 0336-4167960
doctor health and beauty clinic
Doctor Rosebud Shampoo
برائے رابطہ: حافظ مبشر علی 0321-9785644
www.doctorsons.org
پاکستان بھر سے ڈسٹری بیوٹر درکار ہیں
رابطہ نمبر برائے کراچی، حیدر آباد۔ 0321-2075111

www.urdugem.com

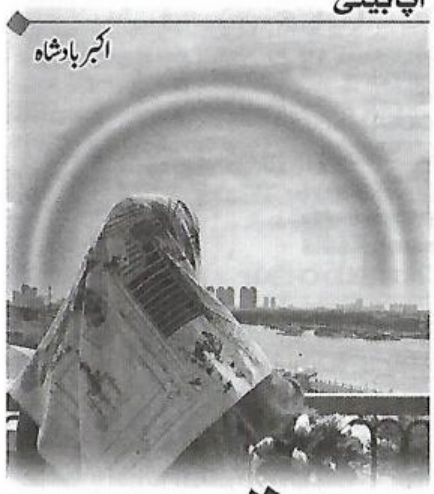

قوسِ قزح

سہانے سپنے آنکھوں میں سجا لینے والی ایک عورت کی غم ناک کتھا

میرا نام مریم ہے۔ میری عمر اس وقت ۷۳ سال کے لگ بھگ ہے۔ میرے میاں سہیل احمد کو وفات پائے تقریباً چار سال بیت چکے۔ میرا ایک ہی شادی شدہ بیٹا ہے۔ میں اسی کے ساتھ ایک پُرآسائش گھر میں رہائش پزیر ہوں۔ زندگی کی ہر سہولت اور خوشی میسر ہے۔ بہو نہایت فرمانبردار اور سلیقہ شعار ہے۔ دو چھوٹے چھوٹے پیارے پیارے بچے، تین سالہ احمد اور دو سالہ زینب گھر کو چار چاند لگائے رکھتے ہیں۔ ہمارے ان پانچ افراد پر مشتمل گھرانے میں ہر سو پیار و محبت کی کلیاں اور رنگے برنگے پھول مہکتے ہیں۔

یہ ساون کی ایک شام کا قصہ ہے۔ جب خوب بارش برسنے کے بعد میرے پوتے اور پوتی نے اصرار کیا کہ میں اُن کے ساتھ چھت پر چلوں۔ بڑھاپے کی وجہ سے میں بہت کم ہی چھت پر جاتی ہوں لیکن بچوں کی ضد کے سامنے مجھے ہار ماننا پڑی اور دیوار کا سہارا لیتے چھت پر جا پہنچی۔

بچے تو وہاں اِدھر اُدھر بھاگنے اور کھیلنے میں مصروف ہو گئے لیکن میں ٹھنڈی ہوا اور دور دور نظر آتے سرسبز لہلہاتے سبزے کو دیکھ کر لطف اندوز ہونے لگی۔ اچانک بچوں کی آواز آئی ”اُدھر دیکھیں دادی اماں! وہ کیا ہے؟“ میں نے پلٹ کر دیکھا تو آسمان پر قوس قزح اپنے بازو پھیلائے کھڑی تھی۔ میں بچوں کو بتانے لگی کہ بارش کے بعد نظر آنے والے ان سات رنگوں کو قوس قزح کہتے ہیں۔ بچے تو پھر قوس قزح کی طرف دیکھتے ہوئے اٹھکیلیاں کرنے لگے لیکن میں کہیں اور ہی پہنچ چکی تھی۔

جب میں نے ہوش سنبھالا تھا تو خود کو ایک چھوٹے سے گاؤں کے ایک اوسط درجے کے گھر میں پایا تھا۔ میں اپنے ماں باپ کی واحد لاڈلی بیٹی تھی۔ ابا جان کی شہر میں گارمنٹس کی دکان تھی۔ اس وجہ سے وہ صبح ہوتے ہی شہر روانہ ہو جاتے اور رات گئے لوٹتے۔ میں امی جان کے ساتھ تنہا گھر پر ہوتی۔ امی جان جب گھر کے کام کاج میں مصروف ہو جاتیں تو مجھے خالہ سعدیہ کے گھر بھیج دیتیں۔

خالہ سعدیہ کے گھر والے ہمارے ہمسائے تھے۔ ہمارے اُن کے ساتھ بہت اچھے مراسم تھے۔ خالہ سعدیہ کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔ ہم بچپن میں سارا دن اکٹھے کھیلتے کودتے گزار دیتے۔ یونہی سال گزرتے گئے اور میں نے میٹرک پاس کر لیا۔ خالہ سعدیہ کا بیٹا عمیر جو مجھ سے دو سال بڑا تھا، اب ایف ایس سی پاس کر کے میڈیکل کالج میں داخلہ لینا چاہتا تھا۔

عمیر اکلوتا بیٹا ہونے کی وجہ سے اپنی بہنوں اور والدین کا لاڈلا اور آنکھ کا تارا تھا۔ آخر وہ لڑکا تھا بھی شریف اور قابل رشک۔ میں نے اپنا سارا بچپن اُس کے ساتھ گزارا تھا جس کی وجہ سے دل ہی دل میں کچھ الفت پیدا ہو گئی تھی۔ جب کبھی عمیر اپنے ننھیال جاتا میں بڑی بے چینی محسوس کرتی اور اُس کے واپس آنے کا انتظار کرتی۔ میں کیا جانتی تھی کہ یہ تعلق کیا ہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اور کچھ سمجھ بوجھ آنے کے بعد احساس ہوا کہ ایسے ہی تعلق کو محبت کہتے ہیں۔

اب جب عمیر میڈیکل کالج میں داخلہ لینے کی غرض سے کراچی جا رہا تھا تو یہ وقت میرے لیے بے حد کڑا اور پریشان کُن تھا۔ جانے کیسے کیسے خیالات اور وسوسے میرے دل میں ہلچل مچائے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی مجھے عمیر کے رویے سے لگتا شاید وہ بھی مجھے چاہتا ہے۔ لیکن نہ تو میں نے آج تک اظہارِ محبت کیا تھا نہ ہی اُس نے۔ اب لڑکپن سے جوانی میں قدم رکھنے کی وجہ سے ہمارا ساتھ کھیلنا اور رہنا تو ناممکن تھا لیکن مجھے کبھی کبھی عمیر کی ادائیں بہت بے چین کر جاتیں۔

بچے تو ماں باپ کے جگر کا ٹکڑا ہوتے ہیں۔ وہ اُن کے چہرے اچھی طرح پڑھ سکتے ہیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ خالہ سعدیہ نے اپنے بیٹے کا من جان لیا۔ عمیر سے بات کرنے کے بعد انھوں نے میری امی سے بات کی۔ امی جان نے مجھ سے میری مرضی جاننی چاہی۔ میں، جو مدتوں سے اس کی منتظر تھی بھلا کیسے اس رشتے کو ٹھکرا سکتی تھی۔ بس بات پکی ہو گئی اور میرے دل کو بھی کچھ چین آ گیا۔ اسی اثنا عمیر کراچی روانہ ہو گیا اور میں نے پرائیویٹ طور پر ایف اے کی تیاری شروع کر دی۔

دو سال پلک جھپکنے میں گزر گئے۔ میرا ایف اے مکمل ہو گیا۔ ایک دن ساون میں بادل خوب برسے اور میں موسم سے لطف اندوز ہونے چھت پر چڑھ گئی۔ بارش رک چکی تھی اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں قوس قزح آسمان کے جنوب کی طرف نمودار ہوئی۔ میں اُس کی طرف دیکھتی اپنی اور عمیر کی آنے والی مثالی زندگی کی سوچوں میں غرق تھی۔ میرے خواب تھے کہ مجھے کہاں کہاں لیے پھرتے اور ان دنوں یہی میری مصروفیت تھی۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ ممکنہ مستقبل کے پیشِ نظر بڑے بڑے خواب اپنی آنکھوں میں سجا لیتا ہے۔

میں انہی سوچوں میں محو تھی کہ مجھے احساس ہوا شاید کہیں سے رونے اور چلانے کی آواز آ رہی ہے۔ تھوڑا سا غور کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ آوازیں تو خالہ سعدیہ کے گھر سے آ رہی ہیں۔ میرا دل ایک دم ساکت ہو گیا۔ میں طرح طرح کے وسوسوں میں گم نیچے بھاگی تو دیکھا امی جان باہر سے گھر میں داخل ہو رہی ہیں۔ آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں تقریباً روتے ہوئے بولیں۔ ”مریم! تمھیں خبر ہے کہ کیا ہو گیا۔ عمیر ہم سب کو چھوڑ گیا ہے“۔ یہ الفاظ سننے کی دیر تھی کہ میرے ہوش تقریباً جا چکے تھے۔ وہ شاید کچھ اور بھی کہہ رہی تھیں لیکن میں نہ سمجھ سکی۔

طویل عرصے بعد اس غم سے خود کو سنبھالا تو معلوم ہوا کہ عمیر کراچی میں کسی دندناتی گولی کا شکار ہوا ہے۔ میری زندگی تو جیتے جی چھن چکی تھی۔ یونہی چار ماہ گزر گئے لیکن میرے حالات معمول پر نہ آ سکے۔ آخر ہر چیز پر عمیر کے نقش اور یادیں مجھے بے چین رکھنے کے لیے کافی تھیں۔

تب ابا جان نے ایک بڑا فیصلہ کیا اور گاؤں میں جگہ بیچ کر شہر میں کرایے کا مکان لیا اور اپنے کاروبار کو وسعت دی۔ مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی ایک پرائیویٹ اسکول میں پڑھانا پڑا۔ وقت گزرتا گیا۔ شہر کی رونقوں میں مَیں اپنا ماضی بھول گئی۔ پھر میری شادی بزنس مین سہیل احمد سے ہو گئی اور زندگی بھرپور گزرنے لگی۔ آج ۷۳ سال کی عمر میں ۵۳ سال بعد ایک قوس قزح مجھے یہ احساس دلا گئی کہ محبت کبھی مرتی نہیں۔ یہ دل میں موجود رہتی اور کبھی کبھار اپنے ہونے کا احساس دلا جاتی ہے۔

◆◆◆

www.urdugem.com

سید عاصم محمود

ٹرمپ کی ماں نے کہا

"میں نے کیسا بیٹا پیدا کردیا!"

بدنام زمانہ ٹرمپ کی شرمناک سرگرمیاں افشا کرتی تہلکہ خیز کتاب

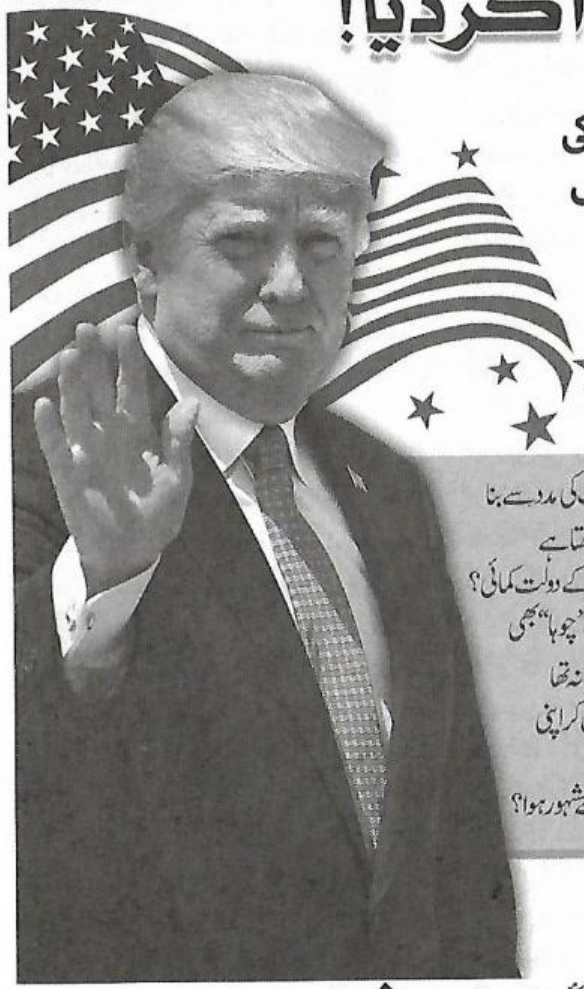

- مسلمانوں پر پابندی کا قانون انٹرنیٹ کی مدد سے بنا
- امریکی صدر بیک وقت تین ٹی وی دیکھتا ہے
- ٹرمپ کے دادا نے کیا گھٹیا کاروبار کر کے دولت کمائی؟
- ایف بی آئی کا سربراہ "شوباز" ہے اور "چوہا" بھی
- ٹرمپ کے کسی ساتھی کو جیت کا یقین نہ تھا
- باپ نے سرکاری خزانے پر ڈاکا ڈال کر اپنی تجوریاں بھریں
- وائٹ ہاؤس میں ٹرمپ کن ناموں سے مشہور ہوا؟

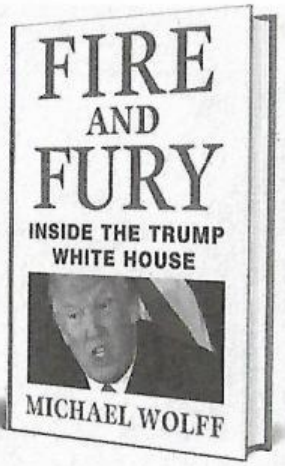

یہ جون ۲۰۱۵ء کی بات ہے جب امریکی سرمایہ دار ڈونلڈ ٹرمپ نے صدارتی الیکشن لڑنے کا اعلان کیا۔ ٹرمپ اور اس کے باپ دادا نے رئیل اسٹیٹ میں کاروبار کر کے دولت کمائی۔ وہ ایک عیاش، منہ پھٹ اور مکار آدمی کی حیثیت سے امریکا میں مشہور ہوئے۔ بیرون دنیا ٹرمپ کو متعصب سفید فام کی حیثیت سے جانا گیا۔

ٹرمپ کی کامیابی کا امکان بظاہر کم تھا مگر اس نے ایک عیارانہ کھیل کھیلا اور کروڑوں سفید فام امریکیوں کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ کھیل یہ تھا کہ وہ انتخابی مہم کے آغاز ہی میں غیر ملکیوں خصوصاً مسلمانوں پر حملے کرنے لگا۔ مطالبہ کیا کہ مسلمانوں کے امریکا داخلے پر پابندی لگائی جائے۔ اسلام کو متشدد مذہب قرار دیا۔ یہ کیا کہ امریکی سرمایہ داروں کو اپنے وطن میں فیکٹریاں لگانی چاہئیں۔ جن سے تجارت کم کرنے پر زور دیا۔ غرض وہ قوم پرست سفید فام امریکیوں کے عیاں و خفیہ جذبات کا ترجمان بن گیا۔

استاد گرامی، ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی صاحب کا یہ تجزیہ بڑی حد تک درست ہے کہ انگریز (بشمول یورپی) انفرادی

مائیکل وولف، فائر اینڈ فیوری کا مصنف

طور پر تو مہذب، قانون پسند اور با اصول ہے۔ مگر جب قومی مفادات پورے کرنے کا موقع آئے، تو گورے اخلاقیات اور اصول و قوانین پامال کر دیتے ہیں۔ پچھلے پچاس برس سے امریکی حکمران طبقے کا قول و فعل اس امر کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

امریکا بہرحال سبھی ممالک کی طرح اچھائیوں اور برائیوں کا مجموعہ ہے۔ امریکا کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہاں پریس یا میڈیا آزاد ہے اور ٹرمپ جیسا تنگ نظر اور آمرانہ فطرت رکھنے والا لیڈر بھی اس پابندیاں نہیں لگا سکتا۔ البتہ انتخابی مہم کے آغاز سے امریکی میڈیا اس کے خلاف مسلسل تحریریں چھاپ رہا ہے۔ ٹرمپ اپنے اُوپر ہونے والے میڈیائی حملوں کو جعلی خبریں (Fake News) قرار دے کر مسترد کر دیتا ہے۔

نئے سال کے آغاز میں نیویارک سے تعلق رکھنے والے ایک امریکی صحافی، مائیکل وولف کی کتاب "فائر اینڈ فیوری" (Fire and Fury) نے پوری دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ اس کتاب نے امریکی صدر، ڈونلڈ ٹرمپ کی نجی و عوامی زندگی کے ڈھکے چھپے گوشے آشکارا کیے اور یہ بھی بتایا کہ وائٹ ہاؤس میں کیونکر سرکاری کام انجام پا رہے ہیں۔

www.urdugem.com

اکلوتی سپر پاور کا حکمران ہونے کے ناتے امریکی صدر دنیا میں سب سے طاقتور شخصیت مانا جاتا ہے۔ وہ قوی ترین فوج کا بھی سپریم کمانڈر ہے۔ اسی لیے جو شخص بھی امریکی صدر بنے، وہ دنیا بھر میں جانی پہچانی ہستی بن جاتا ہے۔ اس کی اچھائیاں، برائیاں اور کارنامے وغلطیاں سبھی کی نظروں میں رہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے ''فائیر اینڈ فیوری'' کتاب راتوں رات میڈیا کی وساطت سے امریکا ہی نہیں پورے کرّہ ارض میں مشہور ہوگئی۔

اگرچہ کتاب نے بنیادی طور پر ڈونلڈ ٹرمپ کے باعث ہی عالمی شہرت پائی۔ امریکا میں اب تک ۴۵ اصحاب صدر بننے کا اعزاز حاصل کر چکے۔ لیکن ۱۷۹۸ء سے لے کر تا حال امریکی صدور کی سوا دو سالہ تاریخ میں ٹرمپ جیسا متنازع اور عجیب وغریب صدر شاید ہی گزرا ہو۔

مائیکل وولف جانا مانا کالم نگار ہے۔ اس کے کالم نیویارک ٹائمز، یو ایس ٹوڈے اور ونیٹی وئیر جیسے موقر امریکی اخبارات میں شائع ہو چکے۔ نیویارک کا باسی ہونے کے ناتے وہ صدر ٹرمپ کا پرانا واقف کار ہے۔ یہی وجہ ہے، موصوف کی انتخابی الیکشن کے دوران وولف نے ٹرمپ کے کئی انٹرویو کیے تھے۔

جب ٹرمپ حیرت انگیز طور پر الیکشن جیت گیا، تو وولف وائٹ ہاؤس میں بھی آنے جانے لگا۔ اس نے ٹرمپ کے علاوہ اس کے قریبی ساتھیوں سے بھی نشستیں کیں۔ ان میں مشہور قوم پرست اور انتہا پرور سفید فام دانشور، سٹیو بینن نمایاں تھا۔

درج بالا حقائق سے عیاں ہے کہ مائیکل وولف کوئی معمولی صحافی وقلم کار نہیں بلکہ اُسے ٹرمپ کے اندرونی حلقے تک رسائی حاصل تھی۔ گویا یہ یقینی ہے کہ اس کی کتاب کے مندرجات سو فیصد نہیں تو کم از کم پچھتر تا اسّی فیصد تک ضرور

بہت سے امریکی اپنے صدر کو مسخرا سمجھتے ہیں

درست ہوں گے۔ اسی لیے امریکی صحافیوں اور دانش وروں کی اکثریت نے ''فائیر اینڈ فیوری'' کتاب کو خاصی حد تک مستند قرار دیا۔

ماضی پہ ایک نظر

کتاب کے انکشافات بیان کرنے سے قبل ڈونلڈ ٹرمپ کی شخصیت وکردار پر کچھ بات ہو جائے۔ ماہرین نفسیات کہتے ہیں کہ ایک انسان کا کردار وشخصیت بنانے میں والدین کی تربیت وراہنمائی اور گھریلو ماحول بڑا اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اگر بچے کو نیک وراست باز والدین میسر آجائیں تو وہ بالغ ہو کر گویا مفید شہری بنتا ہے۔ لیکن اُسے بدقسمتی سے کرپٹ اور لالچی والدین مل جائیں، تو وہ بالغ ہو کر برائیوں میں ہی لت پت رہتا ہے۔ اس قدرتی عمل کی ایک زندہ مثال ڈونلڈ ٹرمپ ہے۔

یہ ہم نہیں کہتے، بلکہ امریکا میں علم نفسیات وعمرانیات کے نامی گرامی ماہرین صدر ٹرمپ کو پاگل ''نفسیاتی مریض'' اور ''مسخرا'' کے القابات سے نواز چکے۔ یہ تو قوم پرست اور متعصب سفید فاموں کے ووٹوں نے ٹرمپ کو کرسی اقتدار

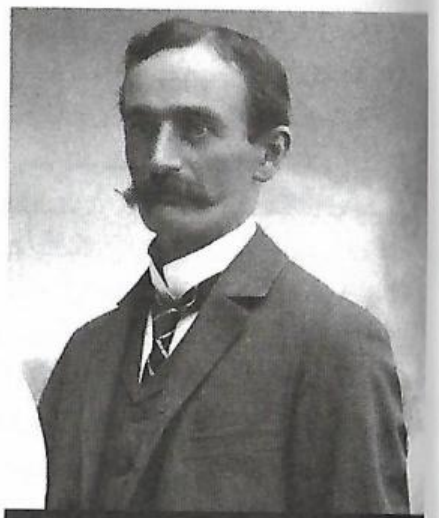

ٹرمپ کا دادا جو امریکا میں گھٹیا کام کرتا رہا

پر بٹھا دیا ورنہ اخلاقی لحاظ سے امریکی میڈیا میں اس کی جتنی مٹی پلید ہو چکی، تاریخ انساں میں شاید ہی کسی اور حکمران کی ہوئی ہو۔

امریکی ماہرین ہی بتاتے ہیں کہ صدر ٹرمپ کی کج سرشت نے دراصل گھریلو ماحول میں جنم لیا۔ اس انوکھے عمل کی داستان انسانی نفسیات کے پُرپیچ اسرار ہمارے سامنے لاتی اور بتاتی ہے کہ خیر وشر کا مجموعہ..... اشرف المخلوقات کہلانے والا انسان بتدریج برائی کی جانب کیونکر جھک جاتا ہے۔

اس ڈرامائی داستان کا آغاز ۱۸۸۵ء میں ہوتا ہے جب صدر ٹرمپ کا دادا فریڈرک ٹرمپ سولہ سال کی عمر میں جرمنی سے امریکا بھاگ آیا۔ اس کا تعلق ایک غریب کسان گھرانے سے تھا۔ وہ لازمی فوجی تربیت کے قانون سے بچنے کی خاطر جرمنی سے فرار ہوا۔ ایک رات اس نے بیوہ ماں کے نام پیغام چھوڑا اور ملے بغیر امریکا چلا گیا۔

فریڈرک ٹرمپ نے حجام کا کام سیکھ رکھا تھا۔ وہ چھ برس تک لوگوں کی حجامتیں بناتا رہا مگر حق حلال کی کمائی اُسے راس نہ آئی۔ وہ ایک لالچی انسان تھا۔ راتوں رات وہ امیر ہو جانے کے سپنے دیکھتا رہتا۔ چنانچہ وہ ۱۸۹۱ء میں امریکی شہر، سیتل پہنچا اور وہاں کے ریڈ لائٹ ایریا میں اپنی جمع پونجی سے ایک ہوٹل کھول لیا۔ یہ دراصل ایک چکلہ تھا جہاں جوا کھیلا جاتا اور شراب نوشی بھی کھلے عام ہوتی۔

۱۸۹۴ء میں فریڈرک مونٹی کرسٹو نامی علاقے چلا گیا جہاں سے لوگ سونے چاندی کی تلاش میں کانیں کھود رہے تھے۔ عیار ومکار فرنیک نے مقامی بلدیہ کے افسروں کو منہ مانگی رشوت دے کر ایک پلاٹ پر قبضہ کیا اور وہاں ہوٹل بنا لیا۔ یہ پلاٹ نکولاس ایڈیک نامی ایک غریب آدمی کا تھا۔ کمزور ہونے کے باعث وہ امیر فریڈرک کا مقابلہ نہیں کر سکا۔

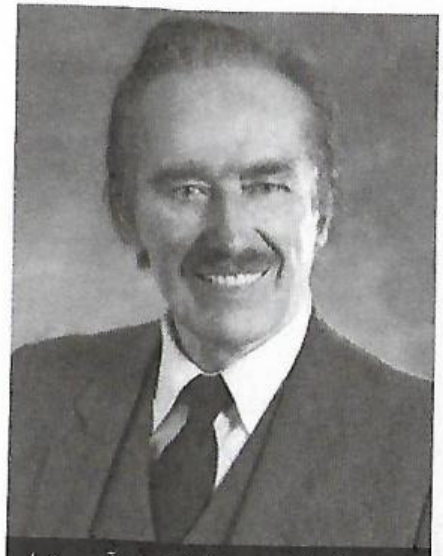

ٹرمپ کا والد، سر تا پا کرپٹ آدمی تھا

www.urdugem.com

امریکی صدر کی ماں جو بیٹے سے اخیر عمر میں ناخوش رہی

موت کے بعد فریڈ نے ایک تعمیراتی کمپنی کھولی اور گھر بنا کر فروخت کرنے لگا۔ اپنے باپ کی طرح وہ بھی عیار و لالچی انسان تھا۔ اس نے رشوتیں اور تحائف دے کر جائیدادوں کی خرید و فروخت سے متعلق سرکاری محکموں میں اعلیٰ افسر دوست بنا لیے۔ انہی افسروں کی نوازشات سے وہ ترقی کی منازل طے کرنے لگا۔

امریکی افسر شاہی سے تعلقات کے باعث ہی فریڈ کو دوسری جنگ عظیم کے دوران فوجیوں کے لیے اپارٹمنٹ تعمیر کرنے کے سرکاری ٹھیکے مل گئے۔ فریڈ اس نظریے کا قائل تھا: ''دولت کمانے کے لیے ہر عمل جائز ہے۔'' چنانچہ کرپٹ سرکاری افسروں کی ملی بھگت سے اس نے سرکاری فنڈز جی بھر کر لوٹے اور ہر اپارٹمنٹ کی تعمیر پر زیادہ لاگت دکھائی۔ یہ کرپشن کرنے پر ۱۹۵۴ء میں امریکی سینٹ کی ایک کمیٹی نے فریڈ کو پوچھ گچھ کے لیے بلایا مگر وہ اپنی مکاری کے باعث قانون کی گرفت سے بچ نکلا۔

فریڈ ٹرمپ ایک متعصب آدمی تھا۔ وہ سیاہ فام امریکیوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا اور انہیں حیوان سمجھتا تھا۔ وہ نوجوانی میں قوم پرست سفید فلموں کی تنظیم کوکس کلین کا رکن بھی رہا۔ فریڈ نے اپنی زندگی میں ''ستائیس ہزار'' فلیٹ و چکلے چلانے اور جوئے کھلانے کے دھندے سے ۱۹۰۱ء تک فریڈرک کو اچھا خاصا امیر بنا دیا۔ اسی سال وہ جرمنی گیا اور اپنی غریب پڑوسن ایلزبتھ سے بیاہ رچا لیا۔ جب جرمن حکومت کو معلوم ہوا کہ لازمی فوجی تربیت کے قانون کا بھگوڑا جرمنی واپس آچکا، تو اس نے فریڈرک کو جلاوطن کر دیا۔

کرپٹ باپ کی داستان

فریڈرک بیگم سمیت نیویارک چلا آیا۔ وہاں اس نے ایک دو منزلہ عمارت خریدی جس میں سات کمرے تھے۔ دو کمروں میں خود رہائش رکھی اور بقیہ کرایے پر چڑھا دیے۔ وہ خود ایک ہوٹل میں منیجر کی حیثیت سے کام کرنے لگا اور ۱۹۱۸ء میں ایک وبا کا نشانہ بن کر چل بسا۔

اس نے اپنے بڑے بیٹے اور صدر ٹرمپ کے باپ، فریڈ ٹرمپ کو بڑھئی کا کام سکھایا تھا۔ باپ کی

امریکی صدر اپنے باپ کے ساتھ

اپارٹمنٹ تعمیر کروائے۔ وہ اپنے فلیٹ صرف سفید فاموں کو کرایے پر دیتا تھا۔

سرکاری فنڈز میں خرد برد ہی نے فریڈ کو دولت مند بنایا۔ اس نے محنت و ذہانت سے دولت نہیں کمائی بلکہ یہ اس کی کرپشن اور دھوکہ بازی کا کمال ہے۔ حرام کے پیسوں سے ہی اس نے اپنی تعمیراتی کمپنی کی بنیاد رکھی اور کرپشن کے باعث نیویارک کا بڑا ٹھیکے دار بن گیا۔

۱۹۳۶ء میں فریڈ نے ایک خوبصورت مگر غریب برطانوی لڑکی، میری این سے شادی کر لی تھی۔ میری ۱۹۱۲ء میں سکاٹ لینڈ کے ٹونگ نامی گاؤں میں پیدا ہوئی جو ایک جزیرے پر واقع ہے۔ اس کا باپ مچھلیاں پکڑ کر گزر بسر کرتا تھا۔ میری کے نو بہن بھائی تھے۔ باپ کی کمائی بس اتنی تھی کہ اہل خانہ کو دو وقت کی روٹی مل جائے۔ میری کے ابتدائی اٹھارہ برس غربت کی آغوش میں بسر ہوئے۔

۱۹۲۵ء میں میری این کی ایک بڑی بہن مقامی لڑکے سے ناجائز تعلقات کے باعث حاملہ ہو گئی۔ اس زمانے میں برطانیہ میں شرم و حیا کی کچھ اقدار موجود تھیں۔ اس لیے بیٹی کے غلط کام نے والدین کو شرمندگی کے مارے منہ چھپانے پر مجبور کر دیا۔ انہوں نے اپنی عزت بچانے کی خاطر بیٹی کو امریکا بھجوا ڈالا۔ وہ وہاں بطور ملازمہ گھروں میں کام کاج کرنے لگی۔

۱۹۳۰ء میں بڑی بہن نے میری این کو بھی نیویارک بلوا لیا۔ ٹونگ میں معاشی حالات بہت خراب تھے۔ جبکہ بیٹی اب امریکا سے ماں باپ کو کثیر رقم بھجوانے لگی تھی۔ والدین نے یہ سوچ کر میری کو بھی امریکا بھجوا دیا کہ شاید اس کی قسمت سنور جائے۔

نیویارک میں چھ برس تک این مختلف گھروں میں ''ماسی'' کی حیثیت سے کام کرتی رہی۔ ایک تقریب میں

ٹرمپ اپنے بڑے بھائی اور دوسرے بھائی و بہنوں کے ساتھ

www.urdugem.com

فریڈ کی ملاقات این سے ہوئی۔ اُسے یہ معصوم اور سادہ لڑکی بہت پسند آئی۔ تب تک فریڈ ایک امیر ٹھیکے دار بن چکا تھا۔ لہٰذا غریب این کو شاید یہی مناسب لگا کہ وہ اس سے شادی کر کے امریکا میں اپنا مستقبل محفوظ بنا لے۔

ٹرمپ کی آمد

فریڈ اور این کے ہاں پانچ بچے تولد ہوئے۔ ڈونلڈ ٹرمپ ان کی چوتھی اولاد اور دوسرا بیٹا ہے۔ موصوف بچپن ہی سے تیز و طرار اور جھگڑالو تھا۔ جبکہ بڑا بیٹا، فریڈرک ٹرمپ جونیئر ایک نرم مزاج لڑکا تھا۔ وہ روپے پیسے کے معاملات میں بھی کم ہی دخل دیتا۔ یہی وجہ ہے، وہ کچھ عرصہ ہی باپ کی تعمیراتی کمپنی میں کام کرتا رہا۔ پھر وہ پائلٹ بن گیا۔

ڈونلڈ ٹرمپ کا دعویٰ ہے کہ اس کا بڑا بھائی عادی شراب خور تھا۔ شراب نوشی کے باعث ہی وہ ۱۹۸۱ء میں چل بسا۔ اس کے دو بچے تھے: ایک لڑکا ایک لڑکی۔ حیران کن بات یہ ہے کہ ان کے دادا نے اپنی جائیداد میں سے اپنے اس پوتے پوتی کے لیے ایک دمڑی تک نہیں چھوڑی۔ جبکہ اپنی وصیت میں وہ دیگر پوتے پوتیوں کو لاکھوں ڈالر دے گیا تھا۔

بعض امریکی صحافیوں کا دعویٰ ہے کہ اخیر عمر میں ڈونلڈ ٹرمپ کا باپ نسیان کے مرض میں مبتلا ہو گیا تھا۔ چناں چہ ایک دن ٹرمپ نے موقع پا کر نئی وصیت لکھی اور اس پر اپنے باپ کے چیکے سے دستخط کروا لیے۔ موصوف نے فراڈ یہ کیا کہ اپنے متوفی سگے بھائی کے بچوں کو باپ کی جائیداد میں حصے دار بننے سے محروم کر دیا۔ ڈونلڈ ٹرمپ کی فطرت و سرشت دیکھتے ہوئے یہ دعویٰ برحق لگتا ہے۔

ڈونلڈ ٹرمپ کے گھر میں باپ ہر جگہ چھایا ہوا تھا۔ گھر میں صرف اسی کا حکم چلتا۔ ماں کا وجود نہ ہونے کے برابر تھا۔ میری این شوہر کے گھر آ کر بھی ماسی ہی بنی رہی۔ اس کا بنیادی کام کھانا پکانا، کپڑے دھونا اور بچوں کی پرورش کرنا تھا۔

قبل ازیں بتایا گیا کہ فریڈ ٹرمپ تمام بچوں میں ڈونلڈ کو سب سے زیادہ پسند کرتا تھا۔ وجہ یہ کہ وہ بڑا چالاک و ہوشیار تھا۔ چناں چہ باپ اُسے اپنے ساتھ دفتر لے جانے لگا۔ اس نے رفتہ رفتہ ڈونلڈ کو سکھایا کہ رشوت دے کر کام

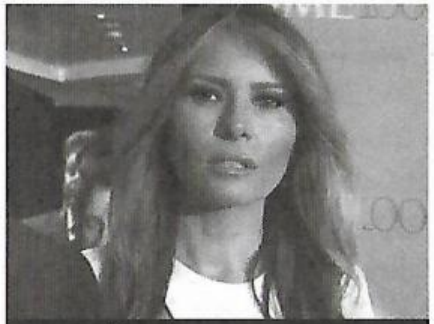
ٹرمپ کی بیوی جو پہلے ماڈل تھی

کیسے کروائے جاتے ہیں۔ سرکاری افسروں سے تعلقات کیسے بنتے ہیں اور یہ کہ ٹیکس چوری کیونکر کی جاتی ہے۔ غرض باپ نے بیٹے کو بھی کاروبار کرنے کے ناجائز و غیر اخلاقی داؤ پیچ سکھا دیے۔ انھی کی مدد سے ڈونلڈ بھی اپنی قسمت چمکانے اور دولت کمانے کی تگ و دو کرنے لگا۔

ڈونلڈ ٹرمپ سونے کا چمچ منہ میں لیے پیدا ہوا تھا۔ اس کی پرورش بھی ناز و نعم سے ہوئی۔ لاڈ پیار کی تربیت نے بھی اُسے بگاڑ دیا۔ جب وہ نوجوان ہوا تو عیش و عشرت میں پڑ گیا اور بدکردار لڑکیوں سے راہ و رسم رکھنے لگا۔ والدین نے بے راہ روی سے بچانے کی خاطر ڈونلڈ کی شادی کر دی مگر بیٹا سدھر نہ سکا۔

ڈونلڈ ٹرمپ نے شادی شدہ ہوتے ہوئے بھی مختلف عورتوں سے تعلقات رکھے۔ آخر ۱۹۹۲ء میں اس نے پہلی

بیوی کو طلاق دے دی۔ تب ناکام کاروباری منصوبوں کے باعث ٹرمپ قرضوں کی دلدل میں دھنسا ہوا تھا۔ اس کی محبوبہ، مارلا کے ہاں ناجائز بچہ پیدا ہونے والا تھا۔ اس امر نے ٹرمپ کی ماں کو بھی طیش دلا دیا۔ کہا جاتا ہے، میری این نے اس موقع پر کہا تھا ''یہ میں نے کس قسم کا بیٹا پیدا کر دیا؟''

یہ یقینی ہے کہ ماں اپنے بیٹے کی غلط کاریوں پر اُسے ڈانٹ ڈپٹ کرتی رہتی تھی۔ یہی وجہ ہے، ٹرمپ اپنی تحریروں اور تقریروں میں باپ کی تعریفوں کے تو پل باندھے رکھتا ہے مگر ماں کا ذکر خال خال ہی کرتا ہے۔ ماں سے انکسار، ہمدردی اور محبت کے جراثیم اس میں منتقل نہیں ہوئے مگر باپ سے ٹرمپ کو مکاری، ہوس اور لالچ کے جین مل گئے۔

اب مائیکل وولف کی کتاب میں بیان کردہ انکشافات پیش خدمت ہیں جو امریکی صدر کی نہایت عجیب و غریب اور عبرت انگیز تصویر سامنے لاتے ہیں۔

جیت کا یقین ہی نہیں تھا

مقام حیرت ہے کہ دولت کے نشے میں مست ایک مغرور، ضدی، جھگڑالو اور عیار آدمی امریکا کا صدر کیسے منتخب ہو گیا! مائیکل وولف کی کتاب افشا کرتی ہے کہ خود ڈونلڈ ٹرمپ اور اس کی ٹیم کو اپنی کامیابی کا یقین نہیں تھا۔ وولف نے اپنے دعوے کے سلسلے میں بعض واقعات رقم کیے ہیں۔

جب ٹرمپ کی ہنگامہ خیز ڈرامائی اور انتہائی متنازع الیکشن مہم جاری تھی، تو امریکی میڈیا نے اس کی تیسری بیگم، میلانیا کی برہنہ تصاویر شائع کر دیں۔ یہ تصاویر برسوں پہلے اس نے اتروائی تھیں جب وہ سلوانیا کی اُبھرتی ماڈل تھی۔

تصاویر کی اشاعت نے میلانیا کو بہت پریشان کر دیا اور وہ ڈپریشن میں مبتلا ہو گئی۔ اس نے اپنے شوہر سے کہا:

امریکی صدر کی بیٹی اپنے یہودی شوہر کے ساتھ

''سیاست کی گندگی میں لتھڑ کر ہم ننگے ہو جائیں گے''۔

شوہر نے اُسے دلاسا دیتے ہوئے کہا: ''میلانیا، فکر مت کرو۔ میں کبھی الیکشن نہیں جیت سکتا''۔

ٹرمپ کے اس بیان سے ظاہر ہے کہ موصوف نے محض منہ کا ذائقہ بدلنے اور عالمی شہرت پانے کے لیے صدارتی الیکشن لڑا۔ مائیکل لکھتا ہے کہ ٹرمپ کی ٹیم کے بعض ارکان کا خیال تھا، اس نے یہ تصاویر خود میڈیا کو فراہم کی ہیں۔

ڈونلڈ ٹرمپ کی ٹیم کا ذہن یہ تھا کہ ان کی ہار دراصل جیت ہو گی۔ وہ اس طرح کہ ٹرمپ بین الاقوامی طور پر مشہور ہو جائے گا۔ ساتھ ساتھ اس کی بیٹی، آئیونکا اور داماد، جیرڈ کشنر بھی ''سیلیبریٹی'' بن جائیں گے۔ ٹرمپ کی الیکشن مہم کا انچارج، سٹیو بینن (انتہا پسند سفید فاموں کی مسلم دشمن جماعت) ٹی پارٹی میں ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ جبکہ ٹرمپ الیکشن ٹیم کی منیجر، کیلیانی کونوے ٹی وی نیٹ ورکس کی آنکھوں کا تارا بن بیٹھے گی۔

میلانیا کو یہ بھی پریشانی تھی کہ اگر شوہر صدر بنا تو اس کی پرائیویٹ زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ تب وہ ہوٹلوں میں اجنبی کی طرح جا کر آرام و سکون سے کھانا نہیں کھا سکے گی۔

www.urdugem.com

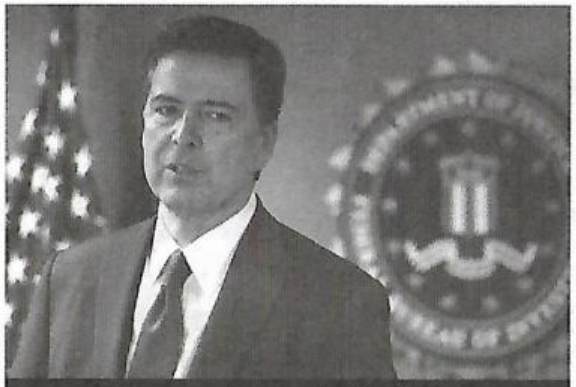
ایف بی آئی کا سابق سربراہ، جیمز کومی

ڈونلڈ ٹرمپ نے پھر بیگم کو یقین دلایا کہ وہ کسی صورت صدارتی انتخاب نہیں جیت سکتا۔

وولف لکھتا ہے، ٹرمپ اکثر اپنی انتخابی ٹیم کے ارکان سے کہتا: ''ہم سب شکست خوردہ لوگ ہیں۔ میری ٹیم کے سبھی لوگ نکمے اور فضول ہیں۔ کسی کو نہیں پتا کہ اسے کیا کام کرنا ہے''۔

باب مرسیر امریکا کا قوم پرست سفید فام کھرب پتی ہے۔ اس نے انتخابی مہم کے دوران ٹرمپ کو خوب چندہ دیا۔ باب سے گفتگو کرتے ہوئے ٹرمپ نے ایک بار کہا ''یہ سب کچھ (الیکشن مہم) بہت ہی... (فحش گالی) ہے۔''

لیکن الیکشن والے دن جب رات کو نتائج آنے لگے، تو سب کچھ تبدیل ہو گیا۔ غیر متوقع نتیجے نے سبھی کو دم بخود کر دیا۔ ٹرمپ کی حالت تو ایسی ہو گئی کہ کاٹو تو لہو نہیں۔ اس کیفیت کو ٹرمپ کے داماد، کشنر نے اپنے دوست سے کچھ یوں بیان کیا: ''مجھے لگا کہ میں کسی بھوت کو دیکھ رہا ہوں''۔

سٹیو بینن کہتا ہے: ''مگر ایک گھنٹے کے اندر اندر حیران پریشان اور بھوت بنا ٹرمپ تبدیل ہو گیا۔ اب اُسے لگنے لگا کہ فتح اس کا مقدر تھی اور وہ امریکا کا صدر بننے کی پوری اہلیت و صلاحیت رکھتا ہے''۔

وولف مزید لکھتا ہے: ''الیکشن کی رات نتائج دیکھ کر میلانیا ٹرمپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے..... مگر یہ خوشی کے آنسو نہیں تھے۔'' ظاہر ہے، بیگم ٹرمپ کے دل دماغ پر تو یہی خیال سوار تھا کہ وہ خاتون اول نہیں بن سکتی۔ اب اچانک اس کے نازک کاندھوں پر ذمے داریوں کا بوجھ آن پڑا، تو خاتون نے پریشان ہی ہونا تھا۔

کتاب کے آغاز میں بتایا گیا ہے کہ ٹرمپ کے حلف صدارت اٹھانے سے چند دن قبل ایک ریستوران میں سٹیو بینن اور راجر آئلز (Ailes) کھانے پر ملاقات کرتے ہیں۔ دونوں اس بات پر سخت متعجب اور بھونچکا ہیں کہ ''جوکر'' ٹرمپ صدارتی الیکشن جیت گیا۔ وہ پھر اس امر پر اظہار خیال کرتے ہیں کہ ٹرمپ صدر بن کر کیا کرے گا؟ موصوف کو ہار کا اتنا زیادہ یقین تھا کہ ٹرمپ نے صدر بننے کی صورت بعد ازاں کام کرنے کا کوئی پلان ہی تیار نہیں کیا تھا۔

ارے وہ تو احمق ہے!

تہلکہ خیز کتاب نے یہ اہم نکتہ بھی نمایاں کیا کہ ٹرمپ کے قریبی ساتھی اُسے ذہین نہیں ''غبی'' اور ''احمق'' سمجھتے ہیں۔ انھوں نے کئی بار اس امر کا اظہار کیا کہ آیا ٹرمپ میں ملک چلانے کی اہلیت ہے؟ کسی کا خیال تھا کہ ٹرمپ زیادہ پڑھا لکھا نہیں اور اس کا مطالعہ بھی کم ہے۔ دوسروں کے نزدیک وہ بچوں جیسی شخصیت رکھنے والا انسان ہے جو معمولی معمولی باتوں پر مچل جاتا ہے۔ یہ خیال

کیٹی والش کا ہے جو کچھ عرصہ وائٹ ہاؤس میں ڈپٹی چیف آف سٹاف رہی۔

سرمایہ دار تھامس بیرک ٹرمپ کے قریب ترین دوستوں میں سے ہے۔ اس نے ایک بار ٹرمپ پر یوں تبصرہ کیا: ''وہ دیوانہ ہی نہیں بے وقوف بھی ہے''۔ اسی طرح مشہور میڈیا شخصیت، رپرٹ مردوخ کے نزدیک بھی ڈونالڈ ٹرمپ احمق آدمی ہے جو کسی کی نہیں سنتا اور اپنی مرضی چلاتا ہے۔

ایک دوسرے کی بے عزتی

کتاب یہ بھی آشکارا کرتی ہے کہ وائٹ ہاؤس میں ٹرمپ اکثر اپنے ارکان ٹیم کی بے عزتی کر ڈالتا ہے۔ اس طرح ٹیم کے ارکان بھی ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ ٹرمپ کے وائٹ ہاؤس پہنچتے ہی دو گروہ بن گئے اور وہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانا کی کوششیں کرنے لگے۔ ایک گروہ کی قیادت بیٹی آیوانکا، داماد کشنر اور مشیر معاشیات گیری کوہن کر رہے تھے۔ دوسرے گروہ کا قائد سٹیو بینن تھا۔

جب ممتاز امریکی سیاست داں، ہنری کسنجر کو اس اندرون خانہ لڑائی کا علم ہوا، تو اس نے قرار دیا: ''یہودی اور غیر یہودی طاقت پانے کی خاطر باہم دست و گریباں ہیں''۔ یاد رہے، ٹرمپ کی بیٹی یہودی کشنر سے بیاہ رچا کر خود بھی یہودن بن چکی۔ جبکہ بینن مذہبی لحاظ سے انتہا پسند عیسائی امریکیوں کے طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔

جب یہ افشا ہوا کہ آیوانکا روسیوں سے تعلقات رکھتی ہے، تو ٹرمپ کے سامنے بینن نے اس کو ''..... (فحش گالی) روسی'' قرار دیا۔

امریکی دارالحکومت واشنگٹن ڈونلڈ ٹرمپ عالمی گرماؤ (گلوبل وارمنگ) کو

ڈراما قرار دیتا ہے۔ سٹیو بینن بھی اس قسم کا نظریہ رکھتا تھا۔ چناں چہ اس نے صدر پر زور دیا کہ امریکا ''پیرس معاہدہ'' چھوڑنے کا اعلان کر دے۔ تاہم بیٹی آیوانکا اس فیصلے کی مخالف تھی۔ اس نے باپ پر زور دیا کہ پیرس معاہدہ ترک نہ کیا جائے۔ تاہم ٹرمپ نے بیٹی کا احتجاج مسترد کر دیا۔ اس امر کو بینن نے اپنی جیت قرار دیا اور کہا: ''وہ مارا! میں نے گول کر دیا۔ اب وہ کتیا (آیوانکا) مردہ ہو چکی''۔

مائیکل وولف لکھتا ہے کہ وائٹ ہاؤس میں اور صدر ٹرمپ پر اپنا اثر رسوخ بڑھانے کے لیے دونوں گروہ ایک دوسرے کی غلطیاں اور خامیاں میڈیا تک پہنچا دیتے۔ بچارے ٹرمپ کو پتا ہی نہیں چلتا اور میڈیا میں اس کی بھد اڑنے لگتی۔ اسی لیے ٹرمپ نے اور تو اور بیٹی و داماد پر اعتماد کرنا چھوڑ دیا۔ بیٹی کا یہ حال تھا کہ وہ دوستوں کے سامنے باپ کے بالوں کا مذاق اڑاتی رہتی۔

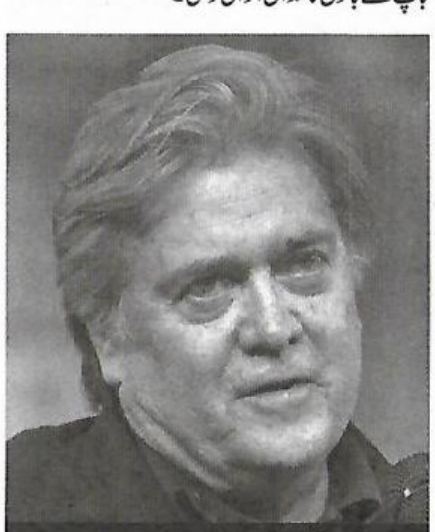
سٹیو بینن جس نے ٹرمپ کے پول کھولے

www.urdudigest.com

وائٹ ہاوس میں خانہ جنگی کے فاتح بیٹی و داماد ہی ٹھہرے۔ ٹرمپ نے بینن کو ''غدار'' اور ''گندا'' قرار دے کر وائٹ ہاوس سے نکال دیا۔ یوں بیٹی نے باپ پر بلاشرکت غیرے قبضہ جمالیا۔ بعض امریکیوں کا خیال ہے کہ وہ بھی مستقبل میں امریکی صدر بننے کے خواب دیکھ رہی ہے۔

جناب ٹرمپ بھی اپنی ٹیم کے ارکان کو نت نئے خطاب دینے میں کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ اپنے سابق چیف آف سٹاف رینس پریبس کو ''کمزور'' اور ''ٹھکنا'' کہا۔ داماد ''خوشامدی'' اور ''چاپلوس'' قرار پایا۔ سابق پریس سیکریٹری، سین سپائسر ''بے وقوف'' ٹھہرا۔

سعودی عرب میں ہمارا آدمی

ڈونلڈ ٹرمپ نے پہلا غیر ملکی دورہ سعودی عرب کا کیا۔ وہ وہاں سعودی حکومت کو ۱۱ ارب ڈالر کا امریکی اسلحہ فروخت کرنے میں کامیاب رہا۔ سعودی حکمرانوں نے اس کی خیر مقدمی تقریبات میں سات کروڑ پچاس لاکھ ڈالر خرچ کر ڈالے۔ کتاب کے مطابق ٹرمپ خاندان کو سونے سے بنی گولف کارٹ پر سیر کروائی جاتی رہی۔

اسی دورے میں جیرڈ کشنر اور سعودی شاہ کے فرزند، شہزادہ محمد بن سلمان کے مابین دوستی اور ہم آہنگی پیدا ہو گئی۔ کتاب میں دعویٰ کیا گیا کہ امریکا کی حمایت پا کر ہی چند ہفتوں بعد شہزادہ محمد نے ایک رات ولی عہد، شہزادہ محمد بن نائف کو گرفتار کر لیا۔ ولی عہد کو پھر استعفیٰ دینے پر مجبور کیا گیا۔ یوں شہزادہ محمد بن سلمان نئے ولی عہد بن گئے۔ اس تبدیلی کے بعد صدر ٹرمپ نے اپنے قریبی دوستوں کو بتایا:

''سعودیہ میں بغاوت میں نے کشنر کے ساتھ مل کے کروائی ہے۔ اب ہمارا آدمی سب سے اُوپر بیٹھ چکا''۔

جیمز کومی... شوباز اور چوہا

امریکا میں حزب اختلاف اور بعض انٹیلی جنس افسروں کا خیال ہے کہ صدارتی الیکشن کے دوران روسی حکومت نے مختلف طریقوں سے ڈونلڈ ٹرمپ کی مدد کی تھی تاکہ وہ انتخاب جیت سکے۔ اس ضمن میں حزب اختلاف نے ایک دستاویز بھی تیار کروائی جو ''ڈونلڈ ٹرمپ رشیا دستاویز'' کہلاتی ہے۔

یہ دستاویز جنوری ۲۰۱۷ء میں امریکی میڈیا و ویب سائٹ، بزفیڈ نے شائع کر دی۔ اس میں ٹرمپ اور اس کی ٹیم پر مختلف الزامات لگائے گئے جن کا لب لباب یہ ہے کہ الیکشن جیتنے کے سلسلے میں مختلف طریقوں سے انھیں روس کی مدد حاصل رہی۔ یہ دستاویز منظر عام پر آنے کے بعد ایف بی آئی ڈائریکٹر، جیمز کومی کے حکم پر اپنی ہی حکومت کے خلاف تحقیقات کا آغاز کر دیا گیا۔

کتاب عیاں کرتی ہے کہ ایف بی آئی کی تحقیقات نے ٹرمپ کی بیٹی اور داماد کو خوفزدہ کر دیا۔ پہلی وجہ یہ کہ جون ۲۰۱۶ء میں جیرڈ کشنر نے مع اپنے ساتھیوں کے روسی سفارت کاروں سے ملاقات کی تھی۔ مدعا یہ تھا کہ ہیلری کلنٹن کو شکست دینے کے سلسلے میں مدد حاصل کی جا سکے۔ کتاب کے مطابق سٹیو بینن نے اس ملاقات کو ''غداری'' اور ''قابل تعزیر جرم'' قرار دیا۔

دوسری وجہ یہ کہ ڈونلڈ ٹرمپ یہ خطرہ محسوس کرنے لگا کہ ایف بی آئی کی چھان بین کا دائرہ کار اس کے کاروبار کو بھی اپنی لپیٹ میں لے سکتا ہے۔ یوں اس کی مالی بدعنوانیاں سامنے آجاتیں۔ یہی وجہ ہے، ٹرمپ نے اچانک اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیے بغیر مئی ۲۰۱۷ء میں جیمز کومی برخاست کر دیا۔

ٹرمپ نے بعد ازاں اپنی ٹیم کو بتایا ''جیمز کومی ایک ''شوباز'' اور ''چوہا'' تھا، لہٰذا یہ ضروری تھا کہ اُسے گھر بھجوا

دیا جائے۔ تاہم جیمز کی برخاستگی کے باوجود ایف بی آئی کی تحقیقات جاری رہیں۔ بعض امریکی مبصرین کا دعویٰ ہے کہ ان کے نتیجے میں ٹرمپ کے خلاف تحریک مواخذہ آ سکتی ہے۔

یروشلم میں امریکی سفارت خانہ

سٹیو بینن نے مصنف کتاب کو بتایا کہ جیسے ہی ٹرمپ نے صدارتی الیکشن جیتا، اس کے اگلے دن ہی یہ فیصلہ کر لیا گیا تھا کہ امریکی سفارت خانہ تل ابیب سے یروشلم (بیت المقدس) منتقل ہو جائے گا۔ اسرائیل کا وزیر اعظم، نیتن یاہو اور امریکی سرمایہ دار، شیلڈن ایڈلسن فوراً بذریعہ ٹرمپ یہ اعلان کروا دینا چاہتے تھے۔ (تاہم یہ اعلان کئی ماہ بعد دسمبر ۲۰۱۷ء میں کیا گیا۔)

زہر دے دیا جائے گا!

ڈونلڈ ٹرمپ کو یقین ہے کہ اس کے مخالف اُسے کھانے میں زہر ملا کر مارنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے، وہ میکڈونلڈ کے برگر کھانا پسند کرتا ہے۔ ظاہر ہے، میکڈونلڈ میں کوئی نہیں جانتا کہ برگر کس شخصیت کے لیے خریدے جا رہے ہیں۔

عدی اور قصی

جب صدر ٹرمپ نے اپنی کمپنی کو خیرباد کہا، تو اس کا انتظام موصوف کے دو بیٹوں، ٹرمپ جونیئر اور ایرک ٹرمپ نے سنبھال لیا۔ کتاب نے افشا کیا کہ کمپنی کے صدر دفتر میں دونوں بھائی ''عدی اور قصی'' کہلاتے ہیں۔

یاد رہے، عدی اور قصی عراقی آمر، صدام حسین کے دو بیٹے تھے۔ یہ دونوں مخالفین پر ظلم و ستم کرنے کے سلسلے میں مشہور تھے۔

اخلاق باختگی کی انتہا

کتاب کی رو سے ٹرمپ کا نظریہ یہ ہے کہ دوستوں کی بیویوں کے ساتھ تعلقات رکھنے سے زندگی سنور جاتی ہے۔ موصوف دوستوں کو دفتر بلوا کر ان کے ساتھ فحش گفتگو کرتا تھا۔ یہ گفتگو خفیہ طور پر ریکارڈ کر لی جاتی۔ یہ گفتگو پھر ان کی بیویوں کو بھی سنوائی جاتی تاکہ ٹرمپ انھیں اپنے جال میں پھانس سکے۔

مشکوک دماغی حالت

مائیکل وولف لکھتا ہے کہ وائٹ ہاوس میں ٹرمپ کے اردگرد اٹھتے بیٹھتے سبھی لوگوں کو یقین ہے کہ وہ دماغی طور پر کمزور ہے۔ اس کو قریبی دوستوں کی شکلیں بھی یاد نہیں رہتیں اور وہ انھیں پہچاننے میں دقت محسوس کرتا ہے۔ جملوں کو بار بار دہرانا بھی اس کی عادت ہے۔

خواتین پر زیادہ اعتماد

کتاب کی رو سے ٹرمپ زن بیزار مرد ہے۔ وہ عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھتا ہے۔ مگر اس کی شخصیت کا تناقص یہ ہے کہ وہ اپنی کمپنی میں مردوں کے بجائے عورتوں پر زیادہ اعتماد کرتا ہے۔ ٹرمپ کی رو سے خواتین زیادہ وفادار ہوتی ہیں۔ مرد زیادہ محنتی اور مسابقتی ہوتے ہیں مگر وہ اپنے ایجنڈے بھی رکھتے ہیں۔

ٹی وی سے لگاؤ

ڈونلڈ ٹرمپ ٹی وی دیکھنے کا از حد شوقین ہے۔ یہی وجہ ہے، وائٹ ہاوس کے اپنے بیڈ روم میں اس نے پہلے دن ہی تین ٹی وی لگوا لیے۔ ان تینوں پر بیک وقت وہ تین چینل دیکھ سکتا ہے۔

ٹی وی دیکھنے کا یہ شوقین امریکی صدر مطالعہ بہت کم کرتا ہے۔ اسی لیے اُسے حالات حاضرہ کی زیادہ خبر نہیں ہوتی اور وہ سنی سنائی افواہوں کو بھی سچ مان کر اپنی تقریروں میں بیان کر جاتا ہے۔ بعد ازاں اس کی بھد اُڑے تو آئیں بائیں شائیں کرنے لگتا ہے۔

www.urdugem.com

کتاب میں ٹرمپ کا ایک اور ”کارنامہ“ درج ہے۔ جب سے وائٹ ہاؤس تعمیر ہوا ہے، یہ رواج چلا آرہا ہے کہ امریکی صدر کے کمرۂ استراحت کو تالا نہیں لگایا جاتا۔ مگر ٹرمپ نے صدر بنتے ہی حکم دے دیا کہ اس کے بیڈ روم کو تالا لگایا جائے۔

بیگم سے ”انوکھا“ رشتہ

مائیکل وولف کو ٹرمپ کے قریبی ساتھیوں نے بتایا کہ امریکی صدر کا اپنی بیگم کے ساتھ عجیب رشتہ ہے۔ صدر بننے سے قبل یہ عالم تھا کہ کئی دن گزر جاتے اور وہ ایک دوسرے سے نہ ملتے۔ بیگم ٹرمپ کو اکثر مطلق خبر نہ ہوتی کہ اس کا شوہر کہاں ہے۔

جب ٹرمپ صدر بن گیا، تو تب بھی میلانیا الگ خواب گاہ میں سوتی ہے۔ ٹرمپ کے قریبی ساتھیوں کو میاں بیوی کا پیچیدہ اور پُراسرار رشتہ حیرت میں مبتلا کیے رکھتا ہے۔ انھیں یقین ہے کہ یہ صرف نام کی شادی ہے۔

انٹرنیٹ دیکھو...

صدر ٹرمپ کے دور میں امریکا میں مسلمانوں کے داخلے پر پابندی کا قانون سٹیفن ملر نے تیار کیا۔ یہ یہودی ہے اور ٹرمپ کا سینئر مشیر۔ مگر کتاب افشا کرتی ہے کہ یہ شخص عالمی سیاست اور عسکری معاملات سے بہت کم آگاہی رکھتا ہے۔

کتاب میں درج ہے کہ جب سٹیفن ملر مسلمانوں پر پابندی کا قانون تیار کرنے لگا، تو اُسے سمجھ نہیں آیا کہ وہ آغاز کہاں سے کرے۔ تبھی سٹیو بینن نے اُسے مشورہ دیا: ”ارے بھائی انٹرنیٹ پر مسلم ممالک سے متعلق معلومات لو اور پھر ایگزیکٹیو آرڈر تیار کرو“۔

ذاتی خواہشات پر چلنے والا صدر

وائٹ ہاؤس میں ٹرمپ کی ٹیم کے ارکان بتاتے ہیں کہ صدر اہم معاملات میں بھی ساتھیوں سے کم ہی مشورہ کرتا ہے۔ وہ حقائق نہیں پرکھتا اور نہ ہی زمینی صورت حال کا جائزہ لیتا ہے۔ اس کے من میں جو آئے، بچوں کی طرح وہی کر ڈالتا ہے۔ (یکم جنوری ۲۰۱۸ء کی صبح پاکستان کے خلاف بچکانہ ٹویٹ بھی کسی ذاتی خواہش کا نتیجہ تھی)۔

جلد بازی اور مشورہ نہ کرنے کے باعث ٹرمپ کو اکثر اوقات بعد میں پچھتانا پڑتا ہے۔ وہ اپنے کیے کی معذرت کرتا یا پھر کوئی عذر تراش لیتا ہے۔

حرفِ اختتام

قارئین کرام، درج بالا عبرت ناک واقعات سے عیاں ہے کہ امریکا میں سفید فام باشندوں کا بڑا حصّہ متعصب اور کٹر حد تک قوم پرست ہو چکا۔ اسی لیے انھوں نے بے سوچے سمجھے ایسے شخص کو ووٹ دے کر اپنا صدر بنا لیا جو اخلاقی طور پر انتہائی کرپٹ، جنگجو، جھگڑالو، شکی مزاج اور مغرور ہے۔ طاقت و قوت پا کر وہ خود کو بادشاہ سمجھنے لگا اور کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔

ٹرمپ کبھی افریقی ممالک کو فحش الفاظ سے نوازتا اور کبھی پاکستان و ایران پر زبردتو بیخ کرتا ہے۔ اب امریکا کی خارجہ پالیسی ٹرمپ کے گرد گھوم رہی ہے۔ حتیٰ کہ وہ متنازع بیان داغتے ہوئے بھی کسی سے مشورہ نہیں کرتا۔ اس سنگین صورت حال سے واضح ہے کہ بچکانہ طبیعت رکھنے والا صدر ٹرمپ کسی نازک لمحے کوئی بھی ایسا خوفناک فیصلہ کر سکتا ہے جو دنیا میں تباہی و بربادی پھیلانے کا سبب بن جائے۔ مثلاً یہ کہ وہ شمالی کوریا یا ایران پر بم باری کرنے یا ایٹم بم گرانے کا حکم دے ڈالے۔

امریکا میں جلد عوام و خواص کو ٹرمپ سے چھٹکارا پانے کی تراکیب سوچنا ہوں گی۔ جب تک وہ صدر رہے گا، کرّہ ارض کے باسیوں کے سر پر بے یقینی اور انتشار کی تلوار لٹکتی رہے گی۔

صالحہ محبوب

شرارت کی پُڑیا

دوسروں کی ناک میں دم کر دینے والے نٹ کھٹ بچے کا سبق آموز ماجرا

ارتضیٰ کی شرارتیں روز ہی اپنے عروج پر ہوتیں اور گھر پر شکایتیں بھی موصول ہوتی رہتیں۔ کبھی اسکول تو کبھی ہمسائیوں سے۔ کبھی گھر میں موجود ملازمین اور بہن بھائیوں تو کبھی دودھ والے سے۔ اور تو اور جانور بھی اس سے پناہ مانگتے۔ جانے روز نت نئی شرارتوں کے خیالات اس کے ذہن میں کہاں سے آتے۔

اس کی امّی اور ابّو ان شکایتوں سے اکثر پریشان ہو جاتے۔ انھیں عموماً بیٹے کی وجہ سے شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا۔

تھے تو ارتضیٰ میاں دس برس کے مگر بلا کے ذہین۔ ابھی کل ہی اسکول سے شکایت آئی کہ ٹیچر کو چھپکلی اور سانپ سے ڈرانے کے بعد اب عملہ اسکول کو دھمکی آمیز خط لکھ کر ڈرانے کی کوششیں کی گئی۔ وہ تو ان کے خط میں موجود املا کی غلطیوں نے ان کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ پرنسپل صاحب نے ابّا جان کو اسکول بلایا۔ خوب ڈانٹ ڈپٹ ہوئی اور اُسے اسکول سے نکالنے کی دھمکی بھی دی۔

ارتضیٰ کے ہم جماعت بھی اُس سے خاصے تنگ تھے۔ دوسرے بچوں کا لنچ کھا جانا یا جیومیٹری باکس نکال لینا تو عام سی باتیں تھیں۔ کبھی وہ بچوں کی کاپیاں ادل بدل کر دیتا تو کبھی آگے بیٹھے بچے کا بیگ کرسی سے اِس مضبوطی سے باندھتا کہ چھٹی کے وقت بچے کے ساتھ کرسی بھی رواں دواں ہوتی۔ کسی دن تمام کلاس کی کتابیں پنکھے کی سیر کرتی پائی جاتیں تو کبھی کاپیاں باہر پودوں میں آرام کرتی ملتیں۔

www.urdugem.com

ارتضیٰ کو اپنی بلّی سے بہت محبت تھی۔ سو فسٹ بیج سے کھانے پینے کی ہر شے بلّی کے پیالے میں منتقل ہو جاتی۔ بلّی پر ریسرچ بھی جاری رہتی۔ اُسے دودھ کے ساتھ ساتھ پھل سبزی کھانے پر مجبور کیا جاتا۔ دم کے ساتھ پٹاخے باندھ کر اس کی رفتار کا جائزہ لیا جاتا۔

اسکول سے واپسی پر وین والے کا خوب خوب دماغ چاٹا جاتا۔ وین میں نئی نئی حرکتیں کی جاتیں اور خوب دھما چوکڑی مچا کر وین سے اُترا جاتا۔

ارتضیٰ کے ابّو ڈاکٹر مصطفیٰ شہر کے مشہور اور مصروف سرجن تھے۔ انھیں عموماً بچوں کے ساتھ وقت گزارنے کا کم ہی موقع ملتا۔ وہ اپنے 'مار نہیں پیار' والے اصول کو ارتضیٰ کے لیے توڑ چکے تھے۔ جب کوئی بزرگ اس کی شکایت لے کر آتا تو وہ اس کی ٹھکائی بھی لگا دیتے۔ ارتضیٰ کے قریبی گھر میں شیخ صاحب کی پرانی گاڑی عموماً ارتضیٰ کے مذاق کا نشانہ بنتی۔ وہ روز گزرتے گزرتے پوچھتا کہ انکل آپ کی گاڑی کو دھکا لگا دوں۔

شیخ صاحب نے نئی گاڑی خریدی تو ارتضیٰ صاحب اپنی سائیکل پر اس کا مقابلہ کرنے باہر آن پہنچے۔ گاڑی کے ارد گرد چکر لگاتے لگاتے سائیکل خوب زوردار دھاکے سے گاڑی کے عین سامنے ٹکرا گئی۔ جانے ارتضیٰ کی قسمت زیادہ بُری تھی یا شیخ صاحب کی کہ گاڑی کے سامنے والی بتی ٹوٹ گئی۔ اس حادثے کے عینی گواہ گھر کے گارڈ، چوکیدار اور شیخ صاحب کا ڈرائیور سب ہی تھے۔ سو ارتضیٰ میاں کے لیے حادثے سے انکار کرنا ممکن ہی نہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے شیخ صاحب سے معافی مانگی، بتی کی قیمت بھی ادا کی اور سب کے سامنے ارتضیٰ کی پٹائی بھی کی۔

آج دادا جان رات کو اپنے کمرے میں سونے آئے تو سامنے بستر پر ارتضیٰ میاں لیٹے ہوئے تھے۔ چہرے پر افسردگی اور شرمندگی لیے۔ گالوں پر آنسوؤں کے نشان خاصے واضح تھے۔

''دادا ابا آج سے میں آپ کے ساتھ ہی سویا کروں گا'' ارتضیٰ انھیں دیکھ کر بولا۔ ''سب میرے دشمن ہیں۔ اب میرے سے غلطی ہو گئی تو ابّا جان نے مجھے مارا۔ امّی بھی خفا ہو گئیں۔ علی اور عثمان بھائی تو ویسے ہی مجھے اچھا نہیں سمجھتے۔ آپا کے تو کمرے میں بھی چلا جاؤں تو وہ ڈانٹنے لگتی ہیں۔ بس آپ ہی مجھ سے محبت کرتے ہیں'' اُسے آخری جائے پناہ دادا جان کا بستر ہی ملا تھا۔

''ٹھیک ہے میرے بچے، آج سے آپ میرے ساتھ ہی سوؤ گے'' دادا جان مسکرائے۔ ''آج میں تمھیں ایک کہانی سناتا ہوں۔'' انھوں نے پوتے کو خود سے لپٹا لیا۔ ارتضیٰ دادا کا نرم لہجہ اور پیار بھرا انداز دیکھ کر اور بھی زیادہ لپٹ گیا۔

''میرے بچے! بہت سال پہلے کی بات ہے کہ ایک بہت غریب بچے کو پانچویں جماعت میں بہت اچھے نمبر لینے پر ایک بڑے سکول میں مفت داخلہ مل گیا۔ وہ بچہ بہت ذہین تھا مگر بڑے سکول میں بچے امیر گھروں سے آتے تھے۔ ان کے یونیفارم بڑے چمکتے ہوئے صاف ستھرے ہوتے۔ اُن کی کتابیں، کاپیاں، سب بہت اچھے ہوتے۔ اُس غریب بچے کے پاس ایک ہی پرانا یونیفارم، خستہ حال جوتا اور پھٹا پرانا بستہ ہوتا تھا۔ ہم جماعت اُس سے دُور دُور رہتے۔ اس کا مذاق بھی اڑاتے۔ کلاس کے سب سے شرارتی بچے نے ایک دن اس کا ٹفن چوری کر لیا۔ جب اس نے وہ ٹفن آدھی چھٹی کے وقت کھولا تو وہ خالی تھا۔ غریب بچہ صرف اپنی خودداری کے لیے وہ خالی ڈبہ لایا کرتا تھا۔ شرارتی بچے کو پہلی بار خود پر غصّہ آیا اور وہ شرمندہ بھی ہوا کیونکہ اس سے پہلے وہ اُس بچے کی کتابیں اور کاپیاں بھی چھپا چکا تھا۔

اگلے روز وہ اپنے گھر سے دو ٹفن لایا ایک اپنا اور دوسرا اُس غریب بچے کے لیے۔ جس خفیہ طریقے سے وہ چیزیں چوری کرتا تھا اُس نے اُسی احتیاط سے بچے کے بستے میں ٹفن واپس رکھ دیا۔ بریک کے بعد اسے اپنے غریب دوست کے چہرے پر خوشی کی ایسی کرن نظر آئی جو اس کے لیے ایک نیا تجربہ تھی۔ اب وہ روز ہی دُگنا لنچ لانے لگا اور چپکے سے اپنے ساتھی کے بستے میں ڈالنے لگا۔ اب وہ اکثر نیا قلم، کاپی، رجسٹر اور ضرورت کی چیزیں جو اپنے لیے خریدتا

اپنے دوست کے بستے میں بھی ڈال دیتا۔

''اگلے برس اس نے جب اپنے لیے نئی وردی سلوائی تو اپنے دوست کے ناپ کی دو وردیاں سلوا کر اس کے گھر کے پتے پر پارسل کر دیں۔ اپنے نئے جوتوں کے ساتھ دوست کے لیے بھی نئے جوتے لے کر اس کے گھر بھجوا دیے۔ وہ یہ سب کام بہت احتیاط سے کرتا رہا کہ اس کے کسی ہم جماعت، استاد یا دوست کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ دونوں نے اسی تعاون کے ساتھ میٹرک کیا۔ کالج میں غریب لڑکے کو وظیفہ بھی ملنے لگا مگر دوست کا تعاون اب بھی جاری تھا۔

وقت گزرتا رہا۔ وہ غریب لڑکا ڈاکٹر بن گیا اور پھر ایک مشہور سرجن۔ اب اس کی شاندار کوٹھی ہے۔ ایک بہت بڑا ذاتی ہسپتال ہے۔ لمبی لمبی دو تین گاڑیاں ہیں اور پیارے پیارے چار بچے بھی ہیں۔ اس کا سب سے چھوٹا بیٹا بہت شرارتی ہے۔ جب وہ شرارت میں کسی کا نقصان کر دیتا ہے تو وہ ڈاکٹر بہت غصّہ کرتا ہے۔ مارتا ہے اور وہ بچہ مار کھا کر باپ سے ناراض ہو جاتا ہے۔''

''دادا جان! وہ غریب لڑکا میرے بابا ڈاکٹر مصطفیٰ ہی ہیں ناں اور ان کا شرارتی بیٹا میں ہوں۔'' ارتضیٰ فوراً اُٹھ بیٹھا۔

ہاں بیٹا، یہ تمہارے ابو اور تمہاری کہانی ہے۔ یہ سب آسائشیں تمہارے ابّو نے بہت محنت سے حاصل کی ہیں۔ اگر وہ امیر لڑکا تمہاری طرح ہر ایک کو تنگ کر کے خوش ہوتا تو بھلا تمہارا باپ اِس مقام تک پہنچ پاتا؟ بیٹا یہ بھوک، غربت اور بے چارگی سب بہت بُری چیزیں ہیں اور ان کے ساتھ اگر تمہاری شرارتوں سے دوسروں کی مشکلات بڑھ جائیں تو کتنی بُری بات ہوگی؟

''تم نے اپنی چھوٹی سی شرارت سے شیخ صاحب کی نئی گاڑی کا کتنا بڑا نقصان کر دیا۔ تمہارے اُس دھمکی والے خط سے تمہارے سکول کے چوکیدار اور گارڈ کی نوکری خطرے میں پڑ گئی۔ دودھ والے کی سائیکل کی ہوا نکالنے سے اس دن کا دودھ خراب ہو گیا۔ وہ مقررہ وقت پر گھروں میں نہیں پہنچا سکا اور بلّی کی دم سے پٹاخے باندھنے سے اُسے سر میں چوٹ لگ سکتی تھی۔ اگر ہمارے کاموں سے دوسروں کی دل آزاری ہو تو کتنا برا کام ہے۔''

''دادا جان! مجھے دوسروں کو پریشان دیکھنے میں مزہ آتا ہے۔'' ارتضیٰ معصومیت سے بولا۔

''بیٹے کسی کی مشکل میں ایک دم آسانی کر کے دیکھو۔ اُسے دیکھ کر تمہیں اور بھی زیادہ مزہ آئے گا'' دادا جان مسکرا کر بولے۔''

''وہ کیسے دادا جان؟'' ارتضیٰ نے سوال کیا۔

''جیسے کل تمہارے ابو سے دوا لینے اور علاج کروانے تمہارے قاری صاحب آئے تھے۔ مصطفیٰ نے انھیں اپنے ہسپتال بلا کر سارے ٹیسٹ اور معائنہ کیا، تشخیص کر کے دوا دی اور پھر ان سے بالکل بھی پیسے نہیں لیے۔ یہ سب تمہارے ابّو کے لیے تو بہت آسان تھا مگر قاری صاحب کے لیے بہت بڑا، مشکل اور مہنگا کام تھا۔ بس جہاں تک ہو سکے دوسروں کے کام آؤ اور سب سے بڑی بات یہ کہ احسان کر کے بھول جاؤ۔ نیکی بار بار یاد دلانا بہت بری بات ہے'' دادا جان بولے

''دادا ابا! جب ہم دوسروں کو تنگ کرتے ہیں تب تو وہ ہماری شکایت ہر ایک کے سامنے کرتے ہیں اور ہم اپنی نیکی چھپا کر کریں۔ واہ یہ کیا بات ہوئی۔'' ارتضیٰ چمک کر بولا۔

''بیٹے! ثواب تو نیکی چھپانے میں ہی ہے۔'' دادا جان ارتضیٰ کا ماتھا چوم کر بولے۔

''ٹھیک ہے اب میں بھی دوسروں کو تنگ کرنے کی بجائے ان کی مدد کر کے اُس خوشی کو ڈھونڈنے کی کوشش کروں گا جو دوسروں کے چہرے پر آتی ہے''۔ ارتضیٰ نے فوراً وعدہ کر لیا۔

''اِن دوسروں میں تمہارے بلّی بھی شامل ہونی چاہیے''۔ دادا جان فوراً بولے۔

اور ارتضیٰ ابّو اور امّی کی مار اور ڈانٹ اور شیخ صاحب کے غصّے والے صدمات بھلا کر دادا جان کے بازو پر سر رکھ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ ◆◆◆

www.urdugem.com

ابو صارم

ان تاریخی عوامل کا
سنسنی خیز تذکرہ جن کے
سبب وطنِ عزیز میں
آگ اور خون کا
کھیل شروع ہوگیا

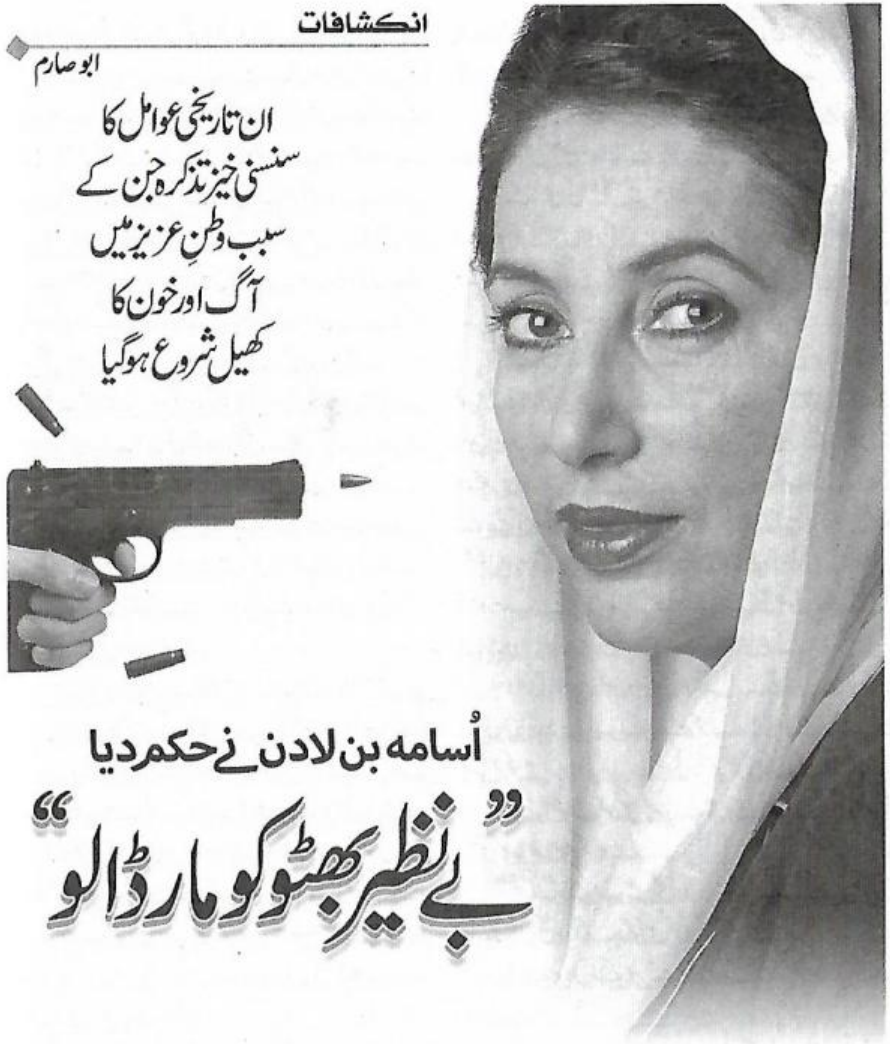

اُسامہ بن لادن نے حکم دیا "بے نظیر بھٹو کو مار ڈالو"

یہ فروری ۲۰۰۹ء کی بات ہے، پشاور کے مضافات میں سڑک پر سفر کرتی ایک کار رکی۔ اس میں سے کچھ لوگ اُترے، کار کی ڈگی کھولی، اندر سے ایک آدمی کو باہر نکالا، اُسے تھپڑ مارے اور پھر ڈگی میں بند کر دیا۔ انھیں خبر نہ تھی کہ وہاں سے گزرتے ایک ٹیکسی ڈرائیور نے یہ حیران کن ماجرا دیکھا، تو چوکنا ہوگیا۔ اس نے قریب ہی موجود پولیس چوکی پر پہنچ کر انسپکٹر کو ساری داستان سنا ڈالی۔

چناں چہ جب وہ کار پولیس چوکی کے قریب پہنچی، تو

اُسے رکنے کا اشارہ کیا گیا۔ کار ڈرائیور نے یہ دیکھ کر اپنی گاڑی بھگا دی۔ مگر پولیس نے بھی فوراً کار کا تعاقب کیا اور آخراُسے روکنے میں کامیاب رہی۔ کار میں بیٹھے تین لوگ گرفتار کر لیے گئے۔ ڈگی سے رسیوں سے بندھا ایک شخص برآمد ہوا۔ وہ اسلام آباد کا رہائشی سوار خان تھا۔ اس نے انکشاف کیا کہ یہ لوگ اُسے اغوا کر کے افغانستان لے جا رہے تھے۔

بعدازاں گرفتار شدہ آدمیوں سے تفتیش ہوئی، تو ان میں ایک میجر (ر) ہارون عاشق نکل آیا۔ یہ معمولی شخصیت نہیں تھا، اسے تب تک اسامہ بن لادن کی قائم کردہ جنگجو تنظیم، القاعدہ میں ایک نمایاں حکمت کار (Strategist) اور راہنما کی حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔

☆☆☆☆☆

تاریخ شاہد ہے کہ پاکستان کو عیار و مکار امریکی حکمرانوں کی وجہ سے خانہ جنگی کی آگ میں جلنا پڑا۔ امریکیوں کے باعث نہ صرف عرب گوریلوں اور پاک فوج میں تصادم ہوا بلکہ پاکستانی معاشرہ بھی مختلف گروہوں میں تقسیم ہوگیا۔ سابق وزیراعظم بے نظیر بھٹو، سینکڑوں فوجی افسروں اور سیاست دانوں کے قتل کا ذمے دار بھی امریکا ہی ہے۔ امریکی اور پاکستانی حکمرانوں کی قربت کے باعث عام پاکستانیوں کو بھی عظیم جانی و مالی نقصان برداشت کرنا پڑا۔

یکم جنوری کو علی الصبح جب سورج ابھی طلوع بھی نہیں ہوا تھا، امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے بذریعہ ایک ٹویٹ پاکستان پر لفظی حملہ کر دیا۔ انھوں نے پاکستانی حکمرانوں کو دھوکے باز اور جھوٹا قرار دیا اور دعویٰ کیا کہ وہ امریکا کے دشمن طالبان کے خلاف کارروائی نہیں کر رہے۔ اس ٹویٹ کا اصل نشانہ پاک فوج تھی۔ یوں امریکا اور پاکستان کے تعلقات کی ۷۷ سالہ تاریخ میں ایک اور سیاہ باب کا اضافہ ہوگیا۔

امریکا نے ۱۹۵۱ء سے پاکستان کو مالی و عسکری امداد دینا شروع کی۔ جب بھی امریکا کو اپنے مفادات کے تحت پاکستان کی ضرورت پڑی، اس امداد میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ جب امریکی حکمران طبقے کا مفاد پورا ہو چکتا، تو پاکستان کو ایک لحاظ سے بے یار و مددگار چھوڑ دیا جاتا۔

مثال کے طور پر جب ۱۹۶۵ء میں پاک بھارت جنگ ہوئی، تو امریکا نے پاکستان کو اسلحہ نہ دینے کا اعلان کر ڈالا۔ اسی طرح ۱۹۷۱ء کی جنگ میں امریکی حکمران یہی بہلاوے دیتے رہے کہ امریکی طیارہ بردار جہاز خلیج بنگال آنے والا ہے۔ یہ محض فراڈ تھا۔

بعدازاں پاکستان نے ایٹم بم بنانے کے منصوبے پر کام شروع کیا، تو امریکا اُسے دھمکیاں دینے لگا۔ اگر سویت یونین افغانستان پر حملہ نہ کرتا، تو یہ عین ممکن تھا کہ امریکی بھارتی یا اسرائیلی جنگی طیاروں کے ذریعے کہوٹہ پر بم باری کروا دیتے۔ جیسے اسرائیلی جنگی جہازوں نے عراق کا ایٹمی مرکز تباہ کر دیا تھا۔

جب افغانستان میں سویت یونین نے دھاوا بولا، تو امریکی حکومت کے پاس اپنے سب سے بڑے حریف کو شکست دینے کا سنہرا موقع ہاتھ آ گیا۔ سویت فوج سے خلاف افغان مجاہدین ہی نبرد آزما ہوئے مگر انھیں اسلحہ امریکا اور پاکستان نے فراہم کیا۔ چناں چہ ۱۹۸۰ء تا ۱۹۸۸ء پاکستان امریکی حکمرانوں کی ڈارلنگ بنا رہا۔

لیکن جیسے ہی سویت فوج کو شکست ہوئی اور امریکا کا مفاد پورا ہوگیا، تو امریکیوں نے خودغرضی دکھاتے ہوئے نگاہیں پھیر لیں۔ امریکی افغانستان میں پائیدار حکومت قائم کیے بغیر پیچھے ہٹ گئے۔ چناں چہ افغانستان میں خانہ جنگی کا ایسا بھیانک اور طویل سلسلہ شروع ہوا جو اب تک جاری و ساری ہے۔

افغان جہاد کے دوران بہت سے عرب جنگجو بھی افغانوں کے شانہ بشانہ لڑے۔ انھی میں امیر کبیر خاندان سے

www.urdugem.com

تعلق رکھنے والے اسامہ بن لادن بھی شامل تھے۔ ۱۹۸۸ء میں انھوں نے ایک جہادی تنظیم، القاعدہ کی بنیاد رکھی۔ مقصد یہ تھا کہ اب مقبوضہ کشمیر، فلسطین اور مسلمانوں کے دیگر علاقوں کو قابض غیر مسلموں کے تسلط سے آزاد کروایا جائے۔

چناں چہ ۱۹۸۸ء کے اواخر سے القاعدہ کی زیر سرپرستی مقبوضہ کشمیر میں بھارتی تسلط کے خلاف مسلح جدوجہد شروع ہو گئی۔ اس مسلح جدوجہد کو پس پردہ پاک فوج کے بعض جرنیلوں کی حمایت حاصل تھی۔ ان جرنیلوں کو یقین تھا کہ افغانستان کی طرح مقبوضہ کشمیر میں بھی مجاہدین بھارتی فوج کو پسپا کر سکتے ہیں۔ ان کی مدد کے باعث ہی مقبوضہ کشمیر میں مسلح جدوجہد پھیلتی چلی گئی۔ اس کا مقابلہ کرنے کی خاطر بھارتی حکومت کو آٹھ لاکھ فوجی وادی کشمیر میں تعینات کرنا پڑے۔

اس دوران عالمی سطح پر القاعدہ اور امریکا کے مابین مجادلہ شروع ہو گیا۔ امریکا عیاں و خفیہ سرگرمیوں کے ذریعے عالم اسلام کو اپنی گرفت میں رکھنا چاہتا تھا۔ جب امریکی سپر میسی کو القاعدہ نے چیلنج کیا، تو دونوں قوتوں کے مابین لڑائی چھڑ گئی۔ اس مجادلے کا نقطہ عروج ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو آیا جب القاعدہ کے جنگجو امریکی سپر میسی کی علامت ورلڈ ٹریڈ سینٹر تباہ کرنے میں کامیاب رہے۔

اب امریکا نے ''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' کا آغاز کر دیا۔ اول اول یہ القاعدہ کے خلاف تھی مگر پھر افغان طالبان حکومت، عراقی صدر صدام حسین اور عالم اسلام میں مصروف کار دیگر جہادی تنظیمیں بھی امریکا کا نشانہ بن گئیں۔ امریکیوں نے یک جنبش قلم آزادی کی تحریکوں کو بھی دہشت گرد قرار دے دیا۔

امریکیوں کا خاص ہدف، اسامہ بن لادن جو افغانستان میں مقیم تھے اور جہاں پاکستانی حکومت خاصا اثر و رسوخ رکھتی تھی۔ یوں امریکا کا مفاد دوبارہ پاکستان سے وابستہ ہو گیا۔ امریکی حکومت نے دھمکیوں اور مراعات کے ذریعے اپنی جنگ میں پاکستان کو بھی شامل کر لیا۔ بعض ماہرین کا دعویٰ ہے کہ تب کے پاکستانی حکمران، جنرل پرویز مشرف نے تن تنہا امریکی جنگ میں شمولیت کا فیصلہ کیا تھا۔ سچ یہ ہے کہ

اسامہ بن لادن افغانستان کے محاذ جنگ میں

پرائی جنگ میں شامل ہونے کا یہ فیصلہ پاکستان کے لیے انتہائی نقصان دہ ثابت ہوا۔ ڈالروں کی آمد سے پاکستانی معیشت کو عارضی طور پر سنبھالا ضرور ملا۔ عالمی سطح پر مشرف حکومت کی پوزیشن بھی مستحکم ہو گئی مگر اس فیصلے نے کئی منفی عوامل بھی جنم دے ڈالے۔

امریکا کے دباؤ پر مشرف حکومت نے مقبوضہ کشمیر میں ظالم و جابر بھارتی فوج سے نبرد آزما مجاہدین کی مالی و عسکری امداد روک دی۔ یہ ''یوٹرن'' لینے پر بعض فوجی افسر اور جوان مشرف حکومت سے ناراض ہو گئے۔ وہ پھر جنوبی وزیرستان جا پہنچے جہاں افغانستان سے آنے والے کئی عرب اور افغان جنگجو پناہ لے چکے تھے۔

۲۰۰۳ء کے بعد افغان طالبان منظم ہوئے اور افغانستان میں امریکی تنصیبات پر حملے کرنے لگے۔ ان طالبان کو وزیرستان میں مقیم پٹھانوں کی نہ صرف مدد حاصل تھی بلکہ انھوں نے قبائلی علاقوں میں اپنے اڈے بھی قائم کر لیے۔ تبھی امریکا نے پاک فوج پر دباؤ ڈالا کہ یہ اڈے تباہ کر دیے جائیں۔ یوں تاریخ پاکستان میں پہلی بار پاک فوج قبائلی علاقہ جات میں داخل ہو گئی۔

قبائلی بڑے آزاد و خود مختار لوگ ہیں۔ ماضی میں انھوں نے انگریزوں کو بھی ناک چنے چبوا دیے تھے۔ اب وہ پاک فوج کے خلاف نبرد آزما ہو گئے۔ گویا امریکی جنگ میں شمولیت اختیار کرنے کا دوسرا منفی نتیجہ یہ نکلا کہ پاک فوج کو اپنے ہی ہم وطنوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے پڑ گئے۔ آگے چل کر اس عمل کے بڑے بھیانک نتائج برآمد ہوئے۔

ہوا یہ کہ پاک فوج کے باغی افسر و جوان القاعدہ اور اس سے وابستہ جنگجو تنظیموں کا حصہ بن گئے۔ انھیں پاکستانی حکومت پر شدید غصہ تھا جو ان کے بقول امریکا کی کٹھ پتلی بن گئی تھی۔ مشرف حکومت نے بھی امریکی مفادات کو پورا کرنا اپنا وتیرہ بنا لیا۔ اس نے القاعدہ اور طالبان کے کئی راہنما

میجر جنرل فیصل علوی

گرفتار کر کے امریکیوں کے حوالے کر دیے جنہیں گوانتانامو کیمپ پہنچا دیا گیا۔

باغی افسروں میں میجر ہارون عاشق بھی شامل تھا۔ ۲۰۰۱ء سے قبل وہ پاک فوج کے کمانڈو دستے، ایس ایس جی (سپیشل سروسز گروپ) کا حصہ تھا۔ مگر مشرف حکومت نے امریکیوں سے دوستی کی، تو وہ فوج کو چھوڑ چھاڑ وزیرستان جنگجوؤں کے پاس چلا گیا۔ میجر ہارون عاشق پہلا شخص ہے جس نے انکشاف کیا کہ اسامہ بن لادن نے سابق وزیر اعظم پاکستان، بے نظیر بھٹو کو قتل کروایا ہے۔ اس قتل کی داستان بہت ڈرامائی اور سنسنی خیز ہے۔

میجر (ر) ہارون کا تعلق پاک فوج کے ان افسروں اور جوانوں سے تھا جو واقعہ نائن الیون کے بعد باغی ہو گئے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ مشرف حکومت نے امریکا سے ہاتھ ملا کر دین و وطن سے غداری کی ہے۔ انھی میں میجر (ر) ہارون کا بھائی، کیپٹن (ر) خرم بھی شامل تھے۔ پاکستان میں امریکا و یورپ سے نبرد آزما جنگجو انھیں اپنا ہیرو اور راہبر مانتے ہیں۔ ان دونوں کا تعلق ایس ایس جی سے تھا۔

پاک فوج سے علیحدگی کے بعد دونوں بھائی افغانستان جا کر جنگجوؤں کے ساتھ امریکی فوج سے بھی نبرد آزما ہوئے۔ ۲۰۰۷ء میں افغان صوبہ ہلمند میں کیپٹن (ر) خرم میدان

www.urdugem.com

جنگ میں ہلاک ہوگیا جبکہ میجر (ر) ہارون القاعدہ میں شامل ہوکر ترقی کی منازل طے کرنے لگا۔

جب سیکورٹی اداروں نے میجر (ر) ہارون عاشق سے پوچھ گچھ کی تو اس نے کئی انکشافات کیے۔ مثال کے طور پر یہ کہ نومبر ۲۰۰۸ء میں اسی نے ایس ایس جی کے سابق کمانڈو، میجر جنرل امیر فیصل علوی پر حملہ کر کے انھیں شہید کیا تھا۔ امیر فیصل علوی کی قیادت میں کمانڈوز نے انگور اڈہ، وزیرستان میں القاعدہ کے کئی جنگجوؤں کو مار ڈالا تھا۔ میجر (ر) ہارون اور القاعدہ کے دیگر راہنماؤں کو اس بات کا شدید رنج تھا۔ چناں چہ انھیں شہید کر کے بدلہ لے لیا گیا۔

جیسا کہ بتایا گیا، گرفتار ہونے تک میجر (ر) ہارون القاعدہ میں ایک اہم لیڈر بن چکا تھا۔ وہ واحد پاکستانی ہے جو القاعدہ کی مجلس شوریٰ کا رکن بنایا گیا۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ میجر (ر) ہارون ہی ہے جس نے ۲۰۰۳ء کے بعد القاعدہ کی تنظیم نو کی، اس کے مقامی ڈھانچے کو منظم کیا اور پاکستانی حکومت پر حملوں کی خاطر نت نئی چالیں وضع کیں۔ آمدن بڑھانے کے لیے اغوا برائے تاوان اسی کی ایجاد ہے۔

میجر (ر) ہارون نے تفتیش کاروں کو القاعدہ کے ایک ایسے اہم منصوبے کی بابت بھی بتایا جس میں اس نے حصّہ نہیں لیا تھا..... پاکستان کی سابق وزیراعظم، بے نظیر بھٹو کو قتل کرنے کا پلان!

مغرب کی پروردہ خاتون

یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ ۲۷ دسمبر ۲۰۰۷ء کو ایک خودکش حملہ آور نے پہلے گولیاں مار کے اور پھر دھماکے سے خود کو اڑا کر بے نظیر بھٹو کا کام تمام کر دیا تھا لیکن پچھلے نو برس سے مسلسل یہ قیاس آرائیاں جاری ہیں کہ انھیں مارنے کا حکم کس نے دیا؟ بعض لوگ جنرل مشرف کو مجرم گردانتے ہیں۔ دیگر لوگوں کا کہنا ہے کہ خاتون کو ان کے شوہر، آصف علی زرداری نے قتل کروایا۔ پاکستانی طالبان اور امریکی خفیہ ایجنسی، سی آئی اے بھی اس جرم کا مرتکب ٹھہرتی ہیں۔ غرض جتنے منہ اتنی ہی باتیں!

میجر (ر) اسحاق نے دوران تفتیش انکشاف کیا کہ القاعدہ لیڈر، اسامہ بن لادن نے بے نظیر بھٹو کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس فرمان کو البتہ پاکستانی طالبان نے عملی جامہ پہنایا۔ حالات و واقعات آشکارا کرتے ہیں کہ یہ اسامہ بن لادن ہی ہیں جن کے اشارے پر سابق پاکستانی وزیراعظم کی زندگی کا چراغ گل کر دیا گیا۔

بے نظیر بھٹو نے مغربی تعلیمی اداروں میں تعلیم و تربیت پائی تھی۔ اسی لیے جب والد کی پھانسی کے بعد انھوں نے

بے نظیر بھٹو جب آکسفورڈ میں زیر تعلیم تھیں

پیپلز پارٹی کی قیادت سنبھالی، تو وہ اردو بھی صحیح طرح نہیں بول سکتی تھیں۔ وہ مغربی تہذیب و ثقافت کی پروردہ تھیں اور انھوں نے بڑی کوشش و محنت سے اپنے آپ کو پاکستانی رہن سہن کے رنگ میں رنگا۔

الیکشن ۱۹۸۸ء جیت کر جب وہ اقتدار کے ایوانوں میں پہنچیں، تو فوج اور افسر شاہی، دونوں نے انھیں شک و شبے کی نظر سے دیکھا۔ انھیں ڈر تھا کہ وہ قومی سلامتی کے خفیہ امور خصوصاً امریکی حکمرانوں کو دے سکتی ہیں۔ یہ چرچا بھی سننے کو ملا کہ بے نظیر بھٹو حکومت سنبھال کر قومی ایٹمی منصوبہ معطل کر سکتی ہیں۔ مزید برآں وہ بھارت سے دوستی کرنے کی بھی خواہاں تھیں۔

اس وقت تک سویت یونین افغانستان میں پسپا ہو چکا تھا۔ چناں چہ وہاں سویت فوج سے برسرپیکار مجاہدین کی ہمت عروج پر تھی۔ انھی دنوں اسامہ بن لادن نے جہاد کو مقبوضہ کشمیر، فلسطین اور دیگر علاقوں تک پھیلانے کی خاطر القاعدہ قائم کر دی۔ اسامہ نے جہاد افغانستان کے دوران پاک فوج کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ چناں چہ پاک فوج کے بعض اعلیٰ افسران کے قریبی ساتھی بن گئے۔

جب مغرب کی پروردہ بے نظیر بھٹو وزیراعظم بنیں، تو اسامہ کو یہ تبدیلی ناگوار گزری۔ وہ بے نظیر کو امریکا کی کٹھ پتلی سمجھتے تھے۔ انھیں یقین تھا کہ بے نظیر حکومت مقبوضہ کشمیر میں جاری جہاد کی حمایت کرنے سے ہاتھ کھینچ لے گی۔ اسی لیے انھوں نے پاک فوج کے ہمنوا فوجی افسروں سے مل کر بے نظیر بھٹو کو گھر رخصت کرنے کا منصوبہ بنالیا۔

تاریخ پاکستان میں یہ منصوبہ "آپریشن مڈنائٹ جیکال" کہلاتا ہے۔ اس پلان کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ۱۹۸۹ء میں اسامہ نے اپنے پاکستانی عسکری ساتھیوں کو ایک کروڑ ڈالر فراہم کر دیے۔ یہ رقم پیپلز پارٹی کے ارکان اسمبلی میں تقسیم کی جانی تھی تاکہ وہ وزیراعظم بے نظیر کے خلاف تحریک عدم اعتماد لا سکیں۔

اس پلان کو آئی بی کے ڈائریکٹر جنرل، بریگیڈیئر امتیاز احمد عرف بلا نے عملی جامہ پہنانا تھا۔ مگر آئی ایس آئی میں موجود وزیراعظم کے وفادار ساتھیوں نے اس کی تفصیل بے نظیر بھٹو تک پہنچادی۔ چناں چہ بریگیڈیر امتیاز اور ان کے بھی ساتھی گرفتار کر لیے گئے۔ بریگیڈیر نے دعویٰ کیا کہ تب کے چیف آف آرمی سٹاف جنرل اسلم بیگ بھی پلان میں شامل تھے مگر وہ اس ضمن میں کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکا۔

آئی ایس آئی کے سابق افسر اور جہاد افغانستان کے دوران اسامہ بن لادن کے قریبی ساتھی، خالد خواجہ نے بعد ازاں تصدیق کی کہ "آپریشن مڈنائٹ جیکال" ایک حقیقت تھی۔ انھوں نے یہ بھی انکشاف کیا کہ تب میاں نواز شریف نے اسامہ کو یقین دلایا تھا کہ وہ وزیراعظم بن کر پاکستان میں شریعت نافذ کر دیں گے۔ پادر ہے، یہ وہی خالد خواجہ ہیں جنہیں مارچ ۲۰۱۰ء میں لشکر جھنگوی کے جنگجوؤں نے افغان جنگ میں آئی ایس آئی کے ایک اور مشہور افسر، کرنل امام کے ساتھ اغوا کر لیا تھا۔ ایک ماہ بعد میر علی (وزیرستان) میں خالد خواجہ مردہ حالت میں پائے گئے۔

بتایا جاتا ہے جب آپریشن مڈنائٹ جیکال کی تفصیل افشا ہوئی، تو بے نظیر بھٹو نے سعودی شاہ فہد سے رابطہ کر کے مطالبہ کیا کہ اسامہ بن لادن کو واپس سعودی عرب بلوا لیا جائے۔ دوسری صورت میں اسامہ کو گرفتار کرنے کی دھمکی دی گئی۔ وزیراعظم پاکستان کی ٹیلی فون کال کے بعد ہی اسامہ نے پاکستان کو خیرباد کہا اور افغانستان چلے گئے۔

لیکن اب اسامہ اور بے نظیر بھٹو ایک دوسرے کے دشمن بن گئے۔ چناں چہ آنے والے عشرے میں اسامہ مسلسل بے نظیر کو قتل کرنے کی کوششیں کرتے رہے۔ پہلی کوشش اگست ۱۹۹۳ء میں انجام پائی۔ اسے رمزی یوسف نے عملی جامہ پہنایا جو اسامہ کے ڈپٹی، خالد محمود شیخ کی

www.urdudigest.com

بہن کا بیٹا تھا۔ رمزی یوسف نے فروری ۱۹۹۳ء میں نیویارک امریکا میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر کار بم دھماکے سے اڑانے کی کوشش کی تھی مگر ناکام رہا۔ چناں چہ وہ امریکا سے فرار ہو کر پاکستان آ گیا۔

القاعدہ لیڈر نے پھر اُسے بے نظیر بھٹو کو قتل کرنے کی ذمے داری سونپ دی۔ پلان کی تشکیل میں مقامی جنگجو تنظیم، سپاہ صحابہ کے کارکنوں کی مدد شامل حال رہی۔ منصوبہ یہ تھا کہ بلاول ہاؤس، کراچی کے نزدیک ایک گٹر میں بم نصب کر دیا جائے۔ جب بے نظیر بھٹو کی گاڑی وہاں سے گزرتی، تو بم چلا دیا جاتا۔

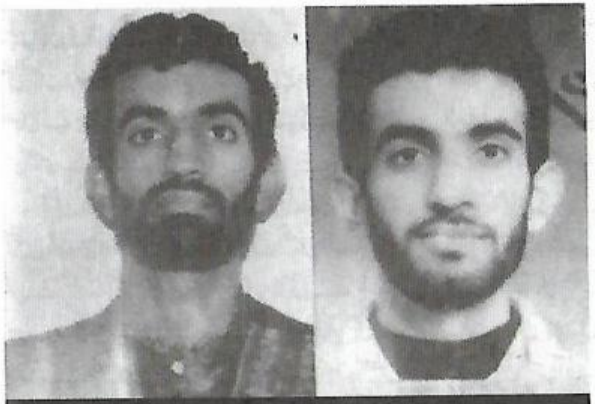

رمزی یوسف جو امریکی جیل میں قید ہے

جب رمزی یوسف اپنے ایک ساتھی کے ساتھ گٹر میں بم نصب کر رہا تھا تو اچانک ایک پولیس وین وہاں پہنچ گئی۔ پولیس افسر کے استفسار پر رمزی نے بتایا کہ وہ گٹر میں گری اپنی گھڑی تلاش کر رہا ہے۔ اس کی معصومیت دیکھ کر پولیس والوں کو رمزی کے کہے پر یقین آ گیا۔ ظاہر ہے، گھڑی نہ مل سکی اور رمزی کو اپنے ساتھی، عبدالحکیم کے ساتھ وہاں سے رخصت ہونا پڑا۔

رمزی نے گٹر میں بم نصب کر دیا تھا مگر وہ اُسے چالو نہ کر سکا۔ چناں چہ رات گئے وہ وہاں واپس پہنچا۔ تاریکی کے باعث غلط تاریں ملنے سے بم پھٹ گیا۔ رمزی شدید زخمی ہوا اور کئی دن جناح پوسٹ گریجوایٹ میڈیکل سینٹر، کراچی میں زیر علاج رہا۔ اس کا اندراج جعلی نام، آدم خان بلوچ سے کروایا گیا تھا۔

اگلے برس کراچی پولیس نے سپاہ صحابہ کے ایک جنگجو، عبدالشکور کو گرفتار کیا۔ اس نے دوران تفتیش درج بالا منصوبے کی تفصیل بیان کی اور بتایا کہ اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے منیر اکرم نے رقم فراہم کی تھی۔ منیر اکرم سعودی باشندہ تھا۔ وہ سعودی عرب سے آب زم زم منگوا کر پاکستان میں فروخت کرتا تھا۔

اسی سال رمزی اور اس کے ساتھیوں نے بے نظیر کو قتل کرنے کا دوسرا پلان بھی بنایا تھا۔ بے نظیر نے نشتر پارک، کراچی میں جلسہ کرنا تھا۔ طے پایا کہ ایک ''سنائپر'' نشتر پارک کے مقابل واقع عمارت میں بیٹھ جائے اور وہاں سے بے نظیر کو نشانہ بنائے۔ سپاہ صحابہ نے ایک سابق فوجی بہ طور سنائپر مہیا کر دیا۔ اس کو سکھر سے کراچی پہنچنا تھا مگر وہ بروقت نہ پہنچ سکا۔ چناں چہ یہ پلان بھی ادھورا رہ گیا۔ اس منصوبے کے لیے خالد محمود شیخ نے خصوصی رائفل فراہم کی تھی۔ رمزی یوسف آج کل امریکی جیل میں قید ہے۔

۱۹۹۵ء میں اسامہ بن لادن نے پاک فوج کے ہمنوا افسروں کی مدد سے پھر بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کرنا چاہی جو دوسری بار وزیر اعظم بن چکی تھیں۔ یہ پلان اسامہ کے نائب، قاری سیف اللہ اور میجر جنرل ظہیر اسلام عباسی نے مل کر بنایا۔ تاہم ملٹری انٹیلی جنس اس پلان کو طشت از بام کرنے میں کامیاب رہی۔ یوں وہ بھی کامیاب نہ ہو سکا۔

انتہائی نازک ۱۰ سیکنڈ جب قاتل بے نظیر بھٹو کے قریب آیا اور گولی چلا دی

آخری حملہ کامیاب رہا:

۱۸/ اکتوبر ۲۰۰۷ء کو بے نظیر بھٹو آٹھ سال بعد پاکستان پہنچیں۔ اس سے قبل اسامہ بن لادن پاکستانی طالبان اور دیگر جنگجو تنظیموں کو حکم دے چکے تھے کہ سرزمین پاکستان پر قدم دھرتے ہی بے نظیر بھٹو کا پتا صاف کر دیا جائے۔ چناں چہ متعلقہ تنظیمیں خودکش حملہ آور تیار کرنے کی منصوبہ بندی کرنے لگی تھیں۔

۱۸/ اکتوبر کو ہی جب بے نظیر بھٹو کا جلوس کراچی کے علاقے کارساز میں تھا، تو وہاں خودکش حملہ آور نے بم دھماکا کر دیا لیکن سابق پاکستانی وزیر اعظم اس بار بھی زندہ بچ گئیں۔ تاہم بم دھماکے کی زد میں آ کر ۱۸۰ پاکستانی اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

۲۷ دسمبر ۲۰۰۷ء کو بے نظیر بھٹو نے راولپنڈی میں جلسہ عام سے خطاب کیا۔ اختتام پر جب وہ واپس جا رہی تھیں، تو ایک جگہ ان کی گاڑی روک لی گئی۔ جب وہ چھتی کھڑکی کھول کر کھڑی ہوئیں، تو القاعدہ کے تیار کردہ خودکش حملہ آور، بلال نے پہلے ان پر ریوالور سے گولیاں چلائیں اور پھر خود کو دھماکے سے اڑا لیا۔ اس بار بے نظیر بھٹو بچ نہ سکیں اور دنیا سے رخصت ہو گئیں۔

پاکستانی سیکورٹی اداروں نے بے نظیر بھٹو کے قتل کی گہرائی و گیرائی میں جا کر تفتیش کی اور پورے منصوبے کو سامنے لانے میں کامیاب رہے۔ اس پلان پر عمل درآمد کا آغاز اسامہ بن لادن کے حکم سے ہوا۔ انھوں نے ہی اس منصوبے کے اخراجات پورے کرنے کے لیے رقم فراہم کی جس میں خوافراد نے سرگرم حصّہ لیا۔ یہ سبھی افراد جاسوسی اور جنگ و جدل کے فنون میں طاق تھے۔

راولپنڈی میں بے نظیر بھٹو پر حملے کا پلان مدرسہ دارالعلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک کے تین سابق طلبہ: نادر عرف قاری اسماعیل، نصر اللہ عرف احمد اور عبداللہ عرف صدام نے تیار کیا۔ اس کی تیاری میں انھیں القاعدہ کے سینئر راہنما، عباد الرحمٰن عرف فاروق چٹان کی مدد حاصل تھی۔ فاروق ہی نے انھیں بارودی جیکٹس فراہم کیں۔ جبکہ تینوں جنوبی وزیرستان گئے اور وہاں سے تین خودکش بمبار لے آئے۔

۲۷/ دسمبر کی اُس سہ پہر راولپنڈی کے لیاقت باغ میں ایک دو نہیں تین حملہ آور بے نظیر بھٹو پر نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ آخر ان میں سے بلال کو موقع مل گیا اور وہ اپنا کام کر گزرا۔ بقیہ حملہ آوروں کے نام اکرام اللہ اور عبداللہ عرف سعید لمبی گردن والا بتائے جاتے ہیں۔ یہ دونوں اب تک مفرور ہیں یا ممکن ہے کہ کسی خودکش حملے میں ہلاک ہو چکے ہوں۔

www.urdugem.com

القاعدہ پاکستان میں

جب وزیرستان میں پاک فوج نے القاعدہ کے کارکنوں پر حملہ کیا، تو انھیں پناہ دینے والے مقامی قبائل بھی اس لڑائی میں شامل ہو گئے۔ قبائلی علاقہ جات میں تب قبائل کے سرداروں کا راج تھا۔ یہ سردار روایتی طور پر پاکستانی حکومت کے حمایتی تھے۔ یہی وجہ ہے جس سردار نے القاعدہ سے تعاون نہیں کیا، اُسے قتل کر دیا گیا۔

القاعدہ نے چند ایک نہیں ۲۰۰۳ء اور ۲۰۰۴ء میں سینکڑوں قبائلی سردار قتل کر ڈالے۔ یوں قبائلی علاقہ جات میں صدیوں سے جو معاشرتی ڈھانچا چلا آ رہا تھا، اُسے تہ و بالا کر دیا۔ القاعدہ ان کی جگہ ایسے سردار سامنے لائی جو بہت لڑاکے اور حکومت پاکستان کے سخت مخالف تھے۔ انھی سرداروں نے پھر ''تحریک طالبان پاکستان'' کی بنیاد رکھی جس کا پہلا قائد بیت اللہ محسود تھا۔

قبائلی علاقہ جات میں مقیم عرب جنگجوؤں کی وجہ سے القاعدہ ان دشوار گزار پہاڑی علاقوں میں قدم جما سکی۔ حالیہ عرب جنگجو چھاپہ مار جنگ کے فنون پر کامل عبور رکھتے تھے۔ پھر جغرافیہ سے ہم آہنگ ہونے کی خاطر انھوں نے نئی جنگی ترکیبیں بھی ایجاد کیں۔ بم بنانے سے لے کر رقومات جمع کرنے تک القاعدہ کے جنگجو ہر کام میں ماہر تھے۔ انھی کی دانش اور عملی سرگرمیوں کے باعث تحریک طالبان پاکستان ایک طاقتور اور خطرناک جنگجو تنظیم بن گئی۔

۲۰۰۵ء میں القاعدہ کے فکری و مذہبی راہنما تحریک طالبان پاکستان کے قائدین کو یہ بات قائل کرنے میں کامیاب رہے کہ خودکش حملے دشمن کو کاری ضرب پہنچا سکتے ہیں۔ تاہم اس زمانے میں اسامہ بن لادن پاکستانی (مشرف) حکومت کے خلاف مسلح جدوجہد شروع کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ القاعدہ اور عالم اسلام کے تمام مجاہدین کا اصل دشمن اکلوتی سپر پاور امریکا ہے۔ لہٰذا القاعدہ کو تمام توانائیاں اس کے خلاف استعمال کرنی چاہئیں۔

مگر القاعدہ کے نائب امیر، ڈاکٹر ایمن الظواہری پاکستانی حکومت کے خلاف جنگ شروع کرنا چاہتے تھے۔ القاعدہ کی تاریخ لکھنے والے پاکستانی و غیر ملکی ماہرین لکھتے ہیں: ''اسامہ بن لادن اور ڈاکٹر الظواہری کے مابین بحث جاری تھی کہ الیاس کاشمیری بھی آخر الذکر کا ہمنوا ہو گیا۔''

الیاس کاشمیری مقبوضہ کشمیر میں بھارتی فوجیوں اور افغانستان میں سویت فوج سے پنجہ آزمائی کر چکا تھا۔ وہ گوریلا جنگ لڑنے کا ماہر تھا۔ جب مشرف حکومت نے مقبوضہ کشمیر میں برسرپیکار مجاہدین کی حمایت سے منہ موڑا، تو الیاس کاشمیری اس کا دشمن بن گیا۔ کاشمیری نے پھر جنرل پرویز مشرف پر قاتلانہ حملہ بھی کیا جو ناکام رہا۔

۲۰۰۳ء کے بعد الیاس کاشمیری وزیرستان پہنچا اور القاعدہ میں شامل ہو گیا۔ اس نے نئی تنظیم میں تیزی سے ترقی کی اور جلد اسامہ بن لادن کے نائبین میں شمار ہونے لگا۔

۲۰۰۵ء میں القاعدہ کے قائدین نے اس امر پر غور و فکر کی

الیاس کاشمیری جو دہشت کی علامت بن گیا

خاطر ایک اجلاس منعقد کیا کہ پاکستانی حکومت کے خلاف مسلح جدوجہد شروع کی جائے یا نہیں؟

اس اجلاس میں الیاس کاشمیری نے ڈاکٹر الظواہری کی ہم نوائی کرتے ہوئے زور دیا کہ پاکستانی حکومت پر حملے شروع کر دیے جائیں۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ پاکستانی سیکورٹی ادارے پھر قبائلی علاقہ جات میں القاعدہ کے خلاف بھرپور مہم نہیں چلا سکیں گے کیونکہ ان کی توجہ ہٹ جائے گی، لیکن اسامہ بن لادن نے بہ حیثیت امیر القاعدہ پاکستانی حکومت پر حملوں کی تجویز کو نامنظور کر دیا۔

جولائی ۲۰۰۷ء میں مشرف حکومت نے لال مسجد، اسلام آباد پر دھاوا بول دیا۔ القاعدہ اور تحریک طالبان سے وابستہ کئی طالب علم وہاں زیرتعلیم تھے جو ہلاک ہو گئے۔ ان کا بدلہ لینے کے لیے القاعدہ اور تحریک طالبان نے حکومت پاکستان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ یوں خصوصاً پاکستانی شہروں میں قتل و غارت کا ایسا بھیانک سلسلہ شروع ہوا جو ''ساٹھ ہزار'' سے زائد پاکستانیوں کی جانیں لے چکا۔ یہ سلسلہ اب بھی وقفے وقفے سے جاری ہے۔

اسامہ بن لادن نے اپنے ایک نائب، شیخ عبدالحمید کو پاکستان میں ''امیر خروج'' مقرر کیا تھا۔ مصر سے تعلق رکھنے والے شیخ عبدالحمید کا اصل نام ابوعبیدہ المصری تھا۔ میجر ہارون کے مطابق اسی نے بےنظیر بھٹو کے قتل کی ساری منصوبہ بندی کی تھی۔ اس پر عمل درآمد القاعدہ اور تحریک طالبان کے مقامی لیڈروں اور کارکنوں نے کیا۔

ابوعبیدہ المصری کی قیادت میں القاعدہ اور تحریک طالبان پاکستان کے جنگجوؤں نے پاکستانی شہروں میں آگ و خون کا کھیل شروع کر دیا۔ سپاہیوں اور فوجیوں سے لے کر مخالف علمائے کرام، ادیبوں اور دانش وروں تک..... کسی کو نہیں چھوڑا گیا۔ آخر ۲۰۰۸ء کے بعد پاک فوج قبائلی علاقہ جات میں جنگجوؤں کے خلاف وسیع پیمانے پر کارروائیاں کرنے لگی۔ یہ محدود سطح پر اب بھی جاری ہیں۔

یہ یقینی ہے کہ کسی مرحلے پر بھارتی خفیہ ایجنسی ''را'' اور افغان خفیہ ایجنسی کے ایجنٹ بھی خصوصاً تحریک طالبان پاکستان میں شامل ہو گئے۔ ان ایجنٹوں نے پھر پاکستان دشمن قوتوں کو سرمایہ اور اسلحہ فراہم کیا تاکہ وہ پاکستانی شہروں میں قتل عام جاری رکھ سکیں۔ اس طرح وطن عزیز کو نشانہ بنائے رکھنے والی خانہ جنگی میں ایک نیا عنصر شامل ہو گیا۔

جیسا کہ بتایا گیا، اس خانہ جنگی کی لپیٹ میں آ کر ''۶۰ ہزار'' پاکستانی جام شہادت نوش کر چکے جبکہ ملک و قوم کو تقریباً ''۱۲۰ ارب ڈالر'' کا نقصان اٹھانا پڑا۔ یہ تلخ حقائق دیکھتے ہوئے امریکی صدر ٹرمپ نے نجانے کیسے ''جرأت'' کر لی کہ ایک ٹویٹ کر کے دنیا بھر میں پاکستان کو رُسوا و بدنام کر سکیں؟

پچھلے اٹھارہ برس کی تاریخ پاکستان شاہد ہے کہ دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ میں فریق بن کر وطن عزیز کو ناقابل تلافی جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا۔ خودکش حملوں اور بم دھماکوں نے ہزارہا بچوں کو یتیم اور سینکڑوں خواتین کو بیوہ کر دیا۔ والدین اپنے شہزادے شہزادیوں سے محروم ہو گئے۔ معاشرے میں انتہا پسندی بڑھ گئی اور گروہوں کے مابین مذہبی و معاشرتی اختلاف بڑھنے سے نفرت میں بھی اضافہ ہوا۔ غرض ایک طرح سے پاکستانی معاشرے کا تار و پود کسی حد تک بکھر گیا۔

امریکا کا رفیق و مددگار بن کر پاکستان کو عسکری لحاظ سے کچھ فائدہ ضرور ہوا مگر نقصان کہیں بڑھ کر اٹھانا پڑا۔ اب تو ٹرمپ حکومت نے پاکستان کی عسکری امداد شرائط اور پابندیوں سے نتھی کر دی ہے۔

حکومت پاکستان اور پاکستانی قوم کو چاہیے کہ وہ ڈونلڈ ٹرمپ کی دھمکیوں اور لاف زنی کو مصیبت نہ سمجھے بلکہ رحمت خیال کرے۔ اب پاکستانی حکومت کے لیے سنہرا موقع ہے کہ وہ کاسۂ گدائی توڑ کر ایسے اقدامات کرنے لگے جو پاکستان کو اپنے پیروں پر کھڑا کر دے۔ پاکستان صرف اسی صورت دنیا کی ایک باوقار، خوددار اور خودمختار مملکت بن سکتا ہے۔

www.urdugem.com

گلزار

سن سیٹ بولیوارڈ

ایک اداکارہ کی دلدوز کتھا، وہ اپنے تابناک ماضی ہی میں سانس لے رہی تھی

پوسٹ مارٹم کے وقت بھی، وہ وزٹنگ کارڈ لاش کی مٹھی میں بھنچا ہوا تھا۔

اس روز بھی چاروجی معمول کے مطابق صبح ساڑھے پانچ بجے اٹھ گئی تھیں لیکن معمول سے تھوڑی سی زیادہ چست تھیں۔ صبح سیر کو جایا کرتی تھیں، ہمیشہ ہی اچھی طرح تیار ہوکر! بال، کنگھی، ہلکا سا غازہ تاکہ جلد پر عمر کی جھریاں ہوتے ہوئے بھی بڑھاپے کے مسام نظر نہ آئیں۔ پوشاک تو ہمیشہ ان کے ذوق اور سلیقے کا ثبوت دیتی تھی۔

شودت سے ہمیشہ کہا کرتی تھیں "دیکھو آج بھی لوگ ہمیں دیکھتے ہیں تو کن انکھیوں سے کھسر پھسر کرتے ہیں۔ اشارے کرتے ہیں کہ چارولتا جا رہی ہیں۔ خود کے لیے نہ سہی، اپنے پرستاروں کے لیے ہمیں صحیح سلیقے سے رہنا چاہیے۔"

شودت ان کا خانساماں تھا۔

اس روز صبح جب وہ چائے کی ٹرے لے کر ان کے سامنے گیا تو چاروجی آئینے کے سامنے کھڑی خود سے ہی کچھ بات کر رہی تھیں۔ ذرا سی جھینپ گئیں۔ شودت مسکرا دیا۔ اس عمر میں بھی میڈم کی شرمانے کی ادا کمال تھی۔ اس ادا نے تو جوانی میں لاکھوں پرستاروں کو جاں بحق کیا تھا۔

"شودت، کوئی گوپال داس مشرا آنے والے ہیں ہم سے ملنے! ذرا چائے ناشتے کا انتظام کر لینا۔"

"کون ہیں؟" ذرا تامل سے شودت نے پوچھا۔

"کوئی رائٹر ہیں۔ ہم پر کتاب لکھنا چاہتے ہیں۔ ان کا خط آیا تھا۔"

اس روز چاروجی کی چال میں خوشی کچھ زیادہ تھی۔ فلم انڈسٹری سے ریٹائر ہونے کے اتنے سال بعد کسی کو تو اس تنہا جان کا خیال آیا۔ شروع شروع میں بہت صحافی آیا کرتے

تھے۔ اس دور دراز کے بنگلے پر، مہابلیشور روز روز کون آتا ہے؟ چارولتا بھی بہت سال اپنے ایک "کم بیک" کی امید پر جیتی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ یہ آمد و رفت کم ہوگئی...... کچھ عمر رسیدہ کرداروں کے رول بھی پیش ہوئے انھیں، لیکن بوڑھوں کے کردار چاروجی نے منظور نہ کیے۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر، ٹھوڑی اونچی کرکے، اکثر دیکھا تھا خود کو! گردن پر کوئی سلوٹ نہیں! عمر کا کوئی نشان نظر نہ آیا!.. خود سے کچھ مکالمے بھی ہوئے۔ عکس نے کبھی نہ بتایا کہ "تمہاری عمر ہوگئی ہے" یہ عکس صرف فلموں میں بولتے ہیں۔

ہاں ڈاکٹر ساہنی نے ضرور کہا تھا، پہلے ہارٹ... ہارٹ پرابلم کے بعد! "دیکھو، تمہارا دل اب اتنا سب نہیں سہہ سکتا جتنا بوجھ اس پر ڈالتی ہو، کسی دن کھڑے کھڑے فیوز اڑ جائے گا"۔

"سنگھ صاحب ہوتے تو شاید.."

شودت نے خبر دی مشراجی آئے ہیں۔

"ایں؟... ہاں... مشراجی" انتظار کے باوجود چارولتا نام سن کر چونک گئیں۔ "بٹھاؤ...... نیچے ہال میں بٹھاؤ...... صوفوں سے غلاف اتار دیے نا؟"

"جی میڈم۔"

"فانوس روشن کر دیا؟"

"جی میڈم۔"

شودت اپنے فرائض خوب سمجھتا تھا۔ وہ آج بھی میڈم کی دھاک جما کر رکھتا تھا لوگوں پر کبھی کبھار کسی پرستار کا کوئی خط آجاتا تو وہ بازار میں دس جگہ ذکر کرتا۔

چاروجی نے ہار پہنتے پہنتے محسوس کیا کہ ان کی گردن کچھ دبلی ہوگئی ہے۔ گلو بند ہوتا تو یہ کمی چھپ جاتی لیکن اسے بیچے تو دو سال ہوئے۔ تین ہزار کا لیا تھا کسی زمانے میں، اب کا تیس ہزار کا، سنگھ صاحب ہوتے تو کبھی نہ بیچنے دیتے۔

چارولتا جب سیڑھیوں سے اتریں تو بالکل فلم کا کردار لگ رہی تھیں۔ ابھی آواز آئے گی "سٹارٹ...... ساؤنڈ...... کیمرا.."

"تشریف رکھیے"۔

مشراجی صوفے پر باادب بیٹھ گئے۔ بڑا اثر پڑتا تھا چاروجی کی شخصیت کا۔ بہت دیر تک مشراجی کے منہ سے کوئی بات نہ نکلی۔ بھلے سے شودت چائے کی ٹرے لے کر آ گیا۔ دو طشتریوں میں کچھ میٹھا، کچھ نمکین۔ چاروجی نے چائے بنائی۔

"میرا اپتا کہاں سے ملا؟"

"گوئیل صاحب نے دیا۔ آپ کے منیجر ہیں بمبئی میں۔"

"ہوں......! بہت اچھا انسان ہے گوئیل۔ بہت سال میرا کام سنبھالا ہے اس نے، اب بھی وہی دیکھ ریکھ کرتا ہے۔ چائے لیجیے...!"

پھر ایک وقفہ پڑتا ہوا بیچ سے گزر گیا۔ چاروجی خود ہی بولنے لگیں۔ "میں بہت تنہائی پسند ہوں۔ زیادہ کام کرنا کبھی پسند نہ تھا۔ اس وقت بھی زیادہ فلمیں نہیں کیں، جب دن رات پروڈیوسروں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ بس بھاگ کر یہیں آ چھپا کرتی تھی"۔

"میں آپ کا مکان دیکھ سکتا ہوں؟"

"ہاں، کیوں نہیں! تشریف لائیے۔"

چاروجی انھیں ساتھ لے کر سنگ مرمر کے بتوں کے پاس رک گئیں "اٹلی سے لائی تھی یہ جوڑی۔ بڑی مشکل ہوئی تھی اسے صحیح سلامت یہاں لانے میں! کئی سال تو میرے بمبئی والے مکان میں رہے۔ آپ نے تو وہ نہ دیکھا ہوگا؟"

"نہیں!" بڑا مختصر سا جواب تھا لیکن مسکراہٹ کافی لمبی تھی۔

برآمدے سے گزرتے ہوئے چاروجی نے بتایا "بڑے شوق سے یہ مکان بنوایا تھا ہم نے۔ سنگھ صاحب سے بڑے جھگڑے ہوا کرتے تھے، تب کبھی پتھر کے چناؤ پر

www.urdugem.com

کبھی لکڑی کے انتخاب میں۔ یہ ٹائلیں سنگھ صاحب بنگلور سے لائے تھے۔ مکان کا نام میں نے ایک انگریزی فلم سے لے کر رکھا تھا۔ سن سیٹ بلیوارڈ، اور یہ... یہ پنجرہ... جس میں کبھی کوئی پرندہ نہیں رکھا ہم نے، پتا نہیں کیوں اٹھا لائے تھے۔ ایک روز وہ...''

وہ زور زور سے ہنسنے لگیں جیسے کوئی سین کر رہی ہوں۔ ایک بار تو شودت نے بھی باہر جھانک کر دیکھا۔ اس طرح ہنستے تو کبھی نہیں دیکھا تھا میڈم کو۔ ہاں وہ زمانہ تھا، جب نور اور نیلا آجایا کرتی تھیں۔ ان کی ہم عصر ہیروئنیں!

چاروالتا سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کہہ رہی تھیں ''بس یہی کہتی مجھی کو قید کرلو اس پنجرے میں..... کہتے، تو پھر وہ بھی سنگ مرمر کا بنوانا پڑے گا۔ سنگ مرمر بہت پسند ہے مجھے، اس پر ننگے پیر چلتے ہوئے بہت اچھا لگتا ہے مجھے۔ سنگھ صاحب کو... یہ انھی کا پورٹریٹ ہے۔''

وہ قدم آدم تصویر تھی سنگھ صاحب کی، اوپر کے برآمدے میں لگی اور دونوں طرف شمعدان۔ شودت نے شمعیں جلادی تھیں۔ وہ جانتا تھا میڈم وہاں ضرور جائیں گی۔

چپ چاپ کچھ دیر وہ ایک ٹک سنگھ صاحب کے چہرے کو دیکھتی رہیں۔ پھر آہستہ سے دونوں لبریز آنکھیں پونچھیں اور سر جھکا کر مڑ گئیں۔

مشراجی پیچھے پیچھے چل رہے تھے اور وہ کہہ رہی تھیں۔ ''بڑی چھوٹی تھی ہماری شادی شدہ زندگی۔ صرف تین سال، چار مہینے اور اٹھارہ دن۔''

ایک بار پھر انھوں نے سسکی لی۔

شودت ہال سے ٹرے ہٹا چکا تھا۔

پان کے لیے ایک بار چاروجی نے آواز دی۔ جواب نہ پا کر سمجھ گئیں، باہر ہوگا باغ میں! یہ خاموشی کا وقفہ اب انھیں اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ مڑ کے مشراجی سے کہا ''آپ کو کچھ پوچھنا ہے؟''

''اس گھر کا رقبہ کتنا ہوگا؟''

چاروجی نے کچھ منجمد سی آنکھوں سے دیکھا مشراجی کی طرف...؟''

''اور بلڈاپ ایریا؟''

چاروجی کچھ بجھ سی گئیں۔ دھیرے سے کہا ''گوئیل کو معلوم ہوگا''۔

''کوئی بات نہیں۔ میں گوئیل صاحب سے معلوم کرلوں گا''۔ مشراجی کھڑے ہوگئے۔

چاروالتا بھی صوفے کے بازوؤں پر پورا زور دے کر کھڑی ہوگئیں اور پوچھا ''آپ کو گوئیل نے کس لیے بھیجا تھا؟''

''یہ مکان دیکھنے کے لیے کہا تھا۔ شاید جلدی بیچنا پڑے! دیکھ کے رکھو۔ کوئی گاہک تیار ہوجائے تو...''

''آپ کا نام؟'' چاروالتا نے بری ترشی سے پوچھا۔

''دھیرج مشرا! پراپرٹی بروکر ہوں، پراپرٹی بیچنے خریدنے کی دلالی کرتا ہوں...'' اس نے اپنا کارڈ سامنے کر دیا۔

اچانک ان کا چہرہ لال سرخ ہوگیا۔ ایک بار چلانا چاہا لیکن ضبط کرگئیں۔ گلے سے آواز نکلی، صرف ہاتھ کے جھٹکے سے اسے باہر جانے کا اشارہ کیا۔

بروکر نے صفائی دینے کی کوشش کی۔ ''دیکھیے گوئیل صاحب نے آپ سے بات کرنے سے منع کیا تھا۔ کہا تھا کہ شاید آپ کو...''

''گیٹ آؤٹ...'' اس مرتبہ چاروالتا چلائیں، لیکن آواز میں ایک خرخراہٹ سی آکے رہ گئی۔

بروکر گھبرا کے فوراً ہی چل دیا۔

کارڈ ہاتھ میں لیے چاروالتا اسے باہر جانے تک دیکھتی رہیں۔ مڑ کے سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے ہی وہ لڑکھڑائیں۔ دل کا دورہ پڑا اور...

پوسٹ مارٹم کے وقت بھی وہ زرٹنگ کارڈ لاش کی مٹھی میں بھنچا ہوا تھا!

جاوید چودھری

چار بڑے فیصلے

جنہوں نے برطانیہ میں انقلاب برپا کر دیا

ملکہ وکٹوریہ تاج برطانیہ کی ساتویں ملکہ تھی۔ یہ بیس جون ۱۸۳۷ء کو ملکہ بنی اور بائیس جنوری ۱۹۰۱ء تک ملکہ رہی۔ یہ اس لحاظ سے برطانیہ کی طویل المدت ملکہ تھی جو تریسٹھ سال سات ماہ اور دو دن مسند اقتدار پر جلوہ افروز رہی۔

وکٹوریہ کے دور میں انگریز سلطنت میں حقیقتاً سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ کرّہ ارض پر سورج کی پہلی کرن نیوزی لینڈ میں پڑتی ہے نیوزی لینڈ برطانوی سلطنت کا حصہ تھا۔ سورج نیوزی لینڈ کے بعد جوں جوں آگے بڑھتا تھا اس کے راستے میں آنے والے تمام ملک تمام زمینوں پر برطانیہ کا یونین جیک لہراتا تھا۔ سورج جب تھک کر آنکھیں موندنے لگتا تو نیوزی لینڈ میں دن کا آغاز ہوجاتا تھا۔ ملکہ وکٹوریہ کے عہد میں برطانوی سلطنت پر سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔

ملکہ وکٹوریہ نے دنیا کو بے شمار نئی چیزیں اور نئی روایات بھی دیں۔ یہ روایات اور چیزیں آج تک موجود ہیں۔ مثلاً دنیا میں آج بھی وکٹورین طرز تعمیر موجود ہے۔ وکٹورین فرنیچر بھی آج تک بنایا جاتا ہے۔ ملکہ وکٹوریہ جس طرز کی بگھی استعمال کرتی تھی، وہ بعد ازاں پوری سلطنت میں عوامی سواری بنی اور وکٹوریہ کہلائی۔ اس کو وکٹوریہ تانگہ بھی کہا گیا۔ برطانیہ میں بہادری کا سب سے بڑا اعزاز آج بھی وکٹوریہ کراس کہلاتا ہے۔

دنیا میں پروٹوکول کا جدید نظام بھی ملکہ وکٹوریہ نے وضع کیا تھا۔ ملکہ نے وی آئی پی اور وی وی آئی پی کے باقاعدہ درجے بنائے تھے۔ اس کی پوری سلطنت میں لوگوں کو انھی کے تحت سرکاری پروٹوکول دیا جاتا تھا۔ انگریز دور میں تحصیل کی سطح پر کرسی نشین اور سفید پوش، دو اعزازی عہدے ہوتے تھے۔ کرسی نشین کا ٹائیٹل گاؤں کے اس شخص کو ملتا تھا جو انگریز کو گھوڑے فوجی اور مخبری دیتا تھا۔ کرسی نشین کو سرکاری دفاتر میں سرکاری افسروں کے سامنے کرسی پر بیٹھنے کی اجازت ہوتی تھی جب کہ باقی لوگ زمین پر بیٹھتے تھے یا زیادہ سے زیادہ افسر کے سامنے کھڑے ہوجاتے۔

سفید پوش وہ معزز لوگ ہوتے تھے جنھیں سرکار ان کی وفاداریوں سے خوش ہوکر ہر سال سفید رنگ کے دو جوڑے عنایت کرتی تھی۔ وہ یہ کپڑے پہن کر سرکاری دفتروں میں جاتے تھے۔ سرکاری پروٹوکول سفید پوشوں اور کرسی نشینوں سے شروع ہوتا تھا اور ملکہ تک جاتا تھا۔ اس دور میں سرکار نمبر دار، کانسٹیبل اور پٹواری سے شروع ہوتی اور وائسرائے تک جاتی تھی۔ یہ وائسرائے ملکہ کے گورے غلام ہوتے تھے۔

www.urdugem.com

ان لوگوں کو کیا کیا پروٹوکول حاصل تھا، یہ تمام معلومات ایک سرکاری ڈائری میں درج ہوتی تھیں۔

یہ ڈائری بلیو بک کہلاتی تھی۔ یہ بلیو بک ڈپٹی کمشنر کے قبضے میں رہتی تھی وہ اسے سرکاری تجوری میں رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی شخص اس ڈائری کو ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا۔

ڈپٹی کمشنر تبادلے کے بعد اس وقت تک چارج نہیں چھوڑ سکتا تھا جب تک وہ بلیو بک نئے ڈپٹی کمشنر کے حوالے نہیں کر دیتا تھا۔ ملکہ کا ایک حکم سلطنت کی بلیو بک بدل دیتا تھا ملک کے تمام معززین ذلیل ہو جاتے تھے اور ذلیلوں کو درجے مل جاتے تھے۔

ملکہ وکٹوریہ نے جون ۱۸۸۷ء میں اپنی تاج پوشی کی گولڈن جوبلی منائی جس کی تقریبات پوری سلطنت میں منائی گئیں۔ ان تقریبات میں دو اہم ترین چیزیں شامل تھیں۔ اول یہ کہ ملکہ نے اپنی سلطنت کے تمام بڑے شہروں میں اپنے نام کی یادگاریں بنوائیں۔ یہ یادگاریں آج بھی برطانوی راج کے تمام بڑے شہروں میں موجود ہیں۔ کراچی کی ایمپریس مارکیٹ ملکہ وکٹوریہ کی اسی گولڈن جوبلی کے موقع پر تعمیر ہوئی تھی۔

دوم لندن سے ہندوستان تک ملکہ کے نام سے جوبلی مشعل نکلی۔ اس مشعل نے ملکہ کی پوری سلطنت کا چکر لگایا۔ یہ مختلف ملکوں اور علاقوں سے ہوتی ہوئی ہندوستان پہنچی۔ مشعل ہندوستان کے جس بھی ضلع میں آتی۔ وہاں کے لوگ ڈھول تاشوں سے اس کا استقبال کرتے۔ آتش بازی کا مظاہرہ ہوتا۔ گانے گائے جاتے اور ناچ پیش کیے جاتے۔ یہ مشعل اس عالم میں پورے ضلع کا چکر لگاتی۔

مشعل کا چکر مکمل ہونے کے بعد ڈپٹی کمشنر ضلع کی سرحد پر پہنچ کر مشعل دوسرے ضلع کے ڈپٹی کمشنر کے حوالے کر دیتا۔ مشعل کا اگلا سفر شروع ہو جاتا۔ یہ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے ہوتی ہوئی پنجاب پہنچی۔ پنجاب حکومت نے جوبلی کے نام سے ایک طویل پنجابی گانا تیار کروایا۔ یہ گانا قصور کے دو بھائیوں نے تیار کیا تھا جو ان پڑھ تھے۔ جوبلی کا لفظ ان کے منہ پر نہیں چڑھتا تھا چنانچہ انھوں نے جوبلی کو (جگنی) بنا دیا۔ ان نامعلوم فنکاروں نے اس جگنی (جوبلی) میں پنجاب کے تمام علاقوں کی ثقافت بیان کی۔

جگنی گئی ملتان... یعنی جوبلی کی مشعل ملتان چلی گئی۔ جگنی گئی گجرات..... وغیرہ وغیرہ۔ یہ جگنی اس دور میں پورے ہندوستان میں مشہور ہو گئی۔ ملکہ وکٹوریہ کو مرے ہوئے ایک سو تیرہ سال ہو چکے لیکن اس کی جگنی آج تک ہندوستانی پنجاب اور پاکستانی پنجاب دونوں میں زندہ ہے۔

دنیا سے صرف ملکہ وکٹوریہ رخصت نہیں ہوئی بلکہ اس کی سلطنت بھی آہستہ آہستہ بند مٹھی کی ریت کی طرح زمین پر بکھر گئی۔ آج برطانیہ صرف ایک جزیرے تک محدود ہو چکا۔

اب سوال یہ ہے دنیا کی اتنی بڑی سلطنت ختم کیسے ہو گئی؟ وہ برطانیہ جس کی ملکہ کی مشعل تریسٹھ ممالک میں گھمائی گئی تھی۔ وہ برطانیہ آج صرف دو لاکھ تینتالیس ہزار چھ سو دس مربع کلومیٹر تک محدود ہو کر کیوں رہ گیا؟

اس زوال کی بے شمار وجوہ میں سے ایک وجہ گوروں کی بلیو بک اور پروٹوکول بھی تھا۔ گوروں نے انسان کو اسٹیٹس کی لاتعداد ٹکٹکیوں پر لٹکا دیا تھا۔ بادشاہ اور ملکہ سے پروٹوکول شروع ہوتا اور وائسرائے تک آتا تھا۔ وائسرائے سے اس کی کونسل کے ارکان تک جاتا تھا۔ وہاں سے سر کے خطاب حاصل کرنے والے لوگوں تک آتا اور وہاں سے ہوتے ہوئے سفید پوشوں اور کرسی نشینوں تک جاتا تھا۔

یہ جس شخص کو وفاداری اور حب الوطنی کا پروانہ جاری کرتے تھے صرف وہی شخص وفادار اور حب الوطن ہوتا تھا باقی تمام مشکوک سمجھے جاتے۔ انھیں اس شک کی بنیاد پر کسی بھی وقت گرفتار کیا جا سکتا تھا۔ گولی ماری جا سکتی تھی۔ سرکار کے ظلم کی حالت یہ تھی کہ بریگیڈیئر جنرل ڈائر نے تیرہ اپریل ۱۹۱۹ء کو امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں گولی چلا کر ۳۷۰ لوگ قتل کر دیے اور کوئی شخص اس کا ہاتھ نہ روک سکا۔ کیوں؟ کیونکہ جنرل ڈائر کو ملکہ کے عنایت کردہ اختیارات کے مطابق گولی چلانے کا اختیار حاصل تھا، چنانچہ اس نے یہ اختیار استعمال کیا اور سرکار نے عوامی ردعمل کے بعد جنرل ڈائر کو بطور سزا سند واپس بھجوا دیا۔ یہ سزا ۳۷۰ لوگوں کے قتل کی سزا تھی۔

یہ وہ پروٹوکول اور بے لگام اختیارات تھے جنہوں نے برطانیہ کے نہ ڈوبنے والے سورج کو تاریخ کے سیاہ سمندر میں ڈبکی دے کر ڈبو دیا۔ برطانیہ نے تاریخ کے اس خوفناک زوال کے بعد چار بڑے فیصلے کیے۔

پہلا فیصلہ پروٹوکول کا خاتمہ تھا۔ برطانیہ نے لوگوں کے درجے ختم کر دیے۔ آج برطانیہ میں شاہی خاندان موجود ہے، لیکن ان کی شہنشاہیت صرف محل تک محدود ہے۔ یہ لوگ جوں ہی محل سے باہر آتے ہیں، عام برطانوی لوگوں اور ان میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ انھیں بھی سڑک پر روکا جاتا اور ان کا بھی چالان ہوتا ہے۔ انھیں بھی عدالت میں پیش ہونا پڑتا ہے۔ وزیراعظم اور وزراء بھی عام شہریوں کی طرح سڑکوں پر پھرتے ہیں۔

یہ عام ٹرینوں اور بسوں میں سفر کرتے ہیں۔ عام جہازوں کی اکانومی کلاس میں سوار ہوتے ہیں۔ برطانیہ کے وزرائے اعظم ۲۸۲ سال سے تین بیڈ روم کے گھر ٹین ڈاؤننگ اسٹریٹ میں رہ رہے ہیں۔ ملک کے کسی وزیراعظم کو ۲۸۲ برس سے کوئی بڑی رہائش گاہ نصیب نہیں ہوئی۔ شاہی خاندان کے پاس درجنوں محلات تھے۔ ہر محل کے اندر ہزار ہزار ایکڑ کا باغ تھا لیکن پھر یہ تمام باغ عوامی پارک بنا دیے گئے۔ اسی فیصد محلات بھی آج میوزیم ہیں اور سیاح روزانہ ان کی سیر کرتے ہیں۔ ملک میں آرمی چیف ہو پولیس چیف یا چیف جسٹس، کسی کو کوئی پروٹوکول حاصل نہیں۔ یہ لوگ اپنے دفاتر کے باہر عام شہری ہیں۔

دوسرا فیصلہ قانون کی حکمرانی تھا۔ برطانیہ میں کوئی شخص قانون سے مضبوط اور بالاتر نہیں۔ برطانیہ نے فیصلہ کیا کہ ملک میں قانون مضبوط ہو گا اور کوئی عہدہ یا کوئی شخصیت اس سے بالاتر نہیں ہو گی۔

تیسرا فیصلہ جمہوریت تھا۔ ملک کے تمام اختیارات کا ماخذ عوام ہیں۔ عوام پارٹی یا شخصیت کو مینڈیٹ دیتے ہیں اور کسی شخص یا عہدیدار کو یہ مینڈیٹ چوری کرنے کا حق نہیں۔ ملک میں جعلی ووٹ یا دھاندلی کا سوال تک پیدا نہیں ہوتا۔ برطانیہ میں پچھلے سو سال میں الیکشن دھاندلی کا کوئی الزام نہیں لگا۔

چوتھا اور آخری فیصلہ لیڈر شپ کا تھا۔ یہ لوگ صرف اس شخص کو حق حکمرانی دیتے ہیں جو ذہنی، تعلیمی، اخلاقی اور جسمانی لحاظ سے شاندار ہوتا ہے۔ ان کے کسی سیاستدان پر ذاتی ضد یا ہٹ دھرمی، نقل، جعلی ڈگری یا بے ایمانی، چوری، ٹیکس چوری، جھوٹ یا کسی بڑی بیماری کا الزام لگ جائے تو اس کا سیاسی کیریئر ختم ہو جاتا ہے۔ وہ سیاست کے ایوانوں سے فارغ ہو جاتا ہے۔

یہ وہ چار فیصلے ہیں جن کی وجہ سے تاج برطانیہ صرف برطانیہ بننے کے باوجود دنیا کی پانچویں بڑی طاقت ہے اور دنیا بھر کے حکمران برطانیہ کے وزیراعظم اور ملکہ سے ہاتھ ملانا اعزاز سمجھتے ہیں۔

میں نے اکثر اپنے ملک کے مختلف ادوار کے وزرائے اعظم، صدور و وزراء کو ٹین ڈاؤننگ اسٹریٹ میں برطانوی وزیراعظم کے گھر کے دروازے پر کھڑا دیکھا۔ برطانوی وزیراعظم نے باہر نکل کر اسے استقبال کیا۔ اپنے ہاتھ سے دروازہ کھولا اور ہمارے وزیراعظم کو اندر لے کر گئے۔ کیا ہمارے وزیراعظم نے اس منظر سے کچھ سیکھا؟ میرا خیال ہے نہیں سیکھا ہو گا کیونکہ ہمارے کسی حکمران نے آج تک ان مناظر سے کچھ نہیں سیکھا۔ یہ لوگ سیکھ سکتے تو آج ملک کی یہ حالت نہ ہوتی۔

یہ لوگ آج بھی جگنی کے اس پروٹوکول سے باہر نہیں آئے جس کو برطانیہ نے دوسری جنگ عظیم کے بعد مکمل طور پر ترک کر دیا تھا۔ ہمارے ملک میں آج بھی کرسی نشین اور سفید پوش موجود ہیں۔ پوری ریاست انھیں سیلوٹ کرتی ہے۔ یہ لوگ جب تک سسٹم کا حصہ رہیں گے ہم اس وقت تک زوال کے عذاب سے نہیں نکل سکیں گے۔

(بدلنا صرف سیاستدانوں ہی کو نہیں، بلکہ ہمیں بھی اپنی سوچ بدلنی ہے)۔

www.urdugem.com

سونے کا ہار

احمد ندیم قاسمی

وہ برادری کے سامنے سُرخرو ہونا چاہتا تھا
مگر ایک تباہ کن جواب نے
اس کی دنیا اندھیر کر ڈالی

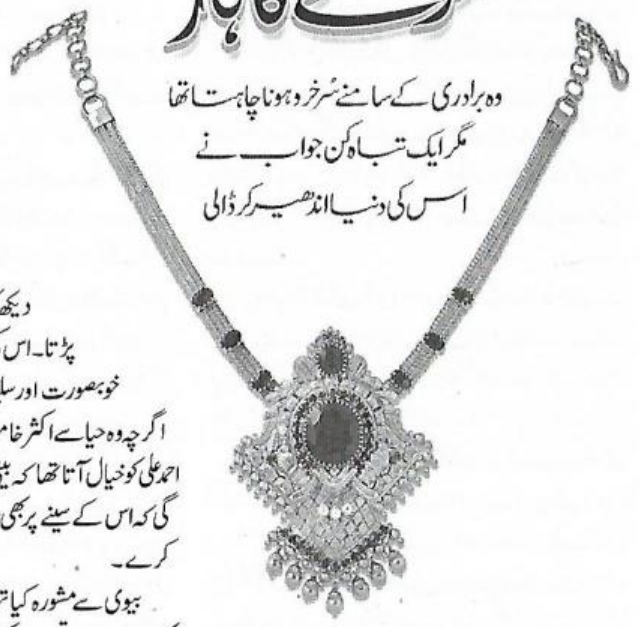

برادری میں عمر بھر شرم کے مارے آنکھیں جھکائے رکھنا بہت بڑا عذاب ہے۔ احمد علی کو اس کا شدت سے احساس تھا اور اس لیے وہ دن رات اس فکر میں رہتا تھا کہ اپنی اکلوتی بیٹی کو شادی کے وقت ایک ایسا ہار جہیز میں دے کہ شریکوں کی آنکھیں چندھیا جائیں اور ندامت سے گردنیں جھکنے لگیں۔ تین بیگھے زمین تھی اور اس کے بھی اکثر حصے ریتلے۔ ساری عمر کوڑی کوڑی جمع کرتا رہا، تو کپڑے اور چاندی کے زیور خریدے۔ اب اسے سونے کے ہار کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ ہار پر تقریباً اڑھائی تین سو روپے خرچ آتے تھے اور جب ہار کے متعلق سوچتے سوچتے اس کی نظر اپنی خفیہ پوٹلی پر جا پڑتی جس میں اب ایک پیسہ بھی باقی نہ تھا تو اس کے چہرے پر اس قدر پسینہ پھوٹ نکلتا کہ بیوی کو اس کی صحت کی فکر پڑ جاتی۔

محلے کی بیاہی ہوئی نوجوان لڑکیوں کے گلے میں سنہرے ہار دیکھ کر اس کا دل بے اختیار اچھل پڑتا۔ اس کی بیٹی ان سب لڑکیوں سے خوبصورت اور سلیقہ شعار تھی۔ وہ حساس بھی تھی۔ اگرچہ وہ حیا سے اکثر خاموش اور گھٹی گھٹی سی رہتی تھی، تاہم احمد علی کو خیال آتا تھا کہ بیٹی کے دل میں یہ آرزو یقیناً موجود ہو گی کہ اس کے سینے پر بھی سونے کا ایک بڑھیا ہار لش پش کرے۔

بیوی سے مشورہ کیا تو وہ بولی "یہ خیال میرے دل میں بھی موجود تھا، پر تم سے کہتے ہوئے ڈرتی تھی کہ اتنی رقم کہاں سے آئے گی؟ بہتر تو یہ ہے کہ زمین بیچ ڈالو۔ ہم اب بوڑھے ہو چکے، بہت سی گزار دی، تھوڑی سی رہ گئی ہے، محنت مزدوری کر کے یہ بھی کاٹ لیں گے۔ بیٹی ابھی جوان ہے۔ اس نے جی بھر کے دنیا بھی نہیں دیکھی۔ اس کے گلے میں ہار نہ ہوا تو یہ سمجھو عمر بھر اسے سہیلیوں میں نکو بن کر رہنا پڑے گا۔ پڑوس کی نئی دلہن دیکھی ہے تم نے؟ مینڈک جیسی ناک اور چھاج جیسے کان، سیاہ رنگ جیسے توے کی کالک مل رکھی ہے اور پھر اس کی چھاتی پر بھی سونے کا آدھ گز لمبا ہار چمک رہا ہے۔ ہار ضرور خریدنا ورنہ ناک کٹ جائے گی۔ اولاد کے لیے فاقے کاٹنا بھی عبادت ہے"۔

احمد علی گھر سے نکل کر باہر چلا گیا۔ دیر تک ایک چٹان پر بیٹھ کر سوچتا رہا کہ جس زمین پر میں نے چالیس برس ہل چلایا، جس کے سہارے میں اب تک زندہ ہوں اور جس کے دم سے گاؤں والوں میں تھوڑی بہت ساکھ قائم ہے، وہ کسی غیر کے ہاتھ میں دے دوں اور خود بھوکے کتے کی طرح الگ بیٹھ کر آنکھیں جھپکا تا رہوں! اپنے پاؤں پر آپ ہی کلہاڑی مارنا اسی کو تو کہتے ہیں لیکن خاندانی عزت بھی تو کوئی چیز ہے۔ ساٹھ سال کی عمر ہے، جانے کب یہاں سے چل دوں۔ بیٹا تو کوئی ہے نہیں کہ زمینیں سنبھالے۔ وارثوں کے کام آئیں گی، جو ابھی سے میری ذرا سی بیماری کو بھی مرض الموت سمجھنے لگتے ہیں۔ کیوں نہ اس سے فائدہ اٹھاؤں، ایک نقصان میں ہزار فائدے چھپے ہوئے ہوں تو نقصان کو نقصان کہنا بد دیانتی ہے۔ میں تو برباد ہو جاؤں گا، پر میری بیٹی تو سکھی رہے گی اور اس کے سکھ کے مقابلہ میں میرا دکھ ہے ہی کیا چیز!

وہ وہاں سے اٹھا۔ شام ہو گئی تھی۔ کالے کالے پربتوں کے پیچھے سے چاند آہستہ آہستہ بلند ہو رہا تھا اور چوٹیوں پر درختوں کے سائے جیسے آسمان سے معلق ہو کر رہ گئے تھے۔

احمد علی گھر واپس چلا آیا۔ بیوی دیے کی روشنی میں بیٹھی چرخہ کات رہی تھی۔ کہنے لگی۔ "تم سوچ کیا رہے ہو۔ خیر تو ہے؟"

"مجھے تو ہار کی الجھن نے بیمار کر دیا ہے!"

"زمینیں بیچ ڈالو۔ سو بات کی ایک بات کہی تھی میں نے!"

"مگر اپنا پیٹ کیسے بھرے گا؟"

"اپنا پیٹ کاٹ کر ہی اولاد کا پیٹ بھرنا پڑتا ہے۔ جلدی جلدی کوئی خریدار ڈھونڈ نکالو۔ میں اپنی لاڈلی بیٹی کو بن ہار کے دیکھوں تو میری آنکھیں پھوٹ جائیں۔ سہاگن کے سینے پر ہار نہ چمکے تو مجھے تو اللہ قسم رونا آ جاتا ہے!"

احمد علی بہت دیر تک چارپائی پر آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا۔ بیوی کے خراٹوں سے تنگ آ کر لیٹ جاتا تو اپنی بیٹی کے، خواب میں کوئی بے معنی سا نغمہ گنگنانے سے پھر اٹھ بیٹھتا۔ چارپائی سے اتر کر چلنے پھرنے کو جی چاہا۔ باہر مہاوٹیں پڑ رہی تھیں اور اندر ٹہلنے کی جگہ نہ تھی۔ کسی وقت آنکھ لگی، مگر یہی دو چار لمحے، جیسے کسی نے دل میں سوئی چبھو دی۔

کانپ کر سر اٹھایا۔ دروازے کی طرف دیکھا کہ شاید باہر پو پھوٹنے کے آثار ہوں۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ اس کے سرہانے غلے کی بوریوں کے پاس ایک ٹڈی اپنا کرخت نغمہ الاپ رہی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ نغمہ اس کے دماغ میں تیز نشتر کی طرح تیرتا جا رہا ہے۔ اس نے گھبرا کر بوریوں کے قریب زور سے تالی بجائی۔ ٹڈی خاموش ہو گئی اور وہ اپنے سوئے ہوئے بازو پر دکھتا ہوا سر رکھ کر اسی بے نتیجہ سوچ میں غرق ہو گیا۔

انسانی دل دھڑکتا نہیں، ہر لمحے نئے ارادے تخلیق کرتا ہے۔ کئی ارادے پیدا ہوتے ہی رد کر دیے جاتے ہیں اور کئی اتنے بڑے ہو جاتے ہیں... اتنے بڑے کہ دل کی سی محدود چار دیواری میں نہیں سما سکتے! کسی نہ کسی طریقے سے باہر نکل پڑنے کے لیے بے تاب ہو جاتے ہیں اور اگر یہ ارادے بھی آخر کار رد ہو جائیں، تو دل اس ساغر کی طرح بے رونق ہو جاتا ہے، جس میں سے شراب انڈیل لی گئی ہو۔

احمد علی کا ارادہ اگا، بڑھا، کونپلیں پھوٹیں، کونپلیں شاخوں میں تبدیل ہو گئیں۔ شاخیں پتوں کے بوجھ سے زمین پر جھک گئیں اور انھوں نے زمین میں اپنی جڑیں اتار کر مختلف درختوں کی صورتیں اختیار کر لیں۔ احمد علی کو اپنا ارادہ گاؤں کے پنگھٹ کے کنارے اگے ہوئے بڑ کی طرح نظر آنے لگا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر بوریوں کو چھوا۔ "میری

www.urdugem.com

زمین کی دولت!'' پھر اپنی بیٹی کی چارپائی کو چھوا۔ ''میری زندگی کا واحد سہارا!'' اب وہ مزے سے سو رہا تھا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو سورج نیزہ بھر اُبھر چکا تھا۔ اس کی بیوی باہر دھوپ میں دودھ بلو کر مکھن نکال رہی تھی اور بیٹی چھاج میں غلہ پھٹک رہی تھی۔ پڑوس میں ڈگڈگی بجنے کی آواز آرہی تھی۔

وہ چارپائی پر اٹھ بیٹھا۔ ڈگڈگی والا اسی کے گھر آرہا تھا اور اس کے پیچھے ایک بندر یا جھومتی جھامتی آرہی تھی۔

''تیرا گھر آباد، تیرے دشمن برباد، تیرے بچے کی خیر، اپنے پیر کے صدقے، بوڑھی بندر یا کو کچھ کھلا دے۔ لے مائی اپنے بچے کا نام بتا۔ بندر یا تیرے بچے کی شادی پر ناچنا چاہتی ہے!''

احمد علی کی بیوی بولی۔ ''میرا لڑکا کوئی نہیں بابا!''

''تیری لڑکی جیے، تو اپنی آنکھوں سے اس کو سہاگن دیکھے، تو اپنے ہاتھوں سے اس کے گلے میں سونے کا ہار ڈالے!''

چھاج پھٹکنے کی آواز بند ہوگئی! مکھن نکالنے کی آواز بند ہوگئی۔ احمد علی کے دل کے دھڑکنے کی آواز بند ہوگئی!

ڈگڈگی والا سوچنے لگا کہ اس کے منہ سے کون سا ایسا نازیبا کلمہ نکلا کہ گھر کا گھر دم بخود ہو کر رہ گیا! بندر یا کی دم کے بال بھی کھڑے ہو گئے۔

دنیا کے بڑے بڑے واقعات اور ان ذرا ذرا سے حادثات میں آخر فرق ہی کیا ہے۔ یہ ننھا سا واقعہ احمد علی اور اس کی بیوی کے لیے کتنا عظیم الشان واقعہ تھا..... زندگی کی ساری تمناؤں کی معراج.....! واقعات کی عظمت دلوں کی دھڑکن سے پہچانی جاتی ہے۔ جب نپولین برفانی چوٹیوں کو روندتا ہوا ان کی دشوار گزاری پر مسکراتا ہوا آگے بڑھا جا رہا تھا تو کیا اس کے دل کی دھڑکن احمد علی کے دل کی دھڑکن سے زیادہ تیز ہوگی؟

احمد علی نے اپنی پگڑی اتار کر ڈگڈگی والے کو دے دی۔

من کی بات بوجھ کر دعا دینے والے فقیروں کو انسان جو بھی دے کم ہے۔

☆☆☆☆☆

احمد علی نے ایک میلا سا پٹکا سر کے گرد لپیٹا اور باہر جانے لگا۔ بیوی نے اسے چھاچھ پینے کو کہا اور بولی۔ ''آج تو خوب سوئے!''

شاید اس نے شوہر کے بستر کی شکنیں نہیں دیکھی تھی۔ احمد علی نے کہا۔ ''جانے آج کیوں ایسی گہری نیند آئی؟ چھاچھ جلدی لے آ مجھے بڑے ضروری کام پر جانا ہے۔''

''بڑا ضروری کام!''

اس کی بیوی کا ہاتھ کانپ گیا۔ وہ جانتی تھی کہ بڑا ضروری کام کون سا ہے؟ آپ سے آپ اس کی نظر اپنی بیٹی کے سینے پر جا پڑی، جو موٹی سی نیلی چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس نیلے پردے کو چیر کر اس کی نگاہیں ایک سنہرا ہار دیکھنے لگیں، جس کے وسطی حصے میں سرخ رنگ کا ایک نگینہ مسکرا رہا تھا۔ پڑوس کی نئی دلہن کے ہار کی طرح!

احمد علی چھاچھ پی کر ذیلدار کے گھر گیا۔ وہ ڈیوڑھی کے باہر دھوپ میں بیٹھا چیچوان کے کش لگا رہا تھا۔ احمد علی کو اتنا سویرے آتا دیکھ کر بولا۔ ''کیا بات ہے احمد علی! خیر تو ہے نا؟ آج صبح صبح کیسے آنا ہوا؟ بھتیجی کا کام کب شروع کرو گے؟ کوئی میرے لائق خدمت ہے؟''

احمد علی ایک مختصر سے سوال کے مختصر سے جواب کا خواہش مند تھا۔ بولا ''ملک جی مجھے اپنی زمین بیچنے کی ضرورت پڑ گئی ہے۔ اگر آپ اس وقت یک مشت رقم ادا کر دیں تو میں انتقال آپ کے نام چڑھا دوں۔''

ذیلدار نے جواب دیا ''نقد رقم میرے پاس موجود

نہیں۔ دونوں لڑکوں نے چھ ماہ سے پھوٹی کوڑی تک نہیں بھیجی۔ غلہ اب کے بکا نہیں، بہت سستا تھا۔ گرانی کا انتظار تھا مگر پچھلے دنوں بارش ہوگئی۔ میں ماہ دو ماہ کے بعد رقم دے سکوں گا۔''

احمد علی مایوس ہو کر بولا ''مہینے دو مہینے کون انتظار کرے ملک جی! آپ کی بھتیجی کا کام تو بس آٹھ دس دن کے بعد ہونے والا ہے۔ لڑکے والے تنگ کر رہے ہیں۔ اس کی پھٹی ختم ہونے والی ہے اور ادھر سرحد پر لڑائی شروع ہے۔ اسے پھر چھٹی نہ ملے گی۔ اگر آپ نہ خرید سکیں تو میں چودھری نبی بخش سے بات کروں۔''

''میرے دشمن سے!''

''مگر مجبوری ہے نا ملک جی!''

''یعنی تمہیں میری پروا نہیں!''

ذیلدار نے غصے میں آ کر اس زور سے حقے کا کش لگایا کہ دو چار کوئلے چلم میں سے اچھل کر فرش پر جا گرے۔

گاؤں کے سردار سے دشمنی مول لینا بہت مہنگا سودا تھا لیکن بیٹی کی شادی کو معرض التواء میں ڈالنا بھی احمد علی کے خیال میں اچھی بات نہ تھی۔ سوچنے لگا، مفت میں برادری میں سبکی ہوگی کہ جیب خالی تھی، گھبرا گیا۔

اسے معلوم تھا کہ ذیلدار اپنے مخالفین کو بیگار میں پکڑ کر تھانے دار کے کام پر بھیج دیتا ہے۔ پولیس والوں کے آنے پر ان کے گھر سے مرغیاں مفت پکڑوالیتا ہے، ان پر سرکاری ذخیرے سے لکڑیاں کاٹ کر لانے کا الزام دھر کر بیس بیس روپے جرمانہ کروا دیتا ہے۔ رات کو چوکیدار کے ہاتھ میں درانتی دے کر اس کی فصل کٹوا سکتا ہے! لیکن سونے کے ہار کی جگمگاہٹ اس کے ان خیالات پر چھا گئی اور وہ چودھری نبی بخش کے مکان کی طرف اس تیزی سے چلنے لگا کہ گلی میں پیچھے بہت دیر تک غبار کی ایک لکیر سی نظر آتی رہی۔

چودھری نے زمین کی آدھی قیمت بتائی۔

احمد علی نے اعتراض کیا تو وہ بولا۔ ''تو پھر کہیں اور بیچ ڈالو، میری طرف سے تمہیں آزادی ہے۔ ذیلدار کے ہاں بیچ دو۔''

''نقد روپیہ اور کون دے گا؟'' احمد علی جیسے اپنے دل سے مشورہ کر رہا تھا۔

''ہاں ہاں۔ میری طرف سے تمہیں کوئی رکاوٹ نہیں، میں نے اپنا فیصلہ بتا دیا۔ منظور ہو تو نقد لے لو اور رسید لکھ دو۔''

اس نے ایک طرف ہاتھ بڑھایا، تکیے کے نیچے سے ایک تھیلی چھن چھن کرتی احمد علی کے سامنے آ گری۔

احمد علی کی نبض رقص کرنے لگی۔ سونے کا ہار فضا میں جھولتا ہوا کہیں غائب ہو گیا۔

اس نے چوہدری کی لکھی ہوئی رسید پر انگوٹھا لگا کر ڈھائی سو روپے لیے اور گھر کا رخ کیا۔ زمین بک جانے کے خیال سے اس کے دل میں شعلہ سا بھڑک اٹھتا تھا لیکن پگڑی میں بندھے ڈھائی سو روپے چھو کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھلنے لگی۔ خیالات کے مدوجزر سے اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ راستے میں سوچا کہ اب ہار لے کر گھر جاؤں تو لطف آئے۔ ایک بار تو بیوی کا دل دھک سے رہ جائے گا۔ بے چاری خوشی سے مر نہ جائے۔

تین میل دور ایک قصبے کے بڑے سنار کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے چاندی کے تمام زیور اسی سے خریدے تھے۔ سنار اسے بڑے تپاک سے ملا۔ ہاتھ ٹیک کر تعظیماً اٹھا اور پھر اڈے پر بیٹھ گیا۔ اپنی سانسوں کو جو اٹھنے کی کوشش میں گتھم گتھا ہو گئی تھیں، اپنی اصلی حالت میں لانے کی سعی کرتے ہوئے بولا۔ ''ادھر میرے پاس تشریف رکھیے۔ سنائیے کیسے آنا ہوا۔ آپ تو ہمارے پرانے گاہک ہیں اور پرانے گاہکوں سے ہم عام دکانداروں سا برتاؤ نہیں کرتے۔ پرماتما کی قسم! آپ تو میرے بھائی ہیں۔''

www.urdugem.com

احمد علی نے شکریہ ادا کر کے ہار کی فرمائش کی۔ اب کے سنار اس تیزی سے اٹھا، جیسے ربڑ کا ہلکا پھلکا غبارہ پھونک مارنے سے ہوا میں اڑنے لگے۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا لوہے کی ایک الماری تک گیا۔ ایک زرنگار صندوقچہ نکالا اور جھاڑ پونچھ کر احمد علی کے قدموں میں رکھ دیا۔ سانسیں تیز ہوگئیں۔ آنکھیں چمک اٹھیں، ہاتھوں میں رعشہ آ گیا۔ صندوقچہ کھولا تو آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ اس نے ایک لمبا سا خوبصورت ہار چن لیا جس کے وسطی حصے میں سرخ رنگ کا ایک نگینہ مسکرا رہا تھا۔ پڑوس کی نئی دلہن کے ہار کی طرح۔

"اس کی قیمت؟"

سنار نے پھونکنی کو ہاتھ میں گھماتے ہوئے کہا۔ "آپ سے ایک بات کروں گا۔ ڈھائی سو روپیا!"

"لیکن..."

"میں نے لیکن ویکن کی تو گنجائش ہی نہیں رکھی ملک احمد علی۔ اگر آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس سے پورے پانچ سو بٹورتا۔ لیکن آپ میرے پرانے گاہک ٹھہرے۔ میرے بھائی! لاگت کے دام بتائے ہیں۔ یہی سمجھوں گا کہ باقی رقم اپنی بھتیجی کو شادی کی خوشی میں پیش کر دی"۔

احمد علی کی پگڑی نے ڈھائی سو روپیہ اگل دیا۔

☆☆☆☆☆

شادی کے دن جب جہیز صحن میں بچھایا گیا تو احمد علی ایک چنگیر میں سونے چاندی کے زیور سجا کر لایا اور انھیں پلنگ پر رکھ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ عورتیں اس چمکتے دمکتے ہار کو دیکھ کر انگشت بدنداں ہوگئیں اور ایک دوسرے کے ہاروں کو چھو چھو کر کہنے لگیں۔ "ارے اس سے بڑھیا ہے۔ دیکھ تو سہی جیسے پلنگ پر آگ جل رہی ہے"۔

فضا سرگوشیوں کی سرسراہٹ سے معمور ہو گئی..... "سونے کا ہار! سونے کا ہار! آدھ پاؤ سونے کا ہار! احمد علی نے اپنے خاندان کی لاج رکھ لی"۔

ناگاہ بوڑھوں کے مجمعے سے ذیلدار نکلا اور احمد علی کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "مبارک ہو احمد علی! اللہ کرے میری بھتیجی سکھ چین سے سہاگ کی زندگی بسر کرے"۔

اس نے بڑھ کر ہار اٹھا لیا۔ تمام مجمع دم بخود کھڑا تھا۔ سب کے لبوں پر تعجب انگیز مسکراہٹ تھی۔ احمد علی کی حیثیت ایسے گراں بہا ہار سے بہت کم تھی۔ یہ اس کی محبت پدری کا ایک معجزہ تھا۔

ذیلدار ہار کو اپنی آنکھوں کے بہت قریب لے گیا۔ الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا اور بھرے مجمع میں بلند آواز سے بولا۔

"احمد علی! یہ تو نقلی سونا ہے"۔

مجمع پر مردنی سی چھا گئی۔ ذیلدار کچھ وقفے کے بعد بولا۔ "یہ تو نقلی سونا ہے، دس پندرہ روپے کا ہوگا یہ ہار۔ چمک دمک تو بہت زبردست ہے اس کی"۔

احمد علی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "میں نے تو یہ ہار ڈھائی سو روپے میں خریدا ہے"۔

ذیلدار بولا "خریدا ہوگا مگر اصل میں یہ ہے پندرہ روپے کا۔ تانبے پر سونے کا ملمع چڑھا ہوا ہے۔ امیر چند سنار! ادھر آنا ذرا، یہ ہار دیکھنا"۔

احمد علی کی قسمت کا فیصلہ امیر چند کی زبان کی ایک ذرا سی حرکت پر منحصر تھا۔ امیر چند نے عینک لگا کر ہار کو بغور دیکھا اور اسے چنگیر میں رکھتے ہوئے بولا۔ "نقلی ہے"۔

ہر طرف چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ عورتیں ناک پر انگلی رکھ کر احمد علی کا تمسخر اڑانے لگیں۔

احمد علی پلنگ کے رنگین پائے کا سہارا لیے بت کی طرح کھڑا رہا۔ وہ اپنی آنکھیں تک جھپکانا بھول گیا۔

دلہن ڈولی میں سوار ہونے کو تھی کہ اس کا پاؤں پھسل گیا اور وہ دھڑام سے زمین پر آ رہی۔

ذیلدار اپنے سر پر ہاتھ پھیرتا ہوا اپنے حواریوں کے ساتھ ایک گلی میں مسکراتا جا رہا تھا۔ ◆◆◆

محمد خلیل چودھری

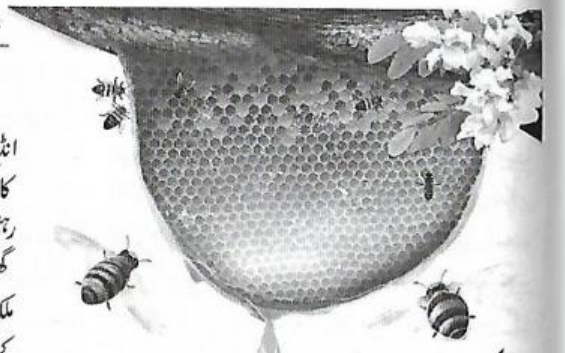

مکھیوں کی رانی

اللہ تعالیٰ کی ننھی و انوکھی مخلوق کے حیران کُن حقائق

ارے ہٹو ہٹو! وہ دیکھو شہد کی مکھیاں آ رہی ہیں، ڈنک مار دیں گی۔ پہلی بار شہد کی مکھی کو دیکھ کر واقعی ڈر لگتا ہے۔ مگر حقیقت میں یہ کیڑا بڑے کام کا ہے۔ یہ مکھی ہمارے لیے مزیدار شہد بناتی ہے جو ہماری صحت کے لیے بہت مفید ہے۔ یہ ننھی منھی مکھی دراصل اللہ تعالیٰ کا شاہکار ہے۔ مکھی کے چھتے میں سے شہد نکالنا ان اوّلین سرگرمیوں میں سے ایک ہے جو ہزاروں برس پہلے قدیم انسانوں نے شروع کی تھیں۔ وہ چھتے کے نیچے آگ لگا دیتے، دھوئیں اور آگ سے گھبرا کر مکھیاں اُڑ جاتیں اور وہ چھتے میں سے شہد نکال کر مزے سے کھاتے۔ ذیل میں ان مکھیوں کے دلچسپ حقائق پیش ہیں۔

☆ شہد کی مکھیوں میں سب سے بڑی ملکہ مکھی ہے۔ ہر چھتے میں صرف ایک ملکہ مکھی ہوتی ہے۔ یہ انڈے دیتی اور چھتے کی آبادی بڑھاتی ہے۔ یہ دو سے آٹھ سال زندہ رہتی ہے۔ اس کے شوہر مکھے (DRONES) کہلاتے ہیں۔ وہ انڈے دینے میں ملکہ کی مدد کرتے ہیں۔

کارکن مکھیاں ابتدائی عمر میں صرف چھتے تک محدود رہتی ہیں۔ اس لیے یہ گھریلو مکھیاں کہلاتی ہیں۔ یہ گھر کا سارا کام کرتی ہیں۔ مثلاً یہ چھتا بناتی ہیں۔ ملکہ کو کھانا دیتی، بچے پالتی اور چھتے کی حفاظت کرتی ہیں۔ زیادہ عمر کی کارکن مکھیاں پھولوں سے رس چوس کر شہد بناتی ہیں۔ ایک چھتے میں ۸۵ فیصد آبادی کارکن مکھیوں ہی کی ہوتی ہے۔ مکھے اور کارکن مکھیاں ایک سے دو ماہ زندہ رہتی ہیں۔

☆ دنیا بھر میں سات اقسام کی شہد کی مکھیاں پائی جاتی ہیں۔ یہ انتہائی سرد اور گرم علاقوں کے علاوہ تقریباً ہر جگہ ملتی ہیں۔ ان سات مکھیوں کی مزید ۴۴ ذیلی اقسام ہیں۔ ماہرین بتاتے ہیں، شہد کی مکھی کی پہلی قسم نے تین کروڑ سال پہلے ہمارے خطے یعنی جنوبی ایشیا میں جنم لیا تھا۔

☆ شہد کی مکھی چار پَر رکھتی ہے۔ اڑتے ہوئے وہ ایک منٹ میں ۱۱,۴۰۰ بار ہلاتی ہے۔ تیزی سے پر ہلانے کے باعث ہی اس سے بھن بھن جیسی آواز آتی ہے۔ مکھی ایک بار اُڑ کر چھ میل دور تک جا سکتی ہے۔ وہ ۱۵ میل فی گھنٹا کی رفتار سے اڑتی ہے۔

☆ قرآن پاک میں ارشاد ہوا ہے۔ "اللہ پاک نے شہد کی مکھیوں کو حکم دیا ہے کہ پہاڑوں، درختوں اور بیلوں پر چھتے بناؤ، پھلوں کا رس چوسو اور میرے مقرر کردہ راستوں پر چلو۔ ان کے پیٹ سے مختلف رنگوں والا مشروب نکلتا ہے۔ اس میں انسانوں کے لیے شفا ہے۔ بے شک شہد کی مکھی کے کام میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں"۔ (سورۃ النحل ۶۸ : ۶۹)

☆ شہد کی مکھیاں پھولوں کا رس چوس کر اپنا پیٹ بھرتی

www.urdudigest.com

ہیں۔ جب ان کا پیٹ بھر جائے، تو باقی رس چھتے کے خانوں میں ڈال کر تیزی سے ہلاتی ہیں تاکہ نمی اُڑنے سے وہ گاڑھا ہو کر شہد میں بدل جائے۔ دراصل مکھیاں شہد اس لیے بناتی ہیں تاکہ سردیوں میں اس سے پیٹ بھر سکیں کیونکہ موسم سرما میں پھول بہت کم کھلتے ہیں۔

☆ شہد کی مکھیوں کا گھر چھتا کہلاتا ہے۔ چھوٹے چھتے میں دو تین ہزار جبکہ بڑے میں پچاس ہزار تک مکھیاں رہتی ہیں۔ چھتے عموماً درختوں پر ہوتے ہیں۔ مکھیاں اپنے پیٹ سے نکلنے والے لعاب (موم) پھولوں سے حاصل کردہ رس اور پانی کی مدد سے چھتا بناتی ہیں۔ چھتے میں مسدس شکل کے ایک جیسے چھوٹے چھوٹے خانے ہوتے ہیں۔

ملکہ بعض خانوں میں انڈے دیتی ہے۔ جب ان سے بچے نکل آئیں تو کارکن مکھیاں انھیں پال پوس کر بڑا کرتی ہیں۔ بقیہ خانوں میں کارکن مکھیاں رس جمع کر کے شہد بناتی ہیں۔ ایک بڑے چھتے میں کئی سو خانے ہوتے ہیں۔ موسم گرما میں مکھیاں مخصوص بُو رکھتی ہیں۔ یہ بُو ان کا شناختی کارڈ ہے۔ اگر کوئی بیرونی مکھی چھتے میں آجائے تو اس بُو کے سبب پہچان لی جاتی ہے۔ اسے اجنبی جان کر مار بھگایا جاتا ہے۔

☆ اللہ تعالیٰ نے کارکن مکھیوں کو ایک حیرت انگیز صلاحیت دے رکھی ہے۔ وہ مختلف ناچ پیش کر کے ساتھیوں کو بلاتی اور پیغام پہنچاتی ہیں کہ پھول کسی جگہ اور کتنے فاصلے پر ہیں اور ان میں کتنا رس ہے۔ کسی مکھی کو رس بھرے پھول مل جائیں، تو وہ چھتے پر پہنچ کر ناچتی ہے۔ اس دوران میں وہ وقفے وقفے سے پر پھڑ پھڑاتی اور رُک رُک کر ایک طرف چلتی ہے۔

وہ کم و بیش ۱۰۰ بار رُک رُک کر چلتی ہے۔ ہر بار رُکنے پر پھولوں کی طرف اس کا فاصلہ ۱۰۰ فٹ بڑھ جاتا ہے۔ مزید برآں مکھی پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سے ساتھی مکھیوں کو بتاتی ہے کہ پھولوں میں کتنا رس ہے۔ رس جتنا زیادہ ہوگا، وہ اتنی ہی تیزی سے پر پھڑ پھڑائے گی۔ حیران کن بات یہ ہے کہ اس ناچ کے ذریعے وہ پھولوں کی جگہ بھی بتاتی ہے۔ یہ کام وہ سورج کی سمت کے مطابق انجام دیتی ہے۔ مثلاً سورج چھتے کے بالکل اوپر ہے اور جگہ عین سامنے تو وہ بالکل سیدھا چلے گی۔ اگر چھتا سورج کے دائیں طرف ہے تو وہ اسی سمت اِٹھلا اِٹھلا کر چلے گی۔ اگر پھولوں والی جگہ زیادہ مکھیاں درکار ہوں تو ایک مکھی واپس آ کر اپنا پیٹ تھرتھراتی ہے۔ اسے دیکھ کر مکھیاں سمجھ جاتی ہیں کہ مزید کارکنوں کی ضرورت ہے۔ اگر مکھیاں بہت زیادہ رس چھتے میں لے آئیں، تو ایک مکھی کپکپاتا ناچ پیش کرتی ہے۔ یوں مکھیاں سمجھ جاتی ہیں کہ اس کو شہد میں بدلنے کے لیے زیادہ کارکن درکار ہیں۔

☆ ہر پھول میں زیرے (POLLENS) ہوتے ہیں جو پھول کے خاص حصوں تک منتقل ہو کر پھل بناتے ہیں۔ کارکن مکھیاں پھولوں سے رس چوسنے جاتی ہیں تو زیرے ان کے پروں کے ساتھ چمٹ کر ایک سے دوسرے پھول تک منتقل ہوتے ہیں۔ اس سے پھلوں کی پیداوار زیادہ بہتر ہوتی ہے۔ بعض پودے تو زیروں کی اس طرح منتقلی کے بغیر پھل پیدا کر ہی نہیں سکتے۔

☆ جی ہاں، پوری دنیا میں پہاڑی، جنگلی اور دیہی علاقوں میں شہد کی مکھیاں پالی جاتی ہیں۔ سب سے پہلے پانچ ہزار سال قبل مصریوں نے مکھیاں پالی تھیں۔ یہ بھی ایک فن ہے اور اسے سیکھ کر ہی مکھیاں پالنی چاہئیں۔ مکھیاں پالنے والے باغات کے نزدیک وسیع و عریض چھتے لگاتے ہیں۔ پالتو مکھیوں کے ذریعے سے چین میں سب سے زیادہ شہد حاصل کیا جاتا ہے یعنی تین لاکھ ٹن تک۔ تاہم معیاری شہد جرمنی کا ہوتا ہے۔

☆ اللہ پاک نے کارکن مکھیوں کو چھتے اور اپنے دفاع کے لیے ڈنک مار (STINGER) عطا کیے ہیں۔ یہ مکھی کے پیٹ کے آخر میں ہوتا ہے۔ جب مکھی کسی کو ڈنک مارے، تو اس کا ڈنک مار راستے میں ایک زہر سے بھرے عضو سے گزرتا ہے۔ یوں ڈنک مار زہر سے بھر جاتا ہے۔

دلچسپ بات ہے کہ مکھی کسی مماثلہ مثلاً انسان یا گائے

وغیرہ کو ڈنک مارے تو کچھ دیر بعد مر جاتی ہے۔ خاص طور پر اُس وقت جب اُس کے شکار کی کھال موٹی ہو۔ وجہ یہ ہے کہ اس کے ڈنک مار میں ایک آنکڑا (BARB) لگا ہوتا ہے۔ ڈنک مارتے ہی ڈنک مار مضروب کے جسم میں پھنسا رہ جاتا ہے۔ چونکہ ڈنک مار پیٹ کے سارے عضلات سے جُڑا ہوتا ہے۔ لہٰذا اُس کے ٹوٹتے ہی مکھی کا پیٹ بھر جاتا ہے۔ وہ پھر جلد ہی مر جاتی ہے۔ گویا مکھی مماثلہ یا پرندے کو ایک ہی بار ڈنک مار سکتی ہے۔

دلچسپ بات یہ کہ ڈنک مار ہر مکھی میں نہیں ہوتا۔ مکھیوں کی چھوٹی اقسام کے ڈنک میں زیادہ زہر نہیں ہوتا لیکن ایک خاص قسم کی بڑی شہد کی مکھی سے بچ کر رہیے۔ یہ مکھی بھارت سے لے انڈونیشیا تک ملتی ہے۔ اگر کسی انسان کو ایسی سینکڑوں مکھیاں کاٹ لیں تو وہ مر جاتا ہے۔ امریکا میں اس کی بہن افریقی مکھی ہر سال دو تین افراد مار دیتی ہے۔ اس لیے یہ قاتل مکھی کہلاتی ہے۔ عجیب بات یہ کہ دنیا میں سب سے بڑی ہمالیائی مکھی کا ڈنک خطرناک نہیں ہوتا۔ ایک انچ لمبی یہ مکھی ہمالیہ کے پہاڑوں میں ملتی ہے۔

☆ پاکستان میں تین اقسام کی شہد کی مکھیاں ملتی ہیں۔ ایک مکھی جس کا سائنسی نام ایپس ملی فیرہ (APIS MILLIFERA) ہے، پالنے کے لیے باہر سے منگوائی گئی ہے۔ دراصل ایپس ملی فیرہ مکھیوں میں سب سے زیادہ شہد بناتی ہے۔ لہٰذا مکھیاں پالنے والے اسے پسند کرتے ہیں۔ فی الوقت آٹھ ہزار پاکستانیوں نے تین لاکھ چھتوں میں یہ مکھیاں پال رکھی ہیں۔ پاکستان بھر کے پھول دس لاکھ چھتوں کو رس فراہم کر سکتے ہیں۔

☆ شہد کی مکھیاں سردی میں ایک دوسرے سے چپک کر، گولا سا بنا کر خود کو گرم رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ معمول سے کہیں زیادہ پر پھڑ پھڑاتی ہیں تاکہ ان کا جسم گرم رہے۔ چونکہ اس محنت سے انھیں زیادہ خوراک کی ضرورت ہوتی ہے لہٰذا وہ گرمیوں میں شہد بھی زیادہ سے زیادہ بناتی ہیں۔

☆ شہد کی مکھی کا دماغ سپر کمپیوٹر سے بھی زیادہ طاقت ور ہوتا ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق جدید ترین سپر کمپیوٹر ایک سیکنڈ میں ۱۶ ارب بار حساب کتاب کرتا ہے لیکن مکھی کا دماغ ایک سیکنڈ میں ۱۰۰۰ ارب دفعہ حساب کرتا ہے۔ اتنے تیز رفتار دماغ کے باعث ہی مکھی بہت جلد فیصلہ کر لیتی ہے کہ اسے کہاں اور کس طرح جانا ہے۔ مکھی میں سونگھنے کی حس بھی بہت تیز ہے۔ اس حس کی مدد سے وہ دور ہی سے جان جاتی ہے کہ کس پھول میں رس ہے۔ نیز وہ کئی سو مختلف پھولوں کی خوشبوؤں میں بھی بیک وقت تمیز کر سکتی ہے۔

☆ مکھیاں شہد بنانے کے علاوہ تین قسم کا موم بھی بناتی ہیں۔ شاہی موم (ROYAL JELLY) خاص پھولوں کے رس سے بنتی ہے۔ یہ موم ملکہ کھاتی ہے جو شہد سے زیادہ صحت بخش ہوتا ہے۔ نُسلی موم (PROPOILIS) مکھیاں اپنے بچوں کو کھلاتی ہیں۔ موم کی یہ قسمیں ادویہ میں استعمال ہوتی ہیں۔ چھتے کا موم (BEES WAX) میک اپ کی اشیاء بنانے میں کام آتا ہے۔

☆ مکھیوں کی ملکہ ایک دن میں ۲۰۰ انڈے دے سکتی ہے۔

☆ ایک کارکن مکھی اپنی زندگی میں ۱۰ سے ۱۵ گرام شہد بناتی ہے۔

☆ ایک کلو شہد بنانے کے لیے مکھیاں ۶۰ ہزار میل کا سفر طے کرتیں اور ۲۵ لاکھ پھولوں کا رس چوستی ہیں۔

☆ ایک اونس شہد سے مکھی کو اتنی توانائی ملتی ہے کہ وہ دنیا کا ایک چکر لگا لے۔

☆ شہد کی مکھی واحد کیڑا ہے جس کا مفرعہ (شہد) انسان کھاتا ہے۔

☆ مکھیاں پھولوں کا رس چھتے کے خانوں میں ڈال کر تیزی سے ہلاتی ہیں تاکہ نمی اڑنے سے وہ گاڑھا ہو کر شہد میں بدل جائے۔

◆◆◆

www.urdugem.com

ایشور چندر ترجمہ: عدیل مہدی

تقدیر کی چال

سنہرے مستقبل سے محروم ہو جانے والے ایک بدنصیب بوڑھے کا قصۂ الم

صبح سویرے سے ہی وہ خالی اور خاموش بیٹھے تھے۔ بیچ بیچ میں بوڑھی عورت بوڑھے سے کچھ کھانے کے لیے پوچھتی مگر وہ وہی بات دہراتا جو اس نے پہلے کہی تھی:

''مجھے بھوک نہیں ہے''۔

ان کا بیٹا وکرم صبح چھ بجے ہی گھر سے نکل گیا تھا۔ جاتے ہوئے اپنے والدین سے کہا تھا ''کالج کے لڑکوں نے آج ہڑتال کی اپیل کی ہے۔ میں دیکھنے جا رہا ہوں کہ کوئی دکان تو کھلی ہوئی نہیں...... اور ہاں اگر مجھے دیر ہو جائے تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں''۔

اور پھر اس نے جلدی سے اسکوٹر اسٹارٹ کیا اور چلا گیا۔ بوڑھے کو یہ پوچھنے کا بھی موقع نہیں ملا کہ لڑکوں نے ہڑتال کی اپیل کیوں کی ہے۔ اگر جھگڑا کالج تک ہی محدود تھا تو وہ عام آدمیوں کو کیوں تکلیف میں ڈال رہے ہیں۔

ایک دن پہلے جب وکرم کسی کا اسکوٹر گھر لایا تھا تو بوڑھے کو شک ہوا تھا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ بہت عرصہ سے اسی طرح کا معاملہ چل رہا تھا۔ وہی پرانا طریقہ کار، جب بھی لڑکے ہڑتال کا منصوبہ بناتے تو وکرم کسی کا اسکوٹر گھر لاتا اور پھر طالب علموں کا لیڈر ہونے کی وجہ سے صبح روز ہی گھر سے نکل جاتا۔ یہ اس کا معمول تھا اور خدا جانے پورے دن کہاں کہاں گھومتا اور کہاں کہاں جاتا۔

بوڑھے کو یاد آیا کہ جس دن وکرم کالج کے الیکشن میں کامیاب ہوا تو وہ کتنا خوش تھا۔ تقریباً بارہ دن تک وہ دفتر میں کوئی بھی کام نہ کر سکا تھا۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اپنی کرسی چھوڑ کر اٹھتا اور کسی ساتھی کے پاس جا کر بیٹھ جاتا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد اپنا سر فخر سے اونچا کر کے اپنے ساتھیوں کو بتاتا کہ اس کا بیٹا وکرم اپنے کالج کا لیڈر چن لیا گیا ہے۔ وکرم بھاری اکثریت سے الیکشن جیتا تھا۔

بوڑھا اب حد سے تجاوز کرنے لگا تھا۔ اس نے غلطی سے اپنے دو تین ساتھیوں کو پورا واقعہ دوبارہ سنا دیا۔ جب

انھوں نے اس سے کہا کہ وہ پہلے بھی ان کو بتا چکا، تو وہ اپنی غلطی پر صرف مسکرا دیا تھا۔

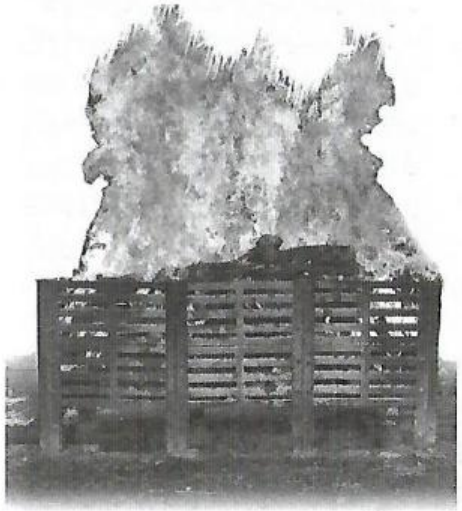

اصل میں بوڑھے نے مستقبل کے بارے میں دور تک سوچ رکھا تھا۔ آج تو وکرم صرف کالج کا الیکشن جیتا ہے، اس نے سوچا کچھ عرصہ بعد میں اس سے میونسپل الیکشن میں کھڑا ہونے کے لیے کہوں گا۔ اس طرح رفتہ رفتہ ایک دن اس کا بیٹا وی۔ آئی۔ پی بن جائے گا۔

لیکن ایک دن آیا جب اس کے خواب چکنا چور ہو گئے۔ اس دن ایک لیکچرار سے تکرار کی وجہ سے لڑکوں نے ہڑتال کر دی۔ جب صورت حال بگڑنے لگی تو پولیس کو بلانا پڑا۔ لڑکوں اور پولیس کے درمیان جھڑپیں ہوئیں جس کے دوران اس کے لڑکے کی گھٹنے کی ہڈی ٹوٹ گئی اور اسے اسپتال لے جانا پڑا۔ ہڈی جڑنے میں تین مہینے لگے۔ اسپتال کے روزانہ چکروں سے بوڑھا عاجز آ گیا۔ اِن تکلیف دہ دنوں کے دوران اسے احساس ہوا کہ اس کے لڑکے نے کالج کا لیڈر بن کر غلطی کی۔ اس کی چوٹ نے اپنے گھر کے لوگوں کے لیے ناگہانی پریشانی اور دقّت پیدا کر دی تھی۔ اس نے سوچا کہ وہ اپنے لڑکے کو سمجھائے گا کہ وہ پڑھائی چھوڑ کر کوئی نوکری تلاش کرے۔

وکرم کو یہ تجویز بالکل پسند نہیں آئی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ امتحان اچھی ڈویژن سے پاس کرنے کی کوشش کرے گا تاکہ بہتر نوکری مل سکے۔ کالج کا لیڈر ہونے کی وجہ سے وہ بہت سارے اہم لوگوں کو جان گیا تھا جن کا مرتبہ بہت اونچا تھا۔ اس کے تعلقات بہت وسیع اور اعلیٰ تھے۔ اس لیے اچھی نوکری ملنے میں کوئی دقّت نہیں ہونی چاہیے۔

بوڑھے نے مزید اصرار نہیں کیا۔ وہ برسر روزگار تھا اور صرف پانچ سال بعد ریٹائر ہو جائے گا۔ پھر وہ غربت کی زندگی بھی تو نہیں گزار رہے تھے۔ جتنا بھی وہ کما کر گھر لاتا وہ ان کے آرام سے رہنے کے لیے کافی تھا۔ اس کا خاندان بھی بڑا نہیں تھا۔ دو بچے تھے، بیٹا وکرم اور ایک بیٹی۔ چار افراد پر مشتمل ایک چھوٹا سا خاندان تھا۔

وکرم اپنی بہن سے بڑا تھا۔ وہ دسویں کلاس میں پڑھتی تھی۔ بوڑھے نے پہلے سے ہی دونوں کی شادی ایک ساتھ کرنے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ وہ صرف ایک بار ہی دونوں شادیوں پر خرچ کرے گا۔ اس وقت تک وہ یقیناً ریٹائر ہو چکا ہو گا۔ وکرم کوئی اچھی نوکری کر رہا ہو گا۔ وہ اور اس کی بیوی پھر سکون کی زندگی گزاریں گے۔ مستقبل کے وہ خواب تھے جو بوڑھا دیکھتا رہتا تھا اور جن سے اپنے ذہن کی تزئین کرتا رہتا۔

کل وکرم کے کالج میں ایک اور ہنگامہ ہوا۔ کالج کے اسٹاف کا کہنا تھا کہ کسی سرپھرے لڑکے نے ایک پروفیسر کو تھپڑ مار دیا۔ لڑکے اس الزام کی تردید کرتے تھے۔ وہ مصر تھے کہ اصل میں پروفیسر نے لڑکے کو طمانچہ مارا ہے۔ جھگڑا بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچ گیا کہ ہڑتال کی اپیل کرنے کے بعد اب لڑکے پروفیسر کو برخاست کرنے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ جب تک حکام پروفیسر کے خلاف کارروائی نہیں کریں گے تب تک کوئی لڑکا کلاس میں نہیں جائے گا۔ کشمکش اور شورش بدستور جاری رہی اور آخر کار دوسرے اداروں کے طلبا بھی ہڑتال میں شریک ہو گئے۔

آج طلبہ نے شہر میں مکمل ہڑتال کی پابندی کی اپیل کی تھی۔ وکرم اسکوٹر پر صورتِ حال کا جائزہ لینے گیا ہوا تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ ہڑتال کی تعمیل بھی ہو رہی ہے یا نہیں خصوصاً دکاندار پابندی کر رہے ہیں یا نہیں۔

دوپہر کا وقت تھا۔ وکرم ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ ہڑتال کی وجہ سے اسکول بھی بند کر دیے گئے تھے۔ اس کی بہن تھوڑی دیر بعد ہی گھر لوٹ آئی تھی اور ناشتے کے بعد پڑی ستا رہی تھی لیکن بوڑھے والدین نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ وہ وکرم کے آنے کا انتظار کر رہے تھے تاکہ اس کے ساتھ ناشتا کر سکیں۔ وہ چپ چاپ بیٹھے تھے لیکن کسی اسکوٹر کی آواز سنتے ہی چونک پڑتے۔ وہ سوچتے شاید وکرم واپس آ گیا مگر جب اسکوٹر بغیر رکے ان کے دروازے سے گزر جاتا اور اس کی آواز کہیں دور گم ہو جاتی تو وہ افسردہ ہو جاتے۔ بے بسی سے ٹک ٹک کرتی ہوئی اور وقت کے گزرنے کا

www.urduqom.com

اعلان کرتی گھڑی کی سوئی کو آگے بڑھتا دیکھتے رہتے اور پھر اپنے آپ کو اتھاہ خاموشی میں غرق کر دیتے۔

وقت اپنی عادت کے مطابق آگے بڑھتا رہا۔ بیچ بیچ میں لڑکے آکر انھیں تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کرتے رہتے۔ انھوں نے بتایا کہ ہڑتال مکمل طور پر کامیاب ہوئی تھی۔ دکانیں بند تھیں اور فٹ پاتھ پر بھی کچھ نہیں بک رہا تھا۔ بوڑھا الجھن کے باعث کچھ سمجھنے کے قابل نہیں تھا۔ حالات اس کی فہم سے باہر تھے۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ طلبہ کی کامیابی پر خوش ہو یا صرف خاموش تماشائی بنا رہے۔

سہ پہر تقریباً دو بجے اسکوٹر پر ایک لڑکا ان کے دروازے پر رکا۔ اس نے بوڑھے کو بتایا کہ پولیس نے طلبہ کے لیڈروں کو حراست میں لے لیا ہے اور ان میں وکرم بھی ہے مگر فکر کی کوئی بات نہیں، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں یہاں سے گزر رہا تھا، سوچا آپ کو نئے حالات کے بارے میں بتاتا چلوں۔ ہم سب وکرم کی حمایت کر رہے ہیں۔ اسے کچھ نہیں ہوگا۔ ہم ہر چیز کا خیال رکھیں گے۔"

لڑکا چلا گیا مگر بوڑھا کچھ پریشان ہو گیا۔ اس نے جوتے پہنے، کچھ روپے جیب میں ڈالے اور عجلت سے پولیس اسٹیشن روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے نعرے لگاتا ہوا ایک بڑا مجمع دیکھا۔ وہ بھیڑ کے قریب پہنچا۔ کئی لڑکوں نے اسے پہچان لیا۔ ایک اس کے قریب آکر بولا "آپ یہاں کیوں آئے ہیں انکل؟"

اس نے آنکھیں سکوڑ کر شور مچاتی ہوئی بھیڑ میں وکرم کو تلاش کرنے کی کوشش کی اور پھر پوچھا۔ "وہ کہاں ہے؟ وکرم کہاں ہے؟"

دوسرے لڑکے نے جواب دیا "وکرم کو پولیس نے گرفتار کر لیا ہے۔"

اس نے مجمع چیر کر آگے بڑھتے ہوئے کہا "میں اندر جا کر اس سے ملوں گا۔" ایک اور لڑکے نے پوچھا "آپ پولیس اسٹیشن کے اندر کیا کریں گے؟"

"میں اس کو رہا کروانے کی کوشش کروں گا۔"

ایک لڑکا جو لیڈر لگ رہا تھا۔ سکون سے چلتا ہوا اس کے پاس آیا اور نہایت ادب اور احترام سے بولا "اب..... دیکھیے، انکل! ہماری جدوجہد جاری رہے گی۔ وکرم ہمارا لیڈر ہے۔ اس کو رہا کروانا ہماری ذمہ داری ہے۔ آپ اس جھگڑے میں نہ پڑیں۔"

بوڑھا مایوس ہو گیا۔ اس نے کہا "لیکن مجھے اسے دیکھنے تو دو... وہ میرا بیٹا ہے... مجھے اس سے ملنے کا پورا حق ہے... میں اندر ضرور جاؤں گا..."

ایک لڑکا آگے بڑھ کر اسے ٹوکتا ہوا بولا "جی ہاں انکل، وہ آپ کا بیٹا ہے لیکن وہ ہمارا لیڈر بھی تو ہے۔ وہ ہمارا ہیرو ہے..... ہیرو! ہم اسے رہا کروا کر ہی رہیں گے۔ مہربانی کر کے آپ گھر جائیں اور آرام کریں اور یہ سب ہمارے اوپر چھوڑ دیں۔"

لڑکے نے اُسے بھیڑ سے باہر نکلنے میں مدد دی۔ بوڑھے نے مایوسی سے پولیس اسٹیشن کے آہنی گیٹ کو دیکھا اور پھر بوجھل دل اور لڑکھڑاتے قدموں سے سڑک پر گھر کی طرف چل پڑا۔

راستے میں وہ اس گڑبڑ کے بارے میں پھر سوچنے لگا۔ یہ کس طرح کی لڑائی تھی؟ اسے اپنے لڑکے سے بھی ملنے نہیں دیا گیا۔ وہ تو صرف یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ پولیس اس کے بیٹے کو بے رحمی سے نہ پیٹے اور اذیت نہ پہنچائے..... لیکن یہ لڑکے... انھوں نے اسے کچھ بھی نہیں کرنے دیا۔

سہ پہر کو چار بجے اسکوٹر سے ایک لڑکا آیا۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ اس نے اطلاع دی کہ وکرم کو پولیس نے رہا کر دیا ہے۔ "اب ہم ایک بڑے جلوس کے ساتھ پرنسپل کے گھر جائیں گے۔ وکرم نے مجھے یہ کہنے کے لیے بھیجا ہے کہ اگر اسے دیر ہو جائے تو آپ پریشان نہ ہوں۔"

ایک ہلکی سی مسکراہٹ بوڑھے کے ہونٹوں پر کھیلنے لگی۔ اسے خوشی ہوئی کہ لڑکوں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ بالآخر انھوں نے اسے پولیس کی گرفت سے چھڑوا لیا تھا۔ اس نے

چین کا سانس لیا۔ اس کا خیال تھا کہ لڑکے ایک بڑا جلوس لے کر پرنسپل کے گھر جائیں گے اور پھر کسی قسم کا میمورنڈم دے کر واپس گھر چلے آئیں گے۔

لیکن جیسا اس نے سوچا تھا ویسا نہیں ہوا۔

شام تقریباً نو بجے اس کے گھر کے باہر ایک جیپ آکر رکی۔ اس کے پیچھے متعدد گاڑیاں اور اسکوٹر تھے۔ بوڑھا ششدر رہ گیا۔ شاید کچھ گڑبڑ ہو گئی۔ بوڑھا حیرانی سے بھیڑ کو گھورنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ہجوم اس کے گھر کے سامنے کیوں جمع ہو گیا لیکن اس ہجوم میں... اس کا بیٹا کہاں ہے... وکرم؟

اس دوران وکرم کی ماں اور بہن بھی باہر آگئیں۔ ایک لڑکا جیپ سے اترا۔ بہت آہستہ آہستہ بھاری اور بھرائی ہوئی آواز میں اس نے بوڑھے کو بتایا "ہم لوگ اپنے مطالبات کا میمورنڈم پیش کرنے پرنسپل کے گھر گئے تھے۔ اس نے ہم لوگوں سے ملنے سے انکار کر دیا۔ پھر ہنگامہ شروع اور ہجوم بے قابو ہو گیا۔ پولیس نے بھیڑ کو منتشر کرنے کے لیے فائرنگ کی۔ ایک گولی وکرم کو لگی۔ کئی لوگ مرے ہیں۔ تمام زخمیوں کو اسپتال میں بھرتی کروا دیا گیا ہے لیکن ہماری بدقسمتی و بدنصیبی کہ ہم اپنے لیڈر سے محروم ہو گئے۔ وکرم مر چکا ہے۔"

ایک بھیانک چیخ بوڑھی عورت کے گلے سے نکلی اور اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وکرم کی بہن آہ زاری کرنے لگی لیکن کسی چیز نے بوڑھے کو روک دیا۔ وہ پتھر کے بت کی طرح وہاں کھڑا تھا جیسے اس کے ہاتھوں سے کوئی چیز پھسل گئی ہو۔ طویل خاموشی کے بعد الفاظ اس کے ہونٹوں سے برآمد ہوئے۔ "وکرم کہاں ہے؟... وہ کہاں ہے؟... میرا بیٹا کہاں ہے؟"

لڑکے نے اپنے حواس مجتمع کر کے مکمل سنجیدگی سے کہا "وکرم کی میّت کالج میں رکھی ہوئی ہے۔ ہمارے کئی ساتھی وہاں موجود ہیں۔ ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ جنازہ کل اٹھے گا..... یہ جلوس کسی شہید کے جنازے جیسا ہوگا۔ آج رات ہم پرنسپل کے گھر پر دھرنا دیں گے... وکرم کی میّت کے سامنے تعزیتی جلسہ وہیں ہوگا اور جنازے کا جلوس وہیں سے شروع ہوگا۔ شمشان جاتے ہوئے جلوس یہاں تھوڑی دیر کے لیے رکے گا۔"

بوڑھے کے چہرے پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہو رہا تھا یا شاید اس نے کچھ سنا ہی نہیں تھا۔ اس کی نظریں اُوپر آسمان پر جمی ہوئی تھیں۔ لڑکوں نے کچھ نہیں کہا اور نہ کچھ کیا، وہ حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ بوڑھے کو کیا ہو گیا ہے...

کچھ دیر بعد بوڑھے نے رک رک کر کہا "مجھے..... مجھے... وکرم کے پاس لے چلو۔"

اس وقت کوئی کچھ نہیں بولا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ بوڑھا کچھ سنبھل گیا ہے تو ایک ڈاڑھی والا لڑکا ہجوم سے نکل کر بوڑھے کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ اس نے بوجھل دل لیکن نرمی سے کہا "میں آپ سے التجا کروں گا کہ فی الحال آپ وکرم کی میّت دیکھنے کا خیال چھوڑ دیں۔ سچ یہ ہے کہ ماحول تشدد کے دبے ہوئے جذبات سے لبریز ہے۔ وہاں زبردست تناؤ ہے۔ شاید آپ کو روتے دیکھ طلبہ کا ہجوم اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکے۔ آپ کی موجودگی سے وہاں انتقام کا جذبہ پیدا ہو سکتا ہے۔ حالات قابو سے باہر ہو سکتے ہیں اور تشدد پھوٹ سکتا ہے۔" لڑکے نے ہاتھ جوڑتے ہوئے پھر کہا "اس لیے میں آپ سے پھر التماس کرتا ہوں کہ وہاں جانے کا خیال چھوڑ دیں۔"

بوڑھے نے کچھ لمحوں تک غور کیا اور پھر تھوک نگل کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا "میرے خیال میں تم کل صبح میّت یہاں لاؤ گے۔"

"جی! انکل" لڑکے نے کہا "ہم لائیں گے۔"

گلا رندھنے کی وجہ سے بوڑھے کی آواز بھرا گئی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "تم کتنے بجے اسے لاؤ گے۔"

ڈاڑھی والے لڑکے نے کہا "دس بجے کے آس پاس ہم جنازے کے جلوس کے ساتھ آئیں گے۔"

بوڑھے کی آواز پھر رک گئی۔ لڑکے خاموشی سے کھڑے تھے اور اسے خوف سے دیکھتے رہے۔ خاموشی توڑتے ہوئے ایک لڑکے نے کہا "انکل! کیا اب ہم جائیں۔"

www.urdudigest.com

بوڑھا کچھ نہیں بولا۔ اس نے مخصوص انداز میں اپنا سر ہلایا۔ لڑکوں نے اس کو رضامندی سمجھا۔ فضا میں ایک بار پھر انجنوں کی کان کے پردے پھاڑ دینے والی آواز گونجی۔ لڑکے جا چکے تھے۔ کشمکش ختم ہو گئی تھی اور وکرم کی زندگی بھی۔ بوڑھا اپنے قریبی پڑوسیوں کے درمیان کھڑا رہ گیا۔

انھوں نے لڑکوں کو بات کرتے ہوئے سن لیا تھا۔ وہ تعزیت کرنے بوڑھے کے پاس گئے۔ اب آنسو تیزی سے گالوں سے بہ کر نیچے گر رہے تھے۔ اس نے اپنی بیٹی کو گلے سے لگایا اور ہچکیاں لے کر رونے لگا۔ پڑوسی اسے سہارا دے گھر کے اندر لے آئے۔

اگلی صبح دس بجے کے قریب دور سے ہی مجمع کے زبردست شور کی آواز آ رہی تھی۔ پڑوسی اپنے گھروں سے نکل آئے۔ ہجوم بوڑھے کے گھر کی جانب بڑھ رہا تھا۔ مجمع کے آگے پھولوں سے لدی ہوئی ایک جیپ تھی جس پر اس کے بیٹے کی میّت رکھی تھی۔ جیپ کے پیچھے نعرے لگاتے ہوئے ہزاروں طلبہ تھے۔

بوڑھا جانتا تھا کہ وکرم آ رہا ہے۔ پچھلے دن کا سارا منظر اس کے ذہن میں گھوم گیا اور اس کی آنکھوں میں خوف کا سایہ جھلکنے لگا۔ وکرم صبح چھ بجے اسکوٹر سے روانہ ہوا تھا اور آج اگلی صبح ایک بڑے ہجوم کے ساتھ وہ گھر واپس آ رہا تھا لیکن مردہ! کیسی عجیب تھی یہ واپسی!

ہجوم بوڑھے کے دروازے پر آ کر رک گیا۔ لڑکوں نے وکرم کی میّت کو پھولوں سے سجا رکھا تھا۔

بھاری قدموں سے چلتا ہوا بوڑھا جیپ کے پاس پہنچا۔ اس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ بڑھیا اور اس کی بیٹی اس کے پیچھے کھڑی تھیں۔ صرف وکرم کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ باقی جسم پھولوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ایک لڑکا پھولوں کی مالا لے کر آگے آیا اور بوڑھے کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولا۔ ”انکل، آنٹی اور بے بی، آپ بھی یہ پھول میّت پر چڑھا دیجیے“۔

بوڑھی عورت بے ہوش ہونے کے قریب تھی مگر بوڑھے نے خود پر قابو رکھا ہوا تھا۔ کیمرے کا بلب چمکا۔ ایک لڑکا ہجوم سے نکل کر بوڑھے کے پاس آ کر بولا ”انکل کیا آپ ہمارے ساتھ شمشان نہیں چلیں گے؟“

بوڑھے کو دم سا گھٹتا محسوس ہوا۔ ایک ایک لفظ بڑی مشکل سے اس کے منہ سے نکل رہا تھا۔ ”کون؟... میں..... میں تمہارے ساتھ کیسے جا سکتا ہوں بیٹے؟ کیا ایک باپ اپنے بیٹے کی میّت کے ساتھ شمشان جاتا ہے؟ وہ یقیناً بہت بدنصیب باپ ہوگا جو...“

تمام لڑکے خاموش تھے۔ کچھ دیر بعد وکرم کی میّت جیپ سے اتار کر اس کے گھر کے دروازے تک لائی گئی۔ جب رسومات پوری ہو گئیں تو لڑکوں نے پھر میّت کو کاندھوں پر اٹھا لیا اور پوری کالونی نعروں سے گونجنے لگی...!

”شہید وکرم بھائی زندہ باد!“

لڑکے کچھ دیر تک نعرہ دہراتے رہے اور پھر چل پڑے۔ پڑوسی ان کے پیچھے ہو لیے۔

بوڑھے کو لگا جیسے لڑکے اس کے خوابوں کا جنازہ اپنے کاندھوں پر اٹھائے ہوئے ہیں۔

وہ اشکبار آنکھوں سے دور جاتے ہوئے جلوس کو دیکھنے لگا۔ ہزاروں کی تعداد میں طلبہ اپنے ہاتھ اوپر اٹھا کر وہی نعرے دہرا رہے تھے۔ بوڑھے نے سوچا اس کا بیٹا یقیناً کوئی بڑی ہستی تھی ورنہ اس کے جنازے کا جلوس اتنا بڑا نہ ہوتا۔ اس کے پورے وجود میں فخر کی لہر دوڑ گئی۔

تسکین کا احساس اس پر حاوی ہوتا جا رہا تھا اور وہ گہری سوچ میں غرق ہو گیا۔ اس کے خیالوں کا تانتا ایک دلدوز نعرے سے ٹوٹ گیا جسے لڑکے بار بار دہرا رہے تھے۔ رام نام سنگ ہے۔ بھگوان تمہارے ساتھ ہو۔

بوڑھے نے گردن گھما کر اپنی غم سے نڈھال بیوی اور بیٹی کو دیکھا۔ اسے لگا جیسے اس کے گھر کا مستقبل اس کے کندھوں سے گر کر ٹوٹ کر بکھر گیا ہے۔ پھر اس پر خاموشی طاری ہو گئی۔ ◆◆◆

ہاجرہ رضا

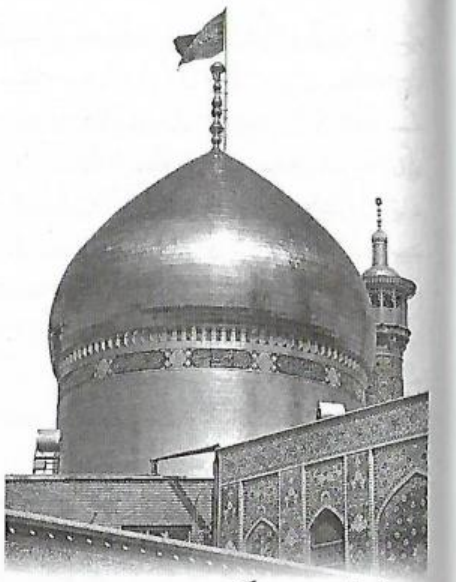

شاہوں کے دیس میں

ایران میں بسر کیے گئے چند شب و روز کا احوال

یہ تقریباً چار سال پہلے کی بات ہے، زیارات دیکھنے کی تمنا لیے ایران جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ مملکت عوام کے احتجاج کی وجہ سے پچھلے دنوں مرکزِ نگاہ بنی رہی۔ ایران کی سیاحت کے دوران میرے دل و دماغ نے جو احساسات و تاثرات اخذ کیے، وہ قارئین اُردو ڈائجسٹ کی خدمت میں پیش ہیں:

سرزمین پنجاب کے باسی ہریالی سے مانوس ہیں۔ زندگی کے ہر لمحے کو بھرپور انداز میں جیتے ہیں۔ اہلِ پنجاب کو زمین کے سنگلاخ ہونے کا ذرا کم ہی اندازہ ہوگا جو پانچ دریاؤں کی سرزمین پر بستے ہیں۔ وہ پانی کی نایابی کا شاید ہی احساس کر پائیں۔ کہاں لاہور کی ٹھنڈی سڑک اور ہرے بھرے کھیت اور کہاں سنگلاخ پہاڑ، بنجر چٹیل میدان جو پاک ایران سرحد کا خاصہ ہے۔

ایک مٹی کے کتنے رنگ و روپ ہیں۔ مٹی کا ایک رنگ یہ خاکی پتلا بھی ہے، میں بھی اور آپ بھی۔ خالق کی کاری گری کی منہ بولتی تصویر، لفظ ”کُن“ کی پیداوار... انھی سوچوں میں گم ہاتھ میں سبز رنگ کا پاسپورٹ تھامے پتھر کے بنچ پر بیٹھی اپنی باری کی منتظر تھی۔ سوچوں کا سلسلہ تب ٹوٹا جب چھوٹے سے حبس زدہ کمرے سے دوسرے کمرے میں طلب کیا گیا جہاں پاکستانی عملہ شیشے کی دوسری جانب سرزمین ایران کی طرف سفر کرنے والوں کے پاسپورٹ پر خروج کی مہر لگانے اور کچھ دوسری ذمہ داریاں نبھانے کے لیے موجود تھا۔ پاسپورٹ پر مہر لگوا کر میں ایک طویل قطار میں لگ گئی۔

تپتا ہوا چٹیل میدان، جون کے مہینے کا چمکتا، دہکتا سورج سوا نیزے پر، یوں لگتا تھا کہ دانہ زمین پر گرا تو بھن جائے گا۔ اس گرمی کے عالم میں سائے کا کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ پاک ایران بارڈر کھل چکا تھا۔ قطار خاصی طویل تھی۔ صبر آزما انتظار کی کیفیت میں سرکتے سرکتے وہ مقام آ پہنچا جہاں قدموں نے پاک سرزمین کو خدا حافظ کہا اور سرزمین فارس کو چھو لیا۔

سایہ کہیں نہ تھا

ایران دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں سے ایک ہے۔ اس ملک کی تاریخ سات ہزار قبل از مسیح تک پھیلی ہے۔ مشہور صحابی حضرت سلیمان فارسیؓ اسی ملک کے باشندے تھے۔ اس ملک کا قدیم مذہب آتش پرستی تھا۔ پاکستان، بھارت اور افغانستان میں جو پارسی قوم آباد ہے، یہ لوگ ایران ہی سے برصغیر اور خطے کے دیگر علاقوں میں پھیلے۔ فارس کا صدیوں سے جلتا ہوا آتش کدہ اس وقت سرد پڑ گیا

www.urdudigest.com

جب میرے نبی ﷺ کی ولادت ہوئی۔ ایران کی سرزمین پر قدم رکھا تو جنگ قادسیہ کا معرکہ تصور میں اُبھرا جس کے نتیجے میں آج ایران کی اٹھانوے فیصد آبادی مسلمان ہو چکی۔

کچھ دیر اجنبیت کا احساس دامن گیر رہا کہ زبان جدا، تہذیب جدا، سرحدوں پر لہراتے پرچم جدا لیکن سرحد کے پار پہنچ کر احساس یکسر بدل گیا۔ میں مسلمان، میرا ملک اسلامی جمہوریہ پاکستان اور یہ اسلامی جمہوریہ ایران! ایسا لگا ایران نے اپنی باہیں میرے استقبال کے لیے کھول دیں، ایک اپنائیت کا احساس ہونے لگا۔

اب سامان کی تلاشی کا مرحلہ آیا۔ ہمارے پاس ایک چھوٹی ٹرالی اور ایک ہینڈ بیگ تھا۔ کم سامان لانے کا یہ فائدہ ہوا کہ تلاشی کا مرحلہ جلد طے ہو گیا۔ قطار میں مجھ سے آگے کھڑے لوگ زیادہ سامان کی وجہ سے پیچھے رہ گئے۔ ہم ایک ایسے راستے پر اپنی ٹرالی کھینچ رہے تھے جسے دونوں طرف سے اونچے اونچے جنگلے لگا کر بند کیا گیا تھا۔ اس راستے کا اختتام ایک عمارت پر ہوا جہاں ایک اور قطار ہماری منتظر تھی۔ عمارت کا دروازہ بند تھا اور چند فوجی جوان وہاں فرائض انجام دے رہے تھے۔

ایران میں داخل ہونے سے لے کر اس عمارت تک سارے راستے سائے کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ سر پر سورج آگ برسا رہا تھا اور دروازہ کھلنے کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیتے تھے۔ گرمی اور انتظار نے بیجانی کیفیت طاری کر دی۔ سایے کی فراہمی سے مسافروں کو سہولت مل جاتی مگر میں کس سے کہتی؟ اپنی رائے دینے کا واحد ذریعہ زبان ہے اور یہاں سب سے بڑا مسئلہ ہی زبان کا تھا جس کا تجربہ تلاشی کے دوران بھی ہو چکا تھا۔

ایرانی فارسی کے علاوہ کوئی اور زبان بولنا پسند نہیں کرتے۔ وہ انگریزی سے ایسے ہی نفرت کرتے ہیں جیسے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد برصغیر کے مسلمان کرنے لگے۔ اچانک دیکھا کہ ایک بوڑھے شخص کے اردو میں کیے گئے تبصرے پر ایرانی فوجی جوان مسکرایا جس سے معلوم پڑا کہ وہ اردو سمجھتا ہے۔ اپنی درخواست اس فوجی جوان کے گوش گزار کی تو اس نے اشارے سے بتایا کہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی لیکن میری حیرت کی اس وقت کوئی انتہا نہ رہی جب واپسی کے دوران اسی مقام پر لگے ہوئے سایہ دینے والے شیلٹر دیکھے۔ کاش ہمارے ملک میں بھی عوام الناس کی اس طرح سنوائی ہو جاتی۔ عمارت کا دروازہ کھل گیا۔ مسافر اندر داخل ہونے لگے۔ کاغذی کارروائی کے بعد بیرونی دروازے سے مسافر باہر نکل رہے تھے۔

موبائل پر نظر ڈالی ایک چھوٹا سا آرڈر دکھائی دیا۔ سم اب رومنگ پر تھی۔ موبائل پر پاکستانی وقت ساڑھے چار بج رہے تھے جبکہ عمارت پر لگی گھڑی چار بجا رہی تھی۔ مسکراہٹ لبوں پر پھیل گئی۔

قافلہ سالار نے ایک ویگن کا انتظام کر لیا تھا۔ بس پاکستانی ویگن کے طرز کی تھی۔ اس ویگن نے ہمیں بس اڈے پر اتارنا تھا جہاں سے قافلے کو شہر قم جانے کے لیے بس پکڑنا تھی۔ قافلے میں زیادہ تر لوگ جوان تھے اور بچوں کی بھی اچھی خاصی تعداد تھی۔ ایک صاحب نے اپنا لیپ ٹاپ نکالا اور ایک ریکارڈ شدہ مزاحیہ پروگرام لگا لیا۔

ریال یا تمان؟

سب کا تھکن و بھوک سے برا حال تھا۔ بچے ماؤں کی گود میں گر گر کر سو رہے تھے۔ ہم نے جس ٹرمینل سے بس لینی تھی وہیں سے کھانا بھی کھانا تھا۔ یہ سالار صاحب کی ہدایت تھی۔ ایرانی کرنسی پاک ایران بارڈر پر ہی بدلوائی تھی۔ مزے کی بات یہ کہ ایرانی کرنسی کو کہتے تو تمان ہیں مگر نوٹ پر ریال لکھا ہوتا ہے۔ ریال اور تمان میں ایک صفر کا فرق ہے۔ اگر آپ کے ہاتھ میں ہزار ریال کا ایرانی نوٹ ہے تو اس کی قیمت سو تمان کے برابر ہے۔ چیزیں بھی آپ کو تمان

میں ہی ملیں گی لیکن نوٹ پر ریال کیوں لکھا ہوتا ہے، اس کا راز معلوم نہیں ہو سکا۔

یاد آیا ایرانی تو باتھ روم اور ٹوائلٹ کے الفاظ سے بھی واقف نہیں۔ اب سفر ہوا اور وہ بھی بس کا تو ٹوائلٹ کی تو بہت ضرورت پڑتی ہے۔ وہ تو اللہ بھلا کرے ہمارے پھوپھا جان کا کہ چلتے ہوئے انہوں نے یہ بتا دیا کہ ٹوائلٹ کو فارسی میں دست شوئی کہتے ہیں۔ ٹرمینل پر اترتے ہی دست شوئی کی تلاش شروع ہوئی۔ اب خالص اُردو آنے کا کچھ فائدہ ہوا۔ اُردو لشکری زبان ہے کچھ الفاظ فارسی کے ہمیں بھی آتے تھے جن کو بروئے کار لا کر دست شوئی تلاش کر لیا۔ راست یعنی دائیں، چپ یعنی بائیں، مستقیم یعنی سیدھا۔ راست و چپ کرتے ہم دست شوئی تک پہنچ گئے۔

اس کو دیکھ کر شہر کوئٹہ سے لے کر ایرانی بارڈر تک کے سارے پاکستانی دست شوئی یاد آ گئے۔ ہمارے ہاں کے اکثر بیت الخلاء چھتوں اور بجلی سے محروم تھے۔ بیت الخلا میں پانی باہر سے لے کر جانا پڑتا تھا کیونکہ اندر کسی نل کے کوئی آثار موجود نہ تھے۔ اگر حضرت چرکین ایران جاتے تو اس سفر کے دوران اپنا دیوان مکمل کر لیتے۔ چرکین وہ ہندوستانی شاعر ہیں جس کی ساری شاعری بیت الخلا سے متعلق رہی۔

دست شوئی بہت بڑا تھا۔ مرد و خواتین کا الگ الگ تھا۔ اندر بہت سارے کیبن تھے۔ دست شوئی میں ایرانی خواتین کے لباس کا پتا چلا۔ ابھی تک انھیں دیکھنے کا اتفاق ہوا تو سر سے لے کر پاؤں تک یہاں کالی چادر ہی پر نظر پڑتی اور سر کو اسکارف کی مدد سے چھپایا ہوتا۔ اب پتا چلا کہ خواتین بھی ایرانی مردوں کی طرح انگریزی لباس ہی پہنتی ہیں، یعنی پینٹ شرٹ۔ دست شوئی میں جو منظر تھا، ایرانی خواتین رضا شاہ پہلوی کے دور میں بازاروں اور گلی کوچوں میں ایسے ہی نظر آتی تھیں۔

سعد آباد پیلس اور چلو کباب

رضا شاہ پہلوی ایرانی فوجی افسر تھا جس نے فوج میں ۱۹۳۶ء تا ۱۹۴۱ء خدمات انجام دیں اور دوسری جنگ عظیم کے دوران ستمبر ۱۹۴۱ء میں رضا پہلوی شاہ ایران بنا گیا۔ رضا شاہ نے تقریباً سینتیس سال ایران پر حکومت کی۔ ۱۱ فروری ۱۹۷۹ء کو ایران میں انقلاب برپا ہوا۔ ایرانی انقلاب کے روح رواں امام خمینی تھے۔ رضا شاہ نے اپنی حکومت بچانے کے لیے ایرانیوں کا قتل عام کیا۔ امام خمینی کو جلاوطن کر دیا۔ انقلابی راہنماؤں کو سزائیں بھی دی گئیں۔ بالآخر انقلاب برپا ہوا اور رضا شاہ کی حکومت کا خاتمہ ہوا۔

ایرانی آج بھی امام خمینی سے بہت عقیدت و محبت رکھتے ہیں۔ آپ کے شاگرد آیت اللہ خامنئی آج ایران کے سپریم لیڈر ہیں۔ رضا شاہ کی اقامت گاہ آج بھی تہران میں موجود ہے۔ اس کو سیر گاہ کے طور پر ہر خاص و عام کے لیے کھول دیا گیا ہے۔ تین سو ایکڑ پر پھیلا ہوا یہ علاقہ سعد آباد پیلس کہلاتا ہے۔ اس کی تعمیر احمد شاہ قاچار اور رضا شاہ نے کروائی تھی۔ سعد آباد میں اکیس عجائب گھر ہیں۔ اس میں ایک وائٹ ہاؤس ہے جو رضا شاہ اور اس کی بیگم فرح کے زیر استعمال تھا۔ سونے سے بنے دروازوں کے قبضے بھی طلائی ہیں۔ ان میں رضا شاہ اور اس کے خاندان کے زیر استعمال اشیاء محفوظ ہیں۔ لوگ اس کو دیکھنے کے لیے تہران میں رضا شاہ کی اقامت گاہ کا رخ کرتے ہیں۔

تازہ دم ہونے بعد اب پیٹ پوجا کی باری آئی۔ صاف

ایران کی مشہور سوغات... چلو کباب

www.urdugem.com

ستھرے اور جدید طرز کے ٹرمینل میں طعام کا بھی مناسب انتظام تھا۔ کھانا منگوانا گویا ایک اور محاذ سر کرنے کے مترادف تھا۔ کسی نے غالب کو قبر میں رُلاتے اور محفل کو محظوظ کرتے ہوئے کہا تھا:

فارسی ہم کو مگر نہیں آتی
اُردو تم کو بھی نہیں آتی
پہلے آتی تھی حال دل پہ ہنسی
بھوک کے مارے اب نہیں آتی

اقبال اگر زندہ ہوتے تو ہمارے حال پر ضرور اشک بار ہوتے۔ ایرانی اقبال کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کو اقبال لاھوری کے نام سے پکارتے ہیں۔

ٹرمینل ہی میں معلوم ہوا کہ برائے طعام چلو کباب اور چلو جوجا دستیاب ہیں۔ جوجا کیا ہے؟ سر کے اوپر سے گزر گیا۔ کباب سے شناسائی تھی، لہٰذا چلو کباب منگوانے پر اتفاق ہوا۔ چلو کباب کی پلیٹ سامنے آئی۔ اسٹیل کی چھوٹی سی ٹرے میں ابلے ہوئے چاول اور دو بڑے سائز کے سیخ کباب۔ چاولوں کا ایک ایک دانہ الگ الگ تھا۔ کہیں کہیں انار دانہ جیسی چیز پڑی ہوئی تھی لیکن وہ نہیں تھا۔ اس کو فارسی میں زرشت کہتے ہیں۔ اب جوجا کا حال سنیں۔ جوجا مرغ کو کہتے ہیں۔ چاولوں پر چکن باربی کیو رکھ کر پیش کیا جاتا ہے۔

کھانا شروع کیا تو پہلا نوالہ ہی حلق سے نیچے اتارنا مشکل ہوگیا۔ کباب میں مرچ مسالے چھو کر نہیں گزرے تھے۔ سوائے نمک کے۔ پیاز اور ادرک کی غیر موجودگی نے ایسی بساند پیدا کردی تھی جیسی پاکستان میں بکرا عید پر ہر گھر سے آتی ہے۔ جیسے تیسے صرف چاول کھا کر پیٹ بھرا اور خدا کا شکر ادا کیا۔ دیار غیر میں پیٹ بھر جائے یہی بھلا۔ کھانا کھانے کے بعد ایک بات تو معلوم پڑ گئی کہ ایرانیوں کی سرخ و سفید رنگت کا آخر راز کیا ہے۔ مرچ مسالوں سے یہ کوسوں دور جو ٹھہرے۔

چائے کے رسیا اب بھی اپنی کرسیوں پر براجمان تھے مگر ایران میں چائے کہاں، ہاں قہوہ دستیاب ہے۔ چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں منہ میں مصری دبا کر قہوہ پیا جاتا ہے۔

چائے پینے والے افراد بالکل مایوس نہ ہوں، ''آب جوش'' (گرم پانی) با آسانی مل جائے گا۔ بس ''ٹی بیگ'' اور ''ٹی واسٹر'' آپ کو ہمراہ لانا پڑے گا۔ ایران میں اسٹیل کی ٹنکی سے گرم پانی مل جائے گا، جیسے ہمارے ہاں شادیوں میں پانی یا گلابی چائے کے لیے رکھی جاتی ہیں۔ ایسی ہی ٹنکی سے آپ با آسانی گرم پانی حاصل کر سکتے ہیں۔ چائے سے فراغت کے بعد بس کے ذریعے شہر قم کی طرف باقاعدہ سفر کا آغاز ہوا۔ بس اور ہائی وے دور جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ تھے۔

قم کی راہ پر

درمیان میں ایک مقام پر بس کچھ دیر کے لیے رکی۔ کچھ دیر قیام کے بعد بس دوبارہ اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہوئی۔ رات بھر بس اس طرح چلتی رہی، صبح تقریباً نو بجے بس شہر قم کی حدود میں داخل ہوگئی۔

قم قدیم شہر اور علمی مرکز ہے۔ اس شہر کی آب و ہوا گرم اور خشک ہے۔ گرمیوں میں یہاں کا درجہ حرارت سینتالیس ڈگری تک پہنچ جاتا ہے۔ یہاں کی تاریخ سات ہزار قبل از مسیح کی ہے۔ اس شہر کو مسلمانوں نے تئیس ہجری میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی قیادت میں فتح کیا۔ قم چند حوالوں کی وجہ سے مشہور ہے جس میں سب سے بڑا حوالہ حضرت بی بی معصومہ قم کا روضہ اقدس ہے۔ آپ کا نام نامی فاطمہ بنت موسیٰ کاظمؒ ہے۔ آپ امام موسیٰ کاظمؒ کی صاحبزادی اور امام رضاؒ کی بہن تھیں۔ امام موسیٰ کاظمؒ شیعہ اثنا عشری کے ساتویں امام ہیں اور آپ کا سلسلہ نسب رسول ﷺ خدا سے چھٹی پشت میں ملتا ہے۔ کاظمی سید آپ ہی کی اولاد ہیں۔ آپ کا روضہ مبارک عراق کے شہر کاظمین میں ہے۔

بی بی معصومہ قم مدینہ میں پیدا ہوئیں۔ مدینہ سے ایران کس طرح تشریف لائیں تاریخ میں اس حوالے سے ملتا ہے

امام علی رضاؒ کا روضہ

کہ آپ نے بھائی کی محبت میں ملک فارس کا سفر کیا۔ امام رضاؒ اس وقت خراسان میں تھے۔ آپ نے کافی عرصہ وہاں قیام کیا۔ بہن بی بی معصومہ بھائی کی محبت میں بے تاب ہوکر بھائی سے ملاقات کو تشریف لا رہی تھیں کہ کچھ دشمنوں نے قافلے پر حملہ کر دیا۔ بہت سے مرد مارے گئے۔ آپ نے شہر میں قیام کیا۔ اس دوران آپ کو زہر دیا گیا۔ آپ علیل ہوگئیں اور چند ہی دنوں میں اس دنیا کو اللہ حافظ کہہ کر دار بقا میں اپنے بھائی سے ملاقات کے لیے رخصت ہوگئیں۔ آپ کو قم میں دفن کیا گیا۔

بس نے ہمیں خیابانِ ارم نامی سڑک پر اُتار دیا۔ سڑک کے دونوں اطراف بازار تھے۔ ایک طرف صرافہ بازار جبکہ دوسری جانب روزمرہ کے استعمال کی چیزیں بک رہی تھیں۔ مرد و زن خریداری میں مصروف تھے۔ مردوں نے بچے اٹھائے ہوئے تھے۔

ایران میں آپ کو بچے ماؤں کی گود میں نہیں بلکہ باپ کی آغوش میں نظر آئیں گے۔ صرافہ بازار کا رخ کریں تو وہ بہت بڑا معلوم ہوتا ہے۔ سونے کے سیٹ، چوڑیاں، انگوٹھیاں ہر طرح کے سونے کے زیورات دستیاب تھے۔ زیورات کے ڈیزائن خوبصورت تھے۔ سونے کی قیمت بھی پاکستان سے خاصی کم تھی۔ پاکستان میں سونا زیادہ خالص ہوتا ہے، اکیس بائیس قیراط جبکہ وہاں اٹھارہ قیراط کا سونا دستیاب تھا۔

سڑک سے جوں ہی گلی میں مڑے، جنرل سٹور، پھلوں، خشک میوجات اور حلوے کی دکانیں نظر آنے لگیں۔ یہ لاہوری سوجی کے حلوے کی دکانیں نہیں تھیں بلکہ سوہن حلوہ اسٹیل کے سرخ رنگ کے ڈبوں میں مل رہا تھا۔

پھلوں کی دکانوں پر تازہ پھل دستیاب تھے۔ پھلوں کا

www.urdugem.com

سائز کافی بڑا تھا۔ کیلے کو ہی لے لیں، یہ لمبا کیلا جس پر کہیں بھی کوئی کالا دھبہ نہیں تھا۔ وہ ویسا کیلا تھا جیسا بچوں کے قاعدے میں بنا ہوتا ہے۔ چیری، سردہ، آڑو اور انگور بھی پھلوں کی دکانوں کی زینت تھے۔

پھلوں کے ساتھ ساتھ خشک میوہ جات ایرانیوں کی مرغوب غذا ہے۔ مختلف پھلوں کے بیج مخصوص طریقے سے سکھا کر نمک لگا فروخت ہوتے ہیں۔ یہ ایران کی سوغات ہیں۔ خشک میوہ جات کی بھی کافی دکانیں موجود تھیں۔

انوکھے ایرانی تندور

اسی گلی میں فندق نور نامی ہوٹل واقع تھا۔ جہاں ہماری بکنگ پہلے سے تھی۔ ہوٹل میں سامان رکھ کر نہا دھو تازہ دم ہوئے۔ فرش پر عمدہ قالین بچھے ہوئے تھے۔ ایران کی بات ہو اور قالین کا ذکر نہ آئے۔ ایرانی قالین کی صنعت ڈھائی ہزار سال پرانی ہے۔ ایرانی قالین کا ذکر یونانی تحریروں میں ملتا ہے۔ اب ہمیں ناشتا کرنا تھا۔ ایرانی زیادہ تر ناشتے میں قہوہ کے ساتھ روٹی کھاتے ہیں یا کریم پر شہد ڈال لیتے ہیں۔ اس کے ساتھ بھی قہوہ لازمی ہے۔ روٹی، کریم اور شہد کا ناشتا کرتے ہوئے ہم روٹی کی ساخت پر غور کرتے رہے۔ روٹی ذائقے میں لاہوری نان جیسی ہی تھی پر واضح فرق اس کی بناوٹ کا تھا۔ پاکستان میں زیادہ تر روٹی گول ملتی ہے۔ ایرانی روٹی مستطیل تھی اور بڑی اتنی کہ تقریباً پاکستانی چار نان کے برابر۔

راستے میں تندور تو میں دیکھ ہی چکی تھی۔ تندور دیوار میں بنایا گیا تھا نہ کہ زمین میں۔ تندور میں مختلف طرز کی روٹیاں لگائی جارہی تھیں۔ روٹی اندر ڈالنے کا طریقہ کار کچھ یوں تھا: لمبے بانس کے آگے ایک مستطیل سانچہ لگا ہوا تھا۔ روٹی بیل کر سانچے پر پھیلا دیا جاتا۔ پھر بانس کھڑکی میں داخل کر روٹی

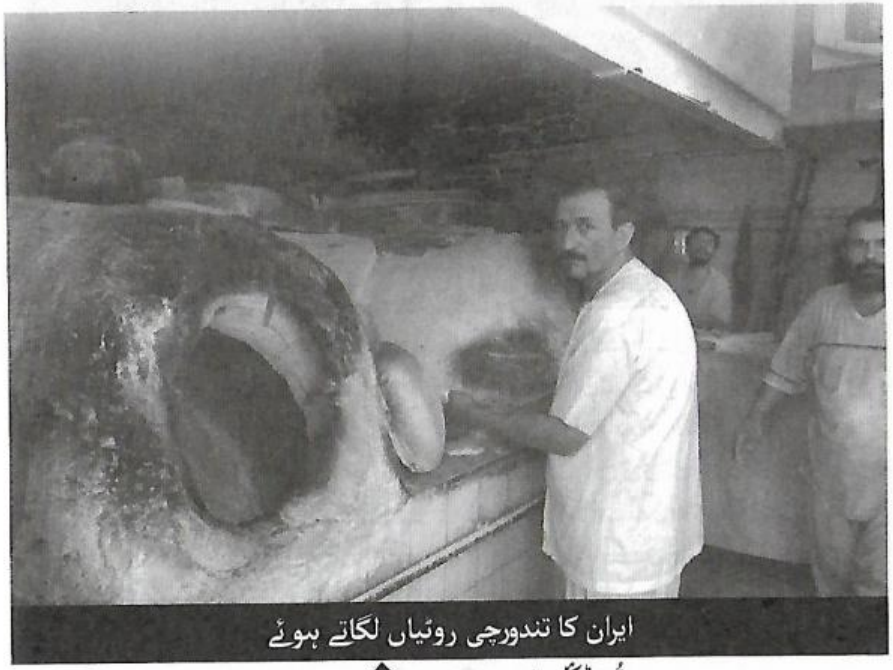

ایران کا تندورچی روٹیاں لگاتے ہوئے

کو تندور کی دیوار پر چپکا دیا جاتا۔

تندور پر خاصا رش تھا۔ بلکہ ہر تندور پر ہجوم دکھائی دیا۔ وجہ یہ کہ ایران میں گھروں میں روٹی پکانے کا رواج نہیں کیونکہ وہاں آٹا ہی نہیں ملتا۔ اگر آپ غیر ملکی ہیں اور ایران میں رہائش پزیر ہیں تو صرف دو کلو آٹا آپ کو مل جائے گا۔ ایرانی آٹا نہیں خرید سکتے کیونکہ حکومت نے یہ ذمے داری لے رکھی ہے کہ روٹی ہر غریب تک پہنچ جائے۔

فندق نور کے سامنے ایک گلی سیدھی روضہ بی بی معصومہ قم پر نکلتی تھی۔ اب تک جتنی سڑکیں ایران میں دیکھی تھیں سب پر تارکول کی تہ خوب چمکتی نظر آئی۔ ایسا لگتا تھا کہ سڑک نئی نئی بنی ہے۔ اس راز سے پردہ تب اٹھا جب ایک صبح سڑکیں دھلنے کا منظر دیکھا۔

بے مقصد ہی ایک جنرل سٹور میں داخل ہو کر میں نے پانچ سو تمان کا ایک جوس ٹن اور پانچ سو تمان میں چپس کا پیکٹ خریدا۔ میرے پاس ابھی وہی کرنسی تھی جو پاک ایران بارڈر پر تبدیل کروائی تھی۔ ایک ہزار پاکستانی روپے بارہ ہزار تمان کے برابر تھے۔ پاکستانی سو روپے کے اندر اندر ایک جوس کا ٹن اور ایک چپس کا بڑا پیکٹ خرید لیا۔

بی بی معصومہ کا روضہ

بی بی معصومہ کے روضے میں داخل ہوتے ہوئے ایک صدا نے روک لیا۔ دیکھا تو مجھے ہی طلب کیا جارہا تھا۔ صدا دینے والی خانم نے روایتی انداز میں سر پر اسکارف اور زمین پر لوٹتی بڑی سی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ بڑی محبت سے فارسی میں بولے جانے والے جملوں میں سے صرف امانت داری ہی سمجھ میں آیا۔ ہاتھ کے اشارے کی سیدھ میں دیکھا تو معلوم ہوا کہ کوئی کمرا ہے جس کی کھڑکی پر کچھ خانمیں یعنی خواتین کھڑی تھیں۔ وہ اپنے سامان جمع کروانے اور ٹوکن وصول کرنے میں مصروف تھیں۔

امانت داری میں اپنا بیگ جمع کروانے اور ٹوکن وصول کرنے کے بعد دوبارہ پہلی خانم کے پاس سے گزری۔ خانم نے فارسی کا ایک جملہ میری طرف اچھالا جسے میں نے کیچ کرلیا۔ خیلی ممنون، بہت شکریہ۔

روضہ بی بی معصومہ میں دروازے سے داخل ہوتے ہی ایک وسیع و عریض صحن ہے۔ جس کے بیچ میں ایک بڑا سا حوض بنا ہے۔ دائیں جانب ایک قبر ہے۔ صحن کے فرش کی رنگت سلیٹی ہے۔ روضہ پر ایک سنہرا گنبد بنا ہے جس کو دور سے بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

صحن کے چاروں طرف محرابیں ہیں۔ دیواروں اور محرابوں کو کاشی کاری کے ذریعے مزین کیا گیا ہے۔ صحن عبور کر کے سامنے قبر بی بی معصومہ میں داخلے کا سنہرا دروازہ ہے۔ دروازے سے داخل ہونے سے پہلے اس کے بغل میں ایک کمرا ہے جس کے باہر سبز رنگ کی تقریباً تین چار فٹ اونچی لوہے کی ٹوکریاں رکھی تھیں۔ ان میں سفید رنگ کی تھیلیاں موجود تھیں۔ ان کا مقصد مجھے چند لمحوں میں سمجھ آ گیا۔ ہر کوئی یہاں سے ایک تھیلی نکالتا اور اس میں اپنے جوتے چپل ڈال دیتا۔ زیادہ تر کی کوشش ہوتی کہ ہاتھ جوتے چپل کو نہ چھوئے جوتوں کی تھیلی لے کر وہ سامنے والے کمرے میں چلا جاتا جہاں چھوٹے چھوٹے خانوں میں جوتے رکھنے کا انتظام تھا۔

سامنے کھڑے شخص نے جوتوں کی تھیلی ہم سے لی اور ایک ٹوکن تھما دیا۔ اس کمرے کے بغلی دروازے سے نکل کر ہم سنہرے دروازے کے سامنے تھے۔ کافی رش تھا۔ یہ سنہرا دروازہ خواتین کے داخلے کا رستہ تھا۔ دروازے سے داخل ہوتے ہی سامنے ایک ضریح کو قبر کے اوپر بنایا گیا تھا۔ اس کا آدھا حصہ خواتین جبکہ باقی مردوں کی طرف تھا۔ ضریح کے بالکل اوپر ایک بڑا سا فانوس تھا۔ اگر مبالغے سے کام نہ لیا جائے تب بھی ہزاروں کی تعداد میں بلب اس میں لگے ہوئے تھے جو اس سنہرے گنبد کے عین نیچے تھا۔

www.urdugem.com

گنبد کا اندرونی حصہ بالکل شاہی قلعہ میں موجود شیش محل جیسا تھا۔ بلبوں کی روشنی ان شیشوں سے منعکس ہو رہی تھی اور وہ مقام بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ خواتین کا ایک سیلاب تھا اور ضریح تک پہنچنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ وہاں کھڑے جو کیفیت مجھ پر طاری ہوئی وہ بیان سے باہر ہے۔ ایک ایسی سیدزادی جن کا سلسلہ خاندان رسالت ﷺ سے چھٹی نسل میں جا کر مل جائے، اس ہستی کو اتنے قریب پانے کا احساس لفظوں میں بیان ہو ہی نہیں سکتا۔

بیشتر ایرانی خواتین دراز قد اور بھاری بھرکم تھیں۔ لیکن لڑکیاں دراز قد تو ہوتی ہیں لیکن موٹی نہیں ہوتیں اور ان میں اکثریت کی ناک پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اب یہ کیا ماجرا ہے؟ بعد میں راز یہ کھلا کہ ایران میں پلاسٹک سرجری کروانے کا بہت رواج ہے۔ اپنی ناک پتلی کروانا ان میں سرفہرست ہے۔ گویا ایرانی خواتین فیشن کی کسی حد تک دلدادہ ہیں۔ بال مختلف رنگوں میں رنگ کروانے کا بھی رواج ہے۔ ایرانی خواتین سماج میں بلند مقام رکھنے والا طبقہ ہیں۔ دبی ہوئی مسکین اور مظلوم نہیں بلکہ نڈر، باہمت ہیں۔ ان کے مقابلے میں ایرانی آغا (آقا) یعنی مردوں کے قد چھوٹے ہیں اور وہ دبلے پتلے ہوتے ہیں۔ شاید ہی کوئی ایرانی مرد آپ کو موٹا نظر آئے۔

...☆...

قم شہر شیعہ فرقے کا علمی مرکز تصور کیا جاتا ہے۔ اس شہر کے نواحی علاقے میں مسجد جمکران واقع ہے۔ یہ مسجد ۲۹۳ ہجری میں تعمیر ہوئی۔ رقبے کے لحاظ سے وسیع و عریض مسجد ہے۔ اس کے پانچ گنبد اور دو مینار ہیں۔ درمیان میں واقع گنبد باقی چار گنبدوں کی نسبت بڑا ہے۔ کاشی کاری نے مسجد کی خوبصورتی میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ مقامی افراد کا عقیدہ ہے کہ ۳۷۳ھ میں یہاں شیخ حسن بن مثلہ جکمرانی نامی عالم دین کی امام مہدیؑ اور حضرت خضرؑ سے ملاقات ہوئی تھی۔ اسی لیے مقامی لوگ اسے مقدس سمجھتے ہیں۔ ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ حضرت امام یا مہدی ہر شب جمعہ یہاں نماز ادا کرتے ہیں۔ اس لیے شب جمعہ میں یہاں کافی رش ہوتا ہے۔ اس دسترخوان کا شمار دنیا کے وسیع دسترخوانوں میں ہوتا ہے۔ اس شب مسجد میں مفت کھانے کا انتظام بھی کیا جاتا ہے۔ یہ مسجد قم کی وجہ شہرت بتائی جاتی ہے۔

مشہد کی مسجد گوہر شاد

ہم پھر مشہد کی سمت رواں دواں ہوئے۔ اس شہر کے بازاروں میں گہما گہمی ہے۔ زندگی کی رفتار تیز ہے۔ گرمیوں میں مشہد کا موسم گرم رہتا ہے۔ سردیوں میں برف باری ہوتی ہے۔ وقت کی نبض تب تھمتی ہے جب روضہ امام رضاؑ میں داخلہ ہو۔ امام علی رضاؑ کے روضے کا کل رقبہ ۵۹۸,۶۵۷ میٹر ہے۔ روضے کا شمار دنیا کی بڑی مساجد میں ہوتا ہے۔ اس میں لاکھوں نمازی نماز ادا کر سکتے ہیں۔ روضے میں کل نو صحن اور 26 رواق ہیں۔ ان میں صحن انقلاب، صحن آزادی، صحن گوہر شاد، صحن قدس، صحن جمہوریہ اسلامی، صحن جامع رضویہ، صحن ہدایت، صحن رضوان اور صحن کوثر شامل ہیں۔

روضے میں داخل ہوتے ہی پہلے ان صحنوں میں سے کوئی صحن آئے گا پھر رواق آتا ہے۔ رواق فارسی کا لفظ ہے۔ انگریزی اور اردو میں اس کا متبادل ''ہال'' ہو سکتا ہے۔

روضے کے احاطے میں کتب خانہ ہے جس میں ہزاروں کی تعداد میں قیمتی کتب موجود ہیں۔ اسلامی یونیورسٹی، اسلامی تحقیقاتی ادارہ، عجائب گھر، دفاتر، ہسپتال، کھانے کا وسیع و عریض ہال، وضو خانہ، سقا خانہ اور نقار خانہ بھی اسی روضے کے اندر موجود ہے۔

مسجد گوہر شاد ایک قدیم مسجد ہے جس کی تعمیر ۱۴۱۸ء میں تیموری حکمران، شاہ رخ کی زوجہ گوہر شاد نے کروائی تھی۔ وسیع و عریض کھانے کے ہال میں ملکی اور غیر ملکی زائرین کے لیے مفت کھانے کا انتظام ہے۔ غیر ملکی زائرین کو اپنا پاسپورٹ ہمراہ لانا لازم ہے۔

عجائب خانہ کو آستانہ قدس رضویہ کہتے ہیں جس کے مختلف حصے ہیں۔ ایک حصے میں قدیمی قرآنی نسخے موجود ہیں۔ ایک میں وہ تحائف رکھے ہیں جو امام کو نذر کیے گئے۔ غرض بہت سے نوادرات اس عجائب کی زینت ہیں۔

رواق عبور کر کے جب اس ہال میں آئیں جہاں امام رضاؑ کی قبر ہے تو عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ قبر کے اوپر ایک مربع ضریح ہے۔ بی بی معصومہ قم کی طرح یہاں بھی اس ضریح کا آدھا حصہ مردوں اور آدھا عورتوں کی طرف ہے۔ ضریح چاندی سے بنی ہے اور کہیں کہیں سونے کی پٹیوں کے بارڈر ہیں۔ چھت سبز رنگ کی ہے۔ ہال کو جس مینا کاری اور کاشی کاری سے مزین کیا گیا ہے، اس میں بھی ہرا رنگ غالب ہے۔ چاروں کونوں پر سونے کے گلدان نصب ہیں جن میں پھول سجے ہوتے ہیں۔

جو پھول ضریح پر سجائے جائیں، عام نہیں ہوتے بلکہ انھیں وضو کے مخصوص پانی سے سیراب کیا جاتا ہے۔ روضے میں جتنے بھی وضو خانے ہیں، وہاں کے پانی سے باغ کو سیراب کیا جاتا ہے۔ اس باغ کے پھول یہاں پر سجائے جاتے ہیں۔ جب نئے پھول لگائے جائیں تب پرانے پھولوں کو چھوٹی چھوٹی پلاسٹک کی تھیلیوں میں بند کر تبرک کے طور پر تقسیم کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جو بے اولاد ہو، اگر اس پھول کی پتی کو کھائے اور دو رکعت نماز حاجت پڑھ کر اللہ سے دعا مانگے تو پروردگار اسے اولاد عطا کرتا ہے۔

امام ضامن کے بارے میں آپ نے سنا ہوگا۔ ایک کپڑے میں چند سکے باندھے جاتے ہیں۔ جو کوئی سفر پر جا رہا ہو اس کے دائیں بازو پر باندھ دیا جاتا ہے تاکہ مسافر حفاظت سے واپس آئے۔ اس امام ضامن کو بھی امام رضاؑ سے منسوب کر کے باندھا جاتا ہے۔

یہ اللہ والوں کے آستانے ہیں۔ یہ عیاں کرتے ہیں کہ جو اللہ کے لیے دنیا میں رہتے ہوئے دنیا کو ترک کر دے، اللہ پھر ان کے قدموں میں دنیا ڈال دیتا ہے۔

دعائیں یہاں قبول ہوتی ہیں۔ یہ نہیں دیتے، دینے والی ذات صرف اللہ کی ہے۔ ہاں یہ اللہ سے لے کر تقسیم کرتے ہیں۔ اس کے کارندے ہیں۔ جیسے کوثر اللہ کا ہے، پلائیں گے ساقی کوثر ﷺ!

نادر شاہ اور فردوسی کا مقبرہ بھی مشہد میں ہے۔ شہر میں جا بجا جدید مال، باغات، چڑیا گھر اور شاہ کا عوامی حمام بھی سیاحوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرواتے ہیں۔

...☆...

ہمارے ایک عزیز تھے، اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ قریب المرگ ہوئے تو ایک عجیب کیفیت میں گرفتار ہو گئے۔ جس گھر میں وہ رہائش پزیر تھے، اسے اپنا نہیں سمجھتے تھے۔ گھر والوں سے آنکھ بچا کر باہر نکل جاتے۔ گھر والوں کو چونکہ خبر تھی اس لیے ان پر کسی نہ کسی کی نظر رہتی۔ جب بھی کوئی ان کو پکڑ لیتا اور پوچھتا کہ آپ کہاں جا رہے ہیں؟ تو ایک ہی جواب دیتے کہ اپنے گھر جا رہے ہیں۔

کبھی تو اپنا بستر لپیٹ کر ساتھ لے جاتے۔ سب اہل خانہ نے سوچا کہ شاید ان کو اپنا وہ گھر یاد آتا ہے جہاں انھوں نے اپنی جوانی گزاری۔ جہاں ان کی شادی ہوئی اور بچے ہوئے۔ اندرون لاہور ان کا آبائی گھر تھا۔ ان کو وہاں لے جایا گیا۔ سب یہی سمجھ رہے تھے کہ اس کو وہ اپنا گھر کہیں گے۔ سب کو سن کر مایوسی ہوئی جب کچھ دیر بعد انھوں نے اپنے گھر جانے کا مطالبہ کر دیا۔

ایران میں چند دن گزارنے کے بعد جب ہم نے ملک عزیز پاکستان کے لیے رخت سفر باندھا اور بس میں سوار ہوئے تب اپنے وہ عزیز بہت یاد آئے۔ ہمارا بھی یہی مطالبہ تھا کہ ہمیں اپنے گھر جانا ہے۔ مگر ایک فرق تھا۔ ہمیں اپنے گھر کا راستہ معلوم تھا اور وہ ''اپنا گھر'' تلاش کر رہے تھے۔

◆◆◆

www.urdugem.com

معاشرتی کہانی

خاموش دل کی فریاد

وقار عثمان

ایک نیک روح کا منفرد قصّہ، اُسے اپنی نیکی کا خوب صلہ مل گیا

ایک عجیب سی بے چینی عبدالستار کو پریشان کر رہی تھی۔ وہ بوڑھا آدمی نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے اعصاب پر سوار ہو چکا تھا۔

"کون ہے وہ...؟"

"اس کی مشکل کیا ہے...؟"

آج تو پوچھ ہی لوں گا... اس بات نے عبدالستار کو تھوڑا سکون دیا۔

"مجھے دیر ہو رہی ہے....." اس نے اپنی بیوی کو آواز دی۔

"بس ہو گیا تیار۔" ساتھ ہی اس کی بیوی ناشتا لے آئی۔ ناشتا کرنے کے بعد وہ گھر سے نکلنے لگا تو لائبہ بولی۔

"ابو جی..... شام کو گھر لوٹتے ہوئے میرے لیے پیزا ضرور لے کر آنا...،،

"میں یاد رکھوں گا بیٹا۔،،

موٹر سائیکل پر سوار عبدالستار اپنے کام پر روانہ ہوا۔ جب وہ صدر چوک پہنچا تو اشارہ بند تھا اس لیے کھڑا ہو گیا۔ پیدل چلنے والے افراد جلدی جلدی سڑک عبور کر رہے تھے۔

اتنے میں عبدالستار کی نظر اسی بوڑھے شخص پر پڑی جس کو وہ آئے روز پیدل ہی آتا جاتا دیکھتا تھا۔ اس کی چال سے تھکاوٹ اور لڑکھڑاہٹ صاف نظر آ رہی تھی۔ اس کے باوجود وہ تیز چلنے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ اشارہ کھلنے سے پہلے سڑک پار کر سکے۔ وہ اپنی کوشش میں بمشکل کامیاب ہوا کیونکہ ادھر اس نے فٹ پاتھ پر پاؤں رکھا ادھر اشارہ کھلنے کی وجہ سے گاڑیاں چل پڑیں۔ اب وہ بوڑھا شخص فٹ پاتھ پر چل رہا تھا۔ عبدالستار نے موٹر سائیکل اس کے پاس جا کر کھڑی کر دی اور بولا:

"چاچا! آئیں..... آپ میرے پیچھے موٹر سائیکل پر بیٹھ جائیں۔ میں آپ کو منزل تک چھوڑ دوں گا۔"

پہلے تو اس شخص نے عبدالستار کو حیرت سے دیکھا کہ کہیں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا۔ وہ اتنے عرصہ سے پیدل آ جا رہا ہے، کبھی کسی نے اس کو خود سے لفٹ پیش نہیں کی تھی۔

آج عبدالستار نے اسے لفٹ دینے کی پیش کش کی تو اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ وہ حیرت سے عبدالستار کو تکتا رہ گیا۔ عبدالستار نے دوبارہ مسکراتے ہوئے کہا تو وہ موٹر سائیکل پر اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ بیٹھتے ہی اس کے تھکاوٹ سے بھرپور جسم کو ایک راحت اور سکون کا احساس ہوا۔

"چاچا آپ کیا کام کرتے ہیں؟" عبدالستار نے پوچھا۔

"ایک گھر میں چوکیدار ہوں بیٹا۔،،

"چاچا... آپ نے جانا کہاں ہے؟"

"بیٹا! مجھے ملت روڈ تک جانا ہے۔"

"واہ چاچا! یہ تو کمال ہو گیا۔ میں جس ہوٹل میں کام کرتا ہوں وہ بھی اسی سڑک پر ہے۔"

عبدالستار نے ان سے ایسے کہا جیسے پرانا تعلق ہو۔ ساتھ ہی موٹر سائیکل منزل کی طرف بڑھا دی۔ ہجوم سے نکل کر کشادہ سڑک پر پہنچتے ہی عبدالستار نے اس شخص سے بات چیت کا پھر سے آغاز کیا۔ اب اسے اپنے سوالوں کا جواب چاہیے تھا۔

"چاچا! میں روز آپ کو اتنی دور پیدل جاتا دیکھتا ہوں۔ آپ رکشے سے کیوں نہیں جاتے؟ بیس روپے میں آپ گھر بھی جلد پہنچ جائیں گے اور تھکاوٹ سے آپ کا برا حال بھی نہیں ہوگا۔"

"بیٹا! تم نے درست کہا۔ میں بھلا کیوں نہ چاہوں گا کہ پیدل چلنے کی مشقت سے بچوں اور گھر جلد پہنچ کر اپنے پوتوں پوتیوں کے ساتھ وقت گزاروں، مگر..."

"مگر کیا؟"

"مگر میری تنخواہ اس بات کی اجازت نہیں دیتی۔ میرے بچے دال چٹنی کھا کر گزارہ کرتے ہیں۔ میرے پیدل چلنے سے اتنی رقم بچ جاتی ہے کہ وہ مہینے میں دو، تین بار گوشت کھا سکیں۔ جس دن گھر میں گوشت پکتا ہے، اس دن میرے اُن کی خوشی دیدنی ہوتی ہے۔ بھلا میں بچوں کی خوشی کے بدلے اپنے آرام کی خاطر سواری کی سہولت کیسے حاصل کر سکتا ہوں؟"

"یہ بچے آپ کے بیٹے کے ہیں نا؟"

"ہاں... مگر ان کا باپ اللہ کو پیارا ہو چکا۔"

عبدالستار کا دل کسی انجانی طاقت نے اپنی مٹھی میں دبوچ لیا۔ اچانک اس نے موٹر سائیکل کو بریک لگائی۔ سامنے ہی قصاب کی دکان تھی۔ یہاں سے عبدالستار نے ایک کلو گوشت خریدا اور پھر شاپر موٹر سائیکل کے ہینڈل کے ساتھ لٹکا لیا۔

"یہ کس لیے بیٹا؟" اس بوڑھے آدمی کو جیسے بے چینی کا احساس ہوا تھا۔

"اپنے گھر کے لیے..."

"پھر ٹھیک ہے۔"

اب ایک بار پھر موٹر سائیکل ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد پیچھے بیٹھے شخص نے کہا:

"بیٹا...! اگلی گلی کے سامنے مجھے اتار دینا..."

عبدالستار نے اس کی بتائی ہوئی گلی کے سامنے موٹر سائیکل روکی۔ وہ بوڑھا شخص موٹر سائیکل سے اتر کر مصافحہ کرنے لگا تو عبدالستار بولا:

"میرا اور آپ کا راستہ ایک ہی ہے، اس لیے آئندہ آپ میرے ساتھ آ جایا کریں۔"

یہ سنتے ہی بوڑھے شخص کے چہرے پر مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ روزانہ پیدل چلنے کی مشقت سے وہ نڈھال ہو چکا تھا۔ خوشی سے اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ بس اس کے منہ سے اتنا ہی نکلا:

"ش... شکریہ... شکریہ۔"

جوں ہی وہ الوداع کہہ کر پلٹنے لگا تو عبدالستار نے

www.urdugem.com

ہینڈل سے لٹکا گوشت والا شاپر اس بوڑھے شخص کی طرف بڑھایا۔

''یہ کیا؟''

''میں نے کہا تھا نا کہ اپنے گھر کے لیے خریدا ہے۔''

''اپنے گھر؟'' بوڑھے شخص نے زیرلب کہا اور ساتھ ہی وہ مطلب بھی جان چکا تھا۔

اس بزرگ نے لرزتے ہاتھوں سے شاپر تھام لیا۔ اس کی آنکھوں میں نمی عود کر آئی تھی۔ عبدالستار یہ منظر دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اس نے موٹر سائیکل آگے بڑھا دی۔ اس نیکی نے اس کے وجود کو خوشی کے نور سے بھر دیا تھا۔ اپنے گھر کے افراد کی خدمت تو وہ روزانہ کرتا تھا، مگر آج ایک بیگانے کی خدمت کر کے اسے وہ خوشی ملی تھی کہ جس کا اظہار الفاظ کی صورت میں ممکن ہی نہیں تھا۔

عبدالستار اس پُرسرور کیفیت میں سرشار سیدھا ہوٹل پہنچا اور پھر لباس بدل کر تندور پر آ کھڑا ہوا۔ وہ اس ہوٹل کا نان بائی تھا۔ روز کی طرح آج بھی اس نے دن بھر محنت اور لگن سے کام کیا۔ عبدالستار کو کام کی اجرت روزانہ کی بنیاد پر ملتی تھی۔ شام کو دوسرا کاریگر آ گیا۔ چھٹی کے بعد وہ ہوٹل کے مالک کے پاس چلا آیا۔ وہ اپنی اجرت لینے آیا تھا۔ اسے دیکھ کر ہوٹل کا مالک بولا:

''معذرت! آج میرا ہاتھ ذرا تنگ ہے۔ آج کی آمدن بجلی کے بل پر خرچ ہو گئی۔ کل آپ کو دو دن کی اکٹھی اجرت ادا کر دوں گا۔''

اب عبدالستار کیا کہہ سکتا تھا۔ خاموش کھڑا رہ گیا۔ بل تو اس کی آنکھوں کے سامنے ہی ادا ہوا تھا۔ عبدالستار کو فوراً اپنی بچی سے کیا وعدہ یاد آ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب میں اپنی بچی کی خواہش کیسے پوری کروں گا؟ کیونکہ وہ اپنے پاس موجود رقم سے ایک غریب انسان کی مدد کر چکا تھا۔ اب اس کے پاس اتنی رقم نہیں تھی جس سے وہ اپنی بیٹی کی خواہش پوری کر سکتا۔ اس نے دل ہی دل میں کہا:

''یا اللہ! میں نے تیری راہ میں ایک غریب اور مستحق انسان کی مدد کی ہے۔ اب تو ہی میری مدد فرما، تاکہ میں اپنی بچی سے کیا وعدہ پورا کر سکوں۔''

عبدالستار ہوٹل سے نکل کر راستے پر آیا تو اسے پیچھے سے کسی نے پکارا۔ جوں ہی اس نے مڑ کر دیکھا تو وہ اس کا دوست نوید تھا۔ دونوں ایک ہی محلے میں رہتے تھے۔

اسی وجہ سے اکثر نوید گھر جانے کے لیے عبدالستار کے پیچھے موٹر سائیکل پر بیٹھ جایا کرتا تھا۔ چلتے چلتے جوں ہی موٹر سائیکل ایک بیکری کے پاس پہنچی تو نوید نے کہا:

''یار......! یہاں موٹر سائیکل روکنا۔ میں نے اپنی بچی کے لیے کچھ خریدنا ہے۔''

وہ اتر کر سیدھا بیکری کے اندر چلا گیا۔ جلد ہی وہ ہاتھ میں چھوٹے چھوٹے دو شاپر اٹھائے واپس لوٹا اور موٹر سائیکل پر سوار ہو گیا۔ دونوں دوست ایک بار پھر گھر کی جانب رواں دواں تھے۔ عبدالستار اندر ہی اندر بہت افسردہ تھا کہ آج وہ خالی ہاتھ کیسے اپنی بیٹی کا سامنا کرے گا۔ اتنے میں نوید کا گھر آ گیا۔ عبدالستار نے موٹر سائیکل روک لی۔ نوید نے اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دی، لیکن عبدالستار نے معذرت کر لی۔ اب وہ اپنے گھر جانا چاہتا تھا کیونکہ اس کی بیوی اور بیٹی اس کے منتظر تھے۔ نوید نے رخصت ہوتے وقت ایک شاپر عبدالستار کی طرف بڑھایا اور کہا:

''یہ رکھ لیں۔ میں نے لائبہ کے لیے لیا تھا''۔

''کیا مطلب؟'' عبدالستار حیران رہ گیا۔ میں لائبہ بیٹی کا چاچا ہوں۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اپنی بیٹی کے لیے کچھ خریدوں اور لائبہ کو نظر انداز کر دوں۔''

اب عبدالستار کے لیے انکار کرنا ممکن نہ تھا۔ اس نے ہاتھ میں موجود شاپر جب کھول کر دیکھا تو حیرت زدہ رہ گیا۔ بے اختیار اس کی زبان سے نکلا:

اے اللہ! خاموش دلوں کی فریاد بھی تو ہی سنتا ہے...''

شاپر میں پیزا موجود تھا۔ ◆◆◆

سعد فاروقی

میری چلی موٹر پم پم!

پاکستانی بسوں کی دلچسپ تاریخ جو اب کھٹارا سے لگژری شکل میں تبدیل ہو چکیں

۱۹۸۰ء کی دہائی میں جب میں نے ہوش سنبھالا تو بین الاضلاعی سفر کے لیے صرف سادہ بسیں مستعمل تھیں جن میں ائیر کنڈیشنر کی سہولت میسر نہیں ہوتی۔ یہ بسیں اب بھی رواں دواں ہیں۔ ان میں اے سی نہ ہونے کی وجہ سے تازہ ہوا کے لیے کھڑکیاں کھولنی پڑتی ہیں، لیکن یہی تازہ ہوا موسمِ گرما میں لُو کے تھپیڑوں اور موسمِ سرما میں یخ بستہ جھونکوں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ مزید برآں دورانِ سفر بیرونی گرد و غبار اور گاڑیوں کے دھوئیں سے بھی واسطہ پڑتا ہے۔

نقش و نگار سے سجی ان بسوں کی آمد کا دور سے ہی پتا چل جاتا ہے کیونکہ یہ بسیں چلنے کے ساتھ ساتھ کھڑکتی بھی ہیں۔ ان بسوں میں عموماً کھڑے ہو کر سفر کرنا پڑتا ہے کیونکہ بیٹھنے کی جگہ بمشکل ملتی ہے۔ اگر آپ کی قسمت اچھی ہے، آپ نے دور جانا ہے اور زیادہ کرایہ ادا کیا ہے تو آپ کو نشست میسر آ جاتی ہے۔ تاہم مقررہ نشست تک پہنچنے کے لیے آپ کو گزرگاہ میں کھڑے

www.urdugem.com

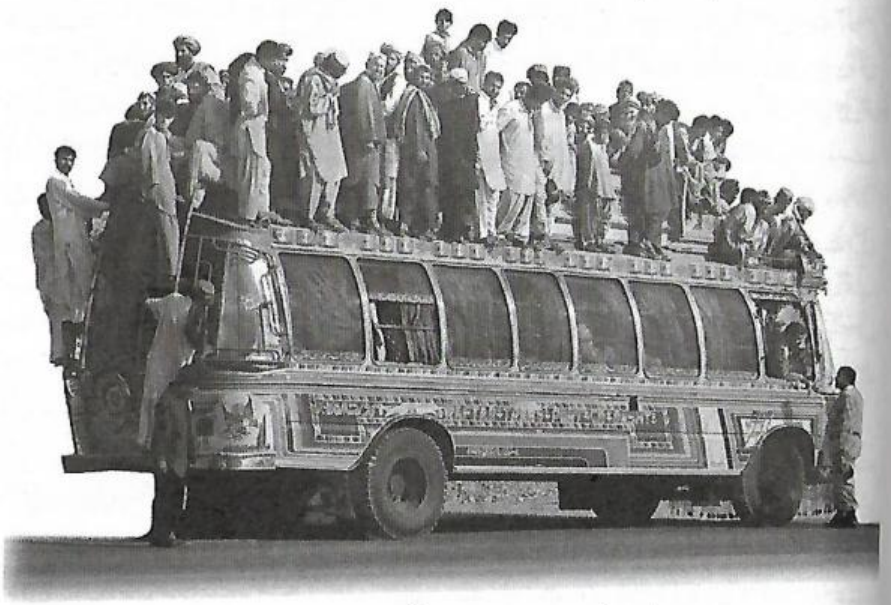

مسافروں کو دھکیلنا اور گزرگاہ میں رکھے سامان کو بھی پھلانگنا پڑتا ہے۔

اس بس کے اندر کا سماں بھی نرالا ہوتا ہے۔ بس میں انواع واقسام کے مسافر ہوتے ہیں؛ سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے چھوڑتے نوجوان، دھوئیں سے کھانستے بزرگ، بھوک اور گرمی سے بلکتے بچے اور روتے بچوں کو پچکارتی مائیں۔ انسانوں کے علاوہ مرغیاں اور بکریاں بھی آپ کی ہم نشست ہوسکتی ہیں۔

بس کی نشستیں اتنی تنگ ہوتی ہیں کہ ہر ہچکولے پر آپ کے گھٹنے اگلی نشست سے جا ٹکراتے ہیں اور سر ساتھی مسافر کے سر کے ساتھ ٹکراتا ہے۔ بس میں موسیقی کا اہتمام بھی ہوتا ہے لیکن یہ غذا کے بجائے روح کی سزا ہوتی ہے۔ موسیقی کا آغاز علی الصبح قوالیوں سے ہوتا ہے اور بعد ازاں ناقابل سماعت اور ناقابلِ بیان پنجابی گانے بجائے جاتے ہیں۔

اس بس کی ایک اور خاص بات یہ ہے، کہ جہاں بھی برلبِ سڑک کوئی جاندار جامد حالت میں نظر آئے ڈرائیور صاحب اسے سوار کروانے کے لیے بس روک لیتے ہیں۔ چاہے اندر تل دھرنے کی جگہ بھی نہ ہو۔ پائیدان پر کھڑے کنڈیکٹر صاحب محبوس مسافر کو اپنے ہاتھ سے اوپر کھینچتے اور پھر پشت سے دھکیل کر بس کے اندر مسافروں کے جمِ غفیر میں شیر وشکر کر دیتے ہیں۔ ہر اڈے پر بس ایک شفاخانے کا روپ اختیار کر جاتی ہے اور مُسافر مریضوں کا۔ مسافروں کی جملہ بیماریوں کے علاج کے لیے طرح طرح کے عطائی ڈاکٹر اندر آدھمکتے ہیں۔ کبھی نام نہاد ماہرِ چشم جادوئی سرمہ کی تشہیر کرنے تشریف لے آتے ہیں۔ ایسا سُرمہ جو ان کے بقول بصارت کی تمام بیماریوں کا شافی علاج ہے۔ مثلاً آنکھوں میں کُکرے، آنکھوں سے پانی آنا، آنکھوں میں سُرخی، آنکھوں میں جلن، دھندلا پن، سفید موتیا اور کالا موتیا وغیرہ۔ کبھی کوئی ماہرِ امراض معدہ ایسا چورن بیچنے تشریف لاتے ہیں جس میں ضُعفِ معدہ، ضعفِ جگر اور شکم سے متعلقہ تمام عوارض کا علاج موجود ہوتا ہے۔ اور کبھی کوئی ماہرِ امراض، مخصوصہ طلسمی سفوف پیش کرتے ہیں جس میں تمام دائمی پوشیدہ امراض کا علاج موجود ہوتا ہے۔ یہ سب حضرات اپنی چرب زبانی اور دروغ گوئی کے سبب اچھی خاصی کمائی کر کے واپس جاتے اور اگلی بس کا انتظار کرتے ہیں۔

ذرائع آمدورفت میں ترقی کے بعد اے سی بسوں کا ظہور ہوا اور وہ متوسط طبقے کی پسندیدہ سواری کی حیثیت اختیار کر گئیں۔ ان بسوں کے آنے سے آلودہ ماحول اور موسمی تغیرات سے نجات مل گئی بشرطیکہ اُن کا اے سی درست کام کرتا رہے۔ ان بسوں میں نشستیں نسبتاً آرام دہ ہوتی ہیں لیکن انتہائی تنگ۔ مسافروں کے درمیان اتنی قربت ہوتی ہے کہ اگر آپ اپنی ران میں کھجلی کرنا چاہیں تو آپ کا ہاتھ بغلی مسافر کے پہلو کو گدگداتا ہے اور وہ سہ چاہتے ہوئے بھی مسکرا اٹھتا ہے۔ اگر ساتھی مسافر کو اونگھ آ جائے تو اس کا سر مختلف سمتوں میں ڈولتے ہوئے اپنی منزلِ مقصود یعنی آپ کے کندھے پر آ ٹکتا ہے۔ اب آپ کشمکش و پیچ میں پڑ جاتے ہیں کہ یا تو اس کی نیند میں مخل ہوں ورنہ پھر مجسمے کی طرح ساکن بیٹھے رہیں اور اپنے کندھے کی سلامتی کی خیر منائیں۔

ان بسوں میں موجود جگہ کو انتہائی کفایت شعاری سے استعمال میں لایا جاتا ہے۔ ڈرائیور کے بغل میں واقع انجن کے کوہان پر بھی فوم بچھا کر دو اضافی نشستوں کا اہتمام ہوتا ہے۔ یاد رہے کہ اس جگہ کو مقامی زبان میں ''ٹاپا'' کہتے

ہیں۔ مزید برآں نشستوں کے درمیان موجود قدم گاہ میں بھی بچہ نشستیں پیوستہ ہوتی ہیں۔ یہ بچہ نشستیں دہری ہو کر بوقتِ ضرورت بند ہو جاتی ہیں۔ یہ بغلی نشستیں بس مالکان کے لیے اضافی آمدن کا موجب بنتی ہیں۔

سب سے مضحکہ خیز صورتِ حال اس وقت پیدا ہوتی ہے جب بس کی عقبی نشستوں پر بیٹھے کسی مسافر کو راستے میں اترنا پڑے۔ ایسی صورت میں بغلی نشستوں پر بیٹھے مسافروں کو باجماعت کھڑا ہو کے اس مسافر کو راستہ دینا پڑتا ہے اور عجب افراتفری کا عالم ہوتا ہے۔ یہی صورتحال سرِ راہ کسی مسافر کے سوار ہونے پر پیش آتی ہے۔

ان بسوں میں پانی کی اضافی سہولت بھی میسر ہوتی ہے جو داخلی دروازے کے ساتھ ہی آہنی شکنجے میں کسے آبی برادیے (واٹر کولر) سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ان بسوں کے ڈرائیور اس تیز رفتاری سے بس کو چلاتے بلکہ اڑاتے ہیں کہ بس پر طیارے کا گمان ہوتا ہے۔ ہر سفر سفر آخرت محسوس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بس کے عقب میں ''طیارہ'' بھی لکھا ہوتا ہے۔

اب آتے ہیں بسوں کی جدید قسم کی طرف جو آسودہ حال لوگوں کی اولین پسند ہے۔ یہ ہرگز ضروری نہیں کہ اس سے سفر کرنے کے بعد بھی وہ دولت مند ہی رہیں۔ لاہور اسلام آباد موٹروے بننے کے بعد بدیسی بس کمپنی نے ان بسوں کی طرح ڈالی اور اب کئی مدِمقابل کمپنیاں اس میدان میں ہیں۔ ان بسوں نے کئی ایسی سہولتوں اور آسائشوں سے روشناس کروایا جو قدیم بسوں میں مفقود تھیں۔

اس بس میں ڈرائیور صاحب وردی میں ملبوس بلکہ ملفوف ہوتے ہیں۔ سر پر ٹوپی ہوتی ہے جس سے غالباً ڈرائیور کو یہ باور کروانا مقصود ہوتا ہے کہ ڈرائیوروں کی بادشاہی کا تاج تمہارے سر پر ہے۔ بس میں میزبانی کے فرائض کی ادائیگی کے لیے میزبان مامور ہوتی ہے۔ گاڑی میں سوار ہوتے ہی آپ کی تواضع ایک عدد باسی سینڈوچ اور ولایتی مشروب سے کی جاتی ہے۔ ہر نشست کے ساتھ ایک عدد برقی جرس موجود ہوتی ہے جس کو پیاس لگنے پر دبایا جا سکتا ہے۔ اس کو بجانے پر میزبان آپ کو فراہمی آب تو کر دیتی ہے لیکن ساتھ ہی خشمگیں نگاہوں سے گھورتی ہے۔ آپ اس وقت کو کوستے ہیں جب پیاس لگنے پر موصوفہ کے آرام میں مخل ہوئے۔

آغازِ سفر پر میزبان گاڑی کی منزلِ مقصود پر متوقع آمد کے وقت کا رسمی اعلان مکبر الصوت (لاؤڈ سپیکر) پر کرتی ہے لیکن عموماً تاخیر ہو ہی جاتی ہے۔ اس بس میں انفرادی موسیقی کا اہتمام ہوتا ہے جس کے لیے ہمسایہ ملک کے فلمی گانے بجائے جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں ایک عدد ٹی وی بھی موجود ہوتا ہے۔

چونکہ بس کو دورانِ سفر رکنے اور اس میں طلسمی سرمہ، پریکٹیکل انگلش گرامر اور ہاضم چورن جیسی کارآمد اشیاء فروخت کرنے کی بنفسِ نفیس اجازت نہیں، لہٰذا مصنوعات کی تشہیر کا کام اس ٹی وی سے لیا جاتا ہے۔ طویل اشتہارات کے درمیانی وقفے میں انگریزی فلم دکھائی جاتی ہے۔ ان بسوں کی آرام گاہیں بھی نسبتاً آرام دہ اور اے سی سے آراستہ ہیں تاکہ مسافروں کو انگریزی والا سفر (Suffer) نہ کرنا پڑے۔

اب سننے میں آیا ہے کہ ایک جدید ترین بس بھی ہمارے ملک میں متعارف ہو چکی جس میں بیت الخلاء کی سہولت بھی میسر ہے۔ نشستیں کافی کشادہ ہیں اور ہر مسافر کے لیے ذاتی پردۂ سکرین موجود ہے۔ دیکھیے بس کی ترقی کا یہ سفر کہاں اختتام پزیر ہوتا ہے۔

www.urdudigest.com

ارم ناز

دنیا کے ۱۵ قیمتی مادے

ان بیش بہا مادوں کا دلچسپ بیان جن کی قیمت ہزاروں سے کھربوں روپے تک جاتی ہے

"نیا سال مبارک ہو سر۔"

جیسے ہی سر باسط کمرۂ جماعت میں داخل ہوئے۔ سارے طلبہ وطالبات ایک زبان ہو کر بول اٹھے۔

"آپ سب کو بھی مبارک ہو"۔ انھوں نے جماعت میں نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔

"سر! نئے سال کے موقع پر آج آپ بھی ہمیں کوئی نئی چیز پڑھائیے نا۔" ہانیہ نے درخواست کی۔

"ٹھیک ہے۔ آج ہم اپنے معمول کے موضوعات سے ہٹ کر کچھ نئی باتیں سیکھیں گے۔ آپ سب مجھے یہ بتائیے اس دنیا میں سب سے قیمتی میٹریل یا مادہ کون سا ہے؟"

"سر! سونا؟" حنا فوراً بول اٹھی۔

"نہیں"۔

سر! ہیرا یا دوسرے قیمتی پتھر؟"

"بالکل نہیں"۔

"پھر آپ ہی بتا دیں"۔ طلبہ نے اپنی ناقص العلمی کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا چلیں ٹھیک ہے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ آج کل کون سے مادے قیمتی ترین مانے جاتے ہیں۔"

آئیے قارئین آپ بھی ان اہم مادّوں کے بارے میں جانیے اور اپنی معلومات میں اضافہ کیجیے۔

۱۵۔ زعفران (Saffron)

آپ نے اکثر کھانوں میں سرخ رنگ کی چھوٹی چھوٹی دھاگے نما ڈنڈیاں دیکھی ہوں گی۔ ان سرخی مائل دھاگوں کو زعفران کہتے ہیں۔ زعفران ایک پھول "کراکس" سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اس پھول کے زردی مائل سرخ سٹگما کو زعفران کہتے ہیں۔ زعفران نایاب ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی ہر ڈنڈی کو ہاتھ سے ایک ایک کر کے الگ کیا جاتا ہے۔ کراکس پھولوں کے ۱۴۰۰۰ سٹگما سے صرف ایک اونس زعفران حاصل ہوتا ہے۔ ایک گرام زعفران کی قیمت ۱۱ ڈالر ہے۔ گویا یہ مہنگے ترین مسالوں میں سے ایک ہے۔ یاد رہے، ایک اونس ۲۸.۳۴۹ گرام رکھتا ہے۔

تاریخی اعتبار سے زعفران کی کاشت تقریباً ۳۵۰۰ سال پہلے شروع ہوئی پھر یہ مختلف براعظموں، تہذیبوں اور ثقافتوں میں پھیلتی چلی گئی۔ یہ پودا مخصوص آب وہوا میں بڑھتا ہے۔ اس کی نوے فیصد کاشت ایران میں ہوتی ہے۔

زعفران کے حوالے سے دلچسپ بات یہ ہے کہ رومن نہانے کے لیے پانی میں زعفران استعمال کرتے تھے۔ اسی طرح انھوں نے مخصوص تکیوں میں روئی کی جگہ زعفران بھرا ہوتا تھا۔ جب وہ بہت زیادہ تھک جاتے تو زعفران والے تکیے استعمال کرتے۔ اس سے انھیں پرسکون نیند آتی تھی۔ اس طرح سکندر اعظم نے اپنی ایشیائی مہمات کے دوران جنگجوؤں کے زخموں پر زعفران کو بطور دوا استعمال کیا۔ زعفران کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۴۴۴ء میں جرمنی میں ان تاجروں کو زندہ جلا دیا جاتا تھا جو زعفران میں ملاوٹ کرتے پائے جاتے۔

بہترین کوالٹی کے زعفران کا رنگ گہرا سرخ، مہک شہد کی طرح اور ذائقہ خوش گوار ہوتا ہے۔ اس کو ادویہ، خوشبو، رنگ سازی اور کھانوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔

موجودہ دور میں زعفران کو قوتِ مدافعت بڑھانے، ڈپریشن، بلند فشارِ خون، اینٹی آکسیڈنٹ اور آنتوں کے مسائل میں بھی کارآمد طریقے سے استعمال کیا جا رہا ہے۔

۱۴۔ سونا (Gold)

سونا خواتین کا پسندیدہ زیور ہے۔ یہ زعفران سے پانچ گنا مہنگا ہوتا ہے۔ خالص سونا کیونکہ بہت نرم ہوتا ہے اس لیے ملاوٹ کر کے اس سے مختلف ڈیزائن بنائے جاتے ہیں۔ سونے کے ایک گرام کی قیمت ۵۶ ڈالر ہے۔

انسان کی سونے میں دلچسپی اتنی ہی پرانی ہے جتنی ریکارڈ شدہ تحریر کیونکہ یہی وہ واحد قیمتی دھات ہے جس

سونے کی اینٹیں

www.urdugem.com

سے انسان سب سے پہلے متعارف ہوا۔ پہلی دفعہ سونا اور اس کے ذرّات تقریباً چالیس ہزار سال قبل مسیح پرانے غاروں سے ملے تھے۔ مصر میں تین ہزار سال قبل مسیح میں فرعون سونے سے بنی اشیاء تحفے میں دیا کرتے تھے۔ اہرام کی منڈیروں کو بھی ٹھوس سونے سے بناتے۔ مصریوں نے ہی سب سے پہلے سونے چاندی کا تناسب طے کیا کہ سونے کا ایک ٹکڑا وزن میں چاندی کے دو ٹکڑوں کے برابر ہے۔ نیز وہ نقشے بھی سونے سے بناتے جن میں سے کچھ اب بھی محفوظ ہیں۔

سلطنتِ لیڈیا وہ قدیم تہذیب ہے جس نے پہلی بار سونے کو بطور کرنسی استعمال کیا۔

۱۷۹۲ء میں امریکا کی کانگریس نے منٹ اور کوائن ایج ایکٹ منظور کیا جس نے سونے کی تاریخ بدل کر اس کو "زرِ قانونی" کی حیثیت دے دی۔ اس وقت سونا چاندی سے پندرہ گنا مہنگا تھا۔ چاندی کو چھوٹے سودے کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا اور سونے کو بڑے کاروباری سودوں میں لیکن ۱۸۶۲ء میں جب امریکا سونے اور چاندی کے ذریعے اپنے تمام قرضے ادا کرنے میں ناکام رہا تو اس نے کاغذی روپوں کو زرِ قانونی کی حیثیت دے دی جو اب تک قائم ہے۔

سونے کی اہمیت کے حوالے سے دلچسپ صورتحال اس وقت پیش آئی جب سان فرانسیسکو میں سونا دریافت ہوا۔ ۱۸۴۸ء سے پہلے وہاں کی آبادی صرف ایک ہزار تھی، دریافت کے بعد دو سال میں اس کی آبادی پچیس ہزار ہوگئی اور وہاں اسکول، کالج، اسپتال و سڑکیں تک بن گئیں۔ اس وقت وہاں کی بندرگاہ خالی جہازوں سے بھری رہتی تھی اور کوئی بھی سان فرانسیسکو چھوڑنے کو تیار نہ ہوتا تھا۔ الغرض سونا ہر قدیم وجدید دور میں انسان کی کمزوری رہا ہے۔

۱۳۔ پلاٹینم (Platinum)

سونے سے زیادہ قیمتی اس دھات کو "white gold" یعنی سفید سونا بھی کہتے ہیں۔ اس کو ۱۷۴۱ء میں این ووڈ نے جنوبی افریقا میں دریافت کیا۔ سالانہ پیداوار تقریباً ۱۳۰ ٹن ہے۔ ایک اونس صاف اور خالص پلاٹینم حاصل کرنے کے لیے کم سے کم ۱۰ ٹن خام پلاٹینم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی صفائی کا عمل تقریباً چھ ماہ میں مکمل ہوتا ہے۔ پلاٹینم کی قیمت ۶۰ ڈالر فی گرام ہے۔

بہت سے قیمتی و نایاب ہیروں اور زیورات کی سیٹنگ میں پلاٹینم استعمال ہوتا ہے۔ یہ دھات "ہائپو الرجینک" ہے، اس لیے طبی اور دانتوں کی آلات سازی میں اسے استعمال کیا جاتا ہے۔ نیز اس سے الیکٹروڈ اور تجربہ گاہوں کے آلات بھی بنائے جاتے ہیں۔ سالانہ نوے فیصد پلاٹینم جنوبی افریقا میں موجود دنیا کی چار بڑی کانوں سے نکالا جاتا ہے جس کا تقریباً پچاس فیصد صنعتی کاموں میں استعمال ہوتا ہے۔

۱۲۔ میتھامفٹامین (Methamphetamine)

اس کی قیمت ۱۰۰ ڈالر فی گرام ہے۔ یہ سفید، صاف

میتھا، مفتامین سفوف کی شکل میں

شفاف کرسٹل یا نیلاہٹ مائل رنگ کا مادہ ہے۔ اس کی خاصیت یہ ہے کہ یہ ایک نشہ ہے۔ اس کو پاؤڈر، ٹیکے یا گولی کی طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ عام طور پر سپیڈ، آئس اور کرسٹل کے ناموں سے جانا جاتا ہے۔

۱۸۸۷ء میں اس کی دریافت حادثاتی طور پر ہوئی جب ایک سائنسدان جڑی بوٹیوں سے اپیڈرائن نامی دوا تیار کررہا تھا۔ ۱۹۱۹ء میں اس کو مختلف کیمیائی مادّوں کے ملاپ سے غیر قانونی طور پر لیبارٹریوں میں تیار کیا جانے لگا۔ کہتے ہیں کہ ہٹلر نے جنگِ عظیم دوم کے دوران اسے اپنے فوجیوں میں تقسیم کیا تاکہ ان کا حوصلہ بلند رہے، یہ فوجیوں کو چست و تازہ دم رکھے اور وہ ڈٹ کر دشمن کا مقابلہ کریں۔

یہ نشہ دماغ میں موجود کیمیکل ڈوپامائن کو بڑھاتا ہے جو جسم میں حوصلہ افزائی، خوشی اور انعام کی کیفیات پیدا کرتا ہے۔ جو لوگ اس کو بہت کم مقدار میں بھی استعمال کرتے ہیں۔ یہ ان کی صحت خراب کرکے مختلف مسائل پیدا کرتا ہے مثلاً دیر تک جاگنا، بھوک کم ہوجانا، سانس تیزی سے لینا، بلند فشارِ خون یا جسمانی درجہ حرارت وغیرہ کا بڑھ جانا۔ جب لوگ اس کو چھوڑتے ہیں تو ان میں ڈپریشن، جسم درد اور شدید ہذیانی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ اس کی گولیاں خواتین میں وزن کم کرنے اور ڈپریشن میں بھی استعمال کی جاتی ہیں۔

۱۱۔ گینڈے کا سینگ (Rhinoceros Horn)

اگرچہ یہ بہت زیادہ نایاب نہیں پھر بھی بلیک مارکیٹ میں اس کا سینگ ۱۱۰ ڈالر فی گرام کے حساب سے فروخت ہوتا ہے۔ گینڈے کا سینگ کیراٹن سے بنتا ہے جس سے ہمارے بال اور ناخن بنتے ہیں۔ چینی لوگ اس کو اپنی قدیم روایتی ادویہ میں بھی استعمال کرتے ہیں۔

گینڈے کے سینگ

ساخت کے اعتبار سے اس کی بیرونی پرت کیراٹن سے بنتی ہے۔ اندرونی کیلشیم اور ملینیم کی وجہ سے وہ سخت اور ٹھوس ہوتا ہے جس کی وجہ سے سینگ کی مخصوص شکل برقرار رہتی ہے۔ اگر گینڈے کے سینگ کو توڑ یا کاٹ دیا جائے تو وہ نیا آجاتا ہے اور پہلے والے سے بھی جلد۔

ویت نام جیسے ملک میں اس کا ایک سینگ پانچ لاکھ ڈالر میں فروخت ہوتا ہے۔ کثرت سے سینگ کاٹنے کی وجہ سے گینڈوں کی نسلیں ختم ہورہی ہیں۔ سینگوں کی غیر قانونی فروخت روکنے کے لیے ان کی باقاعدہ فارمنگ کا سوچا جارہا ہے۔

پرانے زمانے میں سمجھا جاتا تھا کہ گینڈے کا سینگ جادوئی طاقت رکھتا ہے۔ اس کو پانی میں ڈال دیا جاتا تاکہ وہ اس کے فاسد مادے ختم کردے۔ تجربات نے ثابت کیا کہ حیران کن طور پر سینگ کی کیمیائی خاصیت ایسی ہے کہ وہ پانی سے آلودگی ختم کردیتا ہے۔

گینڈے کے سینگ سے پیپر ویٹ، بالوں میں لگانے والی پن، خنجر کے دستے، مختلف ڈیزائن کے بکس وغیرہ بنائے جاتے ہیں جو انتہائی مہنگے داموں فروخت ہوتے ہیں۔ نیز چین، بھارت اور ملائیشیا میں ان سے ادویہ بھی تیار کی جاتی ہیں۔

www.urdugem.com

۱۰۔ہیروئن (Heroin)

تمام نشوں میں مشہور، تیز اور زود اثر نشہ ہیروئن کا ہے۔ یہ سفید، براؤن پاؤڈر کی صورت میں ملتا ہے۔ جو ہیروئن کولمبیا سے آتی وہ چاک جیسی سفید ہوتی ہے۔ افغانستان سے گندمی اور جنوبی ایشیا سے خالص صاف شفاف سفید ہیروئن دنیا کے مختلف حصوں میں جاتی ہے۔ اس کی قیمت ۱۳۰ ڈالر فی گرام ہے۔

ہیروئن افیون کے پودے سے حاصل کی جاتی ہے اور جس کی ۶۶ فیصد کاشت افغانستان میں ہوتی ہے۔ دواساز کمپنیاں اس کے کیمیائی مرکبات کو درد کش ادویات بنانے میں استعمال کرتی ہیں لیکن انفرادی طور پر اس کا استعمال غیر قانونی اور ممنوع ہے۔

تاریخی نکتہ نظر سے ۱۸۹۸ء میں بائیر نامی کیمسٹ نے ایک درد کش دوا کی، جس کو اس نے ہیروئن کا نام دیا۔ وہ اس وقت ٹی بی کے علاج میں استعمال کی جاتی تھی۔ ۱۹۹۰ء کے وسط میں امریکا میں فیشن کی ایک تحریک چلی جس کو (Heroinchin) ہیروئن چن کا نام دیا گیا۔ اس تحریک کے دوران ایسے ماڈلز کا شوٹ کیا گیا جن کی ظاہری شکل و صورت ہیروئن کے عادی افراد جیسی ہوتی مثلاً دبلے پتلے لاغر جسم، بے جان آنکھیں، زرد جلد، خشک ہونٹ اور آنکھوں تلے حلقے وغیرہ۔ اس تحریک سے متاثر ہو کر نوجوانوں نے ہیروئن کا بے تحاشا استعمال فیشن کے طور پر کیا۔

ہیروئن کے عادی افراد میں جلد کی مختلف الرجیز، دل کا گھبرانا، منہ کا خشک ہونا، کینسر اور دل و سانس کی بے شمار بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

۹۔کوکین (Cocaine)

یہ ہیروئن سے بھی زیادہ مہنگی ہے۔ یہ دوسرا عام نشہ ہے جو امریکا میں بہت زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکا میں تقریباً ایک لاکھ بچے ایسے پیدا ہوتے ہیں جو کوکین کے عادی ہوتے ہیں کیونکہ ان کی مائیں دورانِ زچگی اسے استعمال کرتی ہیں۔ اس کی قیمت ۲۳۶ ڈالر فی گرام ہے۔ یہ کوکا (Coca) پودے میں موجود فعال کیمیکل ہے۔ اس کو کوکا پودے کے پتوں سے کشید کر کے حاصل کیا جاتا ہے۔

۱۸۸۵ء میں کوکا کولا کے ہر ایک گلاس میں تقریباً ۹ ملی گرام کوکین شامل ہوتی تھی کیونکہ کوکین کیفین کے ساتھ مل کر زبردست تحریک دینے والا اثر پیدا کرتی تھی لیکن ۱۹۰۳ء میں کوکین کو اس کے اجزا سے قانونی طور پر خارج کر دیا گیا۔ اب سوڈے میں ذائقے کے لیے کوکا کے پتے استعمال ہوتے ہیں۔

۱۹۰۰ء کے اوائل میں جب کوکین غیر قانونی نہیں تھی تب اسے درد کش دوا کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا کیونکہ یہ سوجن، زخم مندمل کرنے اور ٹوٹی ہڈیاں جوڑنے میں معاون تھی۔ پہلا ریکارڈ شدہ کوکین کا عادی ایک مریض تھا جسے کوکین کو بطور دوا بے ہوش کرنے کے لیے دیا گیا تھا۔ یوں علاج سازی میں کوکین کا آغاز ہوا۔

کوکین کو ناک کے ذریعے سونگھ کر، انجکشن یا سگریٹ کے ذریعے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کی کاشت اور تقسیم دنیا کے ہر حصے میں غیر قانونی ہے۔ اس کے عام نام کوک، سنو، لیڈی، فلیک اور گولڈ ڈسٹ وغیرہ ہیں۔ اس کی فروخت سے اتنی زیادہ آمدنی حاصل ہوتی ہے جو مائیکروسافٹ اور میکڈونلڈ وغیرہ بھی نہیں کر پاتے۔

کوکین کے عادی افراد میں پھیپھڑوں کے کینسر کے علاوہ دل کے دورے کے خطرات بھی بہت بڑھ جاتے ہیں۔ جو افراد ناک کے ذریعے کوکین کا نشہ کرتے ہیں، وہ انسومینیا (anosmia) نامی بیماری کا شکار بن سکتے ہیں۔ اس مرض میں انسان سونگھنے کی حس سے محروم ہو جاتا ہے۔ تب ناک مختلف قسم کی خوشبویات وغیرہ میں تفریق

نہیں کر پاتی۔

۸۔ایل ایس ڈی (LSD)

یہ Lysergic Acid Diethylamide کا مخفف ہے۔ یہ ایک زود اثر مزاج کو مکمل طور بدل دینے والا کیمیکل ہے۔ اس کو ۱۹۳۸ء میں البرٹ ہوف مین نے لائسرجیک تیزاب سے تیار کیا جو ایرگوٹ پھپھوندی (ergot fungus) سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ پھپھوندی رائی یا دوسرے اناج کے دانوں کو لگتی ہے۔ یہ غیر قانونی نشہ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں ہپی ثقافت اور فعال نفسی (psychedelic) میوزک کے دوران مشہور ہوا۔ اس کا ایک گرام ۳۰۰۰ ڈالر میں ملتا ہے۔

یہ بے رنگ، بے بو اور ذائقے میں کڑوا نشہ ہے۔ اسے کرسٹل یا گولیوں کی صورت میں غیر قانونی طور پر امریکی لیبارٹریوں میں تیار کر کے دیگر جگہوں پر بیچا جاتا ہے۔ گولیاں کارٹون (loony toons) کے مختلف کرداروں کی شکل میں ہوتی ہیں۔

اسے استعمال کرنے والے کو ایسی تصاویر دکھائی اور آوازیں سنائی دیتی ہیں جو حقیقت کے بہت قریب ہوں لیکن ان کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ جو لوگ ایل ایس ڈی استعمال کریں، وہ اس کو ٹرپ کا نام دیتے ہیں جو بارہ گھنٹوں پر محیط ہوتا ہے۔ جب اس کے استعمال کرنے والے کو مزہ نہ آئے یا مزہ آئے تو وہ اسے ''بیڈ ٹرپ یا گڈ ٹرپ'' کا نام دیتا ہے۔

اس کے نقصانات میں کھانے و نیند میں کمی، منہ کا خشک ہونا، آنکھوں کی پتلیوں کا ہلکا ہونا، پسینا آنا، رونگٹے کھڑے ہونا، ڈپریشن، خوفناک خواب اور چیزوں کے بارے میں خراب قسم کے تصورات شامل ہیں۔

۷۔پلوٹونیم (Plutonium)

یہ ایک تابکاری عنصر ہے۔ خالص پلوٹونیم چاندی کی طرح سفید رنگ کا ہوتا ہے۔ اس کا نام پلوٹو سیارے کے نام پر رکھا گیا۔ جس وقت پلوٹو سیارہ دریافت ہوا تقریباً اسی وقت پلوٹونیم کو ۱۹۴۰/۴۱ء میں گلینن اور اس کے ساتھیوں نے کیلیفورنیا یونیورسٹی میں مصنوعی طریقے سے تیار کیا۔

اس کا ایک گرام ۴۰۰۰ ڈالر کا ہے۔ جب سائنسدانوں پر منکشف ہوا کہ اس سے ایٹم بم بن سکتا ہے تو اس کی دریافت کو جنگِ عظیم دوم تک خفیہ رکھا گیا۔ دوسری جنگِ عظیم میں (Fat Man) نامی نیوکلیئر بم جو ناگاساکی پر گرایا گیا، وہ پلوٹونیم کی مدد سے تیار کیا گیا تھا۔ اس کو تھرمو

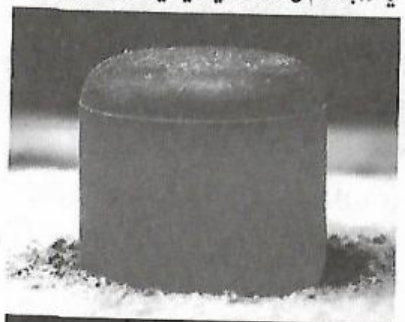

پلوٹونیم ایک مہنگی دھات

الیکٹرک جنریٹروں، خلائی جہازوں اور نیوکلیئر ہتھیاروں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ پلوٹونیم اور اس کے مرکبات انسانی صحت کے لیے انتہائی خطرناک ہیں۔ اس سے ہڈیوں کے علاوہ پھیپھڑوں کا کینسر بھی ہو سکتا ہے۔ جو لوگ حفاظتی اقدامات اختیار کیے بغیر ایسی لیبارٹریوں میں کام کریں، جہاں تابکاری عناصر تیار ہوتے ہیں، تو ان میں سے اکثریت کے بچے معذور پیدا ہوتے ہیں۔

۶۔پینائٹ (Painite)

یہ ایک سرخ رنگ کا قیمتی پتھر ہے جو ہیرے کی طرح اہمیت رکھتا ہے۔ اس کو ۱۹۵۰ء کے وسط میں برطانوی کان کن اور نایاب نگینوں کے ڈیلر آرتھر سی ڈی پین نے میانمار میں دریافت کیا۔ جب آرتھر کو یقین ہو گیا کہ اس پتھر

www.urdugem.com

پینائٹ جو قیمتی پتھر ہے

کا شمار گوہر نایاب میں ہوگا تو اس کا نام اپنے نام پر رکھ دیا۔

اس قیمتی پتھر میں مختلف عناصر پائے جاتے ہیں، جن میں کیلشیم، بورون، زرکونیم، ایلومینیم اور آکسیجن شامل ہیں۔ اس کا ایک گرام خریدنے کے لیے آپ کو ۹۰۰۰ ڈالر دینا ہوں گے۔ دریافت سے لے کر ۲۰۰۵ء تک اس کے صرف دو ٹکڑوں کو خوبصورت انداز میں تراشا جاسکا ہے۔ اس کو گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں نایاب معدنیات میں شمار کیا جاتا ہے۔

۵۔ٹیفائٹ (Taffeite)

ٹیفائٹ بھی پینائٹ کی طرح نایاب پتھر اور حقیقتاً ہیرے کے مقابلے میں لاکھوں گنا قیمتی ہے۔ اس کے ایک گرام کی قیمت بیس ہزار ڈالر ہے۔ ٹیفائٹ کا نام اس کے دریافت کرنے والے رچرڈ ٹیفے کے نام پر رکھا گیا۔ اس کو ۱۹۴۵ء میں پہلی بار آئرلینڈ میں تراشا گیا۔ اس کے اجزا میں بریلیم، میگنیشیم اور ایلومینیم شامل ہیں۔

یہ عموماً بے رنگ، جامنی مائل سرخ، سرخ، سبز، ہلکا سبز اور گلابی مائل جامنی رنگوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ زیادہ تر سری لنکا اور تنزانیہ میں پایا جاتا ہے جبکہ ہلکی کوالٹی کا چین میں بھی ملتا ہے۔

۴۔ٹریٹیئم (Tritium)

یہ ہائیڈروجن کا تابکاری آئسوٹوپ ہے جو عام طور پر روشنی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے ایک گرام کی قیمت تیس ہزار ڈالر ہے۔ اس آئسوٹوپ کا نام یونانی لفظ Titos سے اخذ شدہ ہے جس کا مطلب ''تیسرا'' ہے۔ ردرفورڈ اور اس کے ساتھیوں نے اس کو ۱۹۳۴ء میں بنایا لیکن اس کو الگ سے استعمال کرنے میں ناکام رہے، پھر لوئس اور رابرٹ نے تجربات کے بعد نتیجہ اخذ کیا کہ یہ ایک تابکاری عنصر ہے۔ اس لیے انھوں نے اسے بآسانی الگ کرلیا۔

ٹریٹیئم ایک بے رنگ، بے بو گیس ہے۔ اگر اس کو سانس کے ذریعے جسم میں لے جائیں تو مختلف قسم کے صحت کے مسائل کے ساتھ کینسر پیدا کرنے کا بھی سبب بنتی ہے۔

یہ ہائیڈروجن کی مختلف اقسام کے ساتھ مل کر بجلی پیدا کرتی ہے۔ فاسفورس کے ساتھ مل کر بہت سی اشیاء میں استعمال ہوتی ہے۔ مثلاً اندھیرے میں روشنی کرنے کے لیے کی چین، گھڑیوں کے ڈائل میں، رائفل میں نشانہ باندھنے والے آلے کے ساتھ۔ ٹریٹیئم سے پہلے لوگ ریڈیم استعمال کرتے تھے لیکن وہ زیادہ مہلک تھی۔ اس کو نیوکلیئر بم میں استعمال کیا جاتا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ تباہی پھیلے۔

۳۔ہیرا (Diamond)

ہیروں کے نایاب اور قیمتی ہونے کے بارے میں سبھی جانتے ہیں۔ خصوصاً یہ خواتین کی کمزوری ہیں۔ ان کے ایک گرام کی قیمت ۵۵۰۰۰ ڈالر ہے۔ ہیرا کاربن کی ٹھوس شکل ہے۔ لفظ ڈائمنڈ یونانی زبان کے لفظ adamas سے اخذ شدہ ہے جس کا مطلب ہے اٹوٹ، ناقابلِ تبدیل اور مناسب۔ ایک قیراط ہیرے کے لیے ۲۵۰ ٹن کان کنی کرنی پڑتی ہے۔ ۱۸۰۰ء کے بعد سے جنوبی افریقا ہیروں کا بنیادی

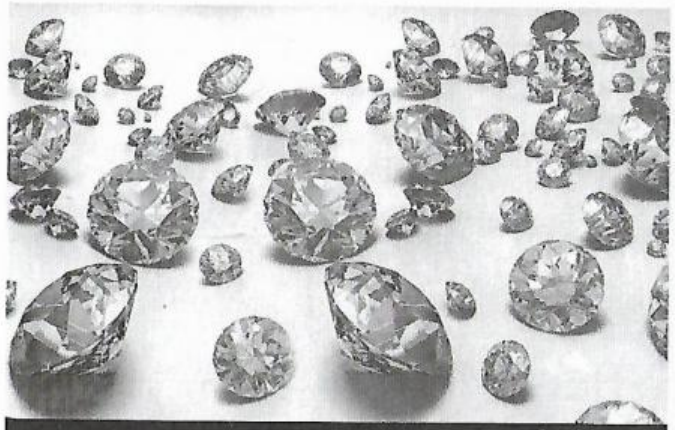

ہیرے کی ایک نایاب قسم

مرکز بن گیا ہے۔ یہاں سے ہیرے مختلف ممالک میں برآمد کیے جاتے ہیں۔

ہیرے پیلے، نسواری، گرے، کرسٹل کی طرح شفاف، نیلاہٹ مائل سبز، سیاہ، گلابی، جامنی، سرخ اور مختلف رنگوں میں پائے جاتے ہیں۔ ہیرے کئی ارب سال پرانے ہوتے ہیں اور زمین کی اندرونی سطح سے ۱۰۰ سے ۱۳۰ میل کے فاصلے پر موجود ہوتے اور عموماً آتش فشاں پھٹنے پر باہر آگرتے ہیں۔

دنیا کے سب سے بڑا ہیرا culinan ہے جو ۱۹۰۵ء میں جنوبی افریقا میں دریافت ہوا۔ اس کا وزن ۳۱۰۶ قیراط تھا۔ ہیرا چار خصوصیات کی بنا پر جانچا جاسکتا ہے، جو سی فور (C4) کہلاتی ہیں۔ پہلی قیراط، یعنی اس کا وزن، دوسری کٹ یعنی اس کی خصوصیات، بناوٹ اور پالش کے لحاظ سے، تیسری رنگ، کہ جو ہیرا سفید یا کرسٹل کی طرح شفاف ہو وہ اتنا ہی مہنگا ہوگا۔ چوتھی شفافیت، کہ کثافت سے جتنا پاک ہو، اتنا ہی قیمتی ہوگا۔

قدیم یونانیوں کا عقیدہ تھا کہ ہیرے دیوتاؤں کے آنسو ہیں جو آسمان سے گرتے ہیں۔ رومیوں کے مطابق کیوپڈ کے مجسمے کے ہاتھ میں جو تیر ہے، اس پر ہیرے لگے ہوئے ہیں۔ اس لیے یہ محبت اور خلوص کی علامت ہیں۔ ہندوؤں کا کہنا ہے چونکہ یہ ان کے بھگوانوں کی آنکھوں میں لگے ہوتے اور اس لیے یہ ان کو خطرے سے بچاتے ہیں۔

مزے کی بات یہ کہ ۲۰۰۴ء میں سائنسدانوں نے ملکی وے کے قریب ایک سیارہ کین کیری ۵۵ cancrie 55 نامی دریافت کیا جو کاربن سے بنا ہے۔ اس کا ایک تہائی حصہ خالص ہیروں پر مشتمل ہے۔ اسی طرح ایک لوسی نام کا ستارہ بھی دریافت ہوا جس میں دس ملین ٹریلین ٹریلین قیراط کے ہیرے موجود ہیں۔

۲۔کیلیفورنیم (Californium)

یہ بہت قیمتی، لیبارٹری میں تیار ہونے والا تابکاری عنصر ہے۔ اس کا شمار ان عناصر میں ہوتا ہے جو تابکاری تعامل کو شروع کرنے کے لیے بہت زیادہ نیوٹران پیدا کرتے ہیں۔ اس کو سٹینلے تھامسن اور اس کے ساتھیوں نے ۱۹۵۰ء میں کیلیفورنیا یونیورسٹی میں دریافت کیا اور اسی بنا پر اس عنصر کا نام کیلیفورنیم رکھا گیا۔ اس کا رنگ سلور وائٹ ہوتا ہے اور یہ قدرتی طور پر موجود نہیں بلکہ مصنوعی طور پر لیبارٹری میں تیار کیا جاتا ہے۔ شروع میں جب اس پر کام کیا گیا تو صرف نو ملی گرام کیلیفورنیم ہی حاصل ہوسکا۔

کیلیفورنیم کو سونے اور چاندی کی کھوج لگانے، ہوائی جہاز میں تناؤ معلوم کرنے اور تیل کے کنوؤں میں تیل اور

www.urdugem.com

کیلیفورنیم جو لیبارٹری میں بنتا ہے

پانی کی تہوں کا پتا لگانے میں استعمال کیا جاتا ہے۔ گیما شعاعوں کی وجہ سے یہ انسان کے لیے زہر کی مانند ہے، اس لیے کوئی اسے نہیں خریدتا۔ اگر کوئی خریدے تو اس کی قیمت اُسے دو کروڑ ستر لاکھ ڈالر ادا کرنا ہوگی۔

۱۰۔ اینٹی میٹر (Antimatter)

اینٹی میٹر کے نظریے کو سب سے پہلے ۱۹۲۸ء میں پال ڈائرک نے پیش کیا۔ اس کا ایک گرام ۶۲ء۵ ٹریلین ڈالر کا ہے۔ گویا یہ کرۂ ارض پر پایا جانے والا سب سے قیمتی مادہ ہے۔ ایک گرام اینٹی میٹر سے اتنی زیادہ توانائی پیدا ہوتی ہے جسے کنٹرول کرنا ممکن نہیں۔

دنیا میں ہر چیز مادے سے مل کر بنی ہے۔ اینٹی میٹر وہ مادہ ہے جس پر برقی چارج ہو۔ مثال کے طور پر پروٹان پر مثبت چارج ہوتا ہے لیکن اینٹی میٹر کے پروٹان دیگر خصوصیات کی بنا پر پروٹان جیسے ہوں گے لیکن ان پر منفی چارج ہوگا اور وہ گھومتے ہوں گے۔ کسی بھی مادے پر یا تو مثبت چارج ہوتا ہے یا پھر منفی۔

۱۹۹۵ء میں ہائیڈروجن کی اینٹی ہائیڈروجن بنائی گئی تھی لیکن بہت مختصر مدت کے لیے۔ اینٹی میٹر کی بہت کم مقدار کا سمک شعاعوں کی صورت میں بارش کے ساتھ زمین پر آتی ہے۔ یہ اینٹی میٹر ذرات ایک مربع میٹر کی رفتار سے ہمارے ماحول میں پہنچتے ہیں۔ سائنسدانوں نے اینٹی میٹر کو گرج چمک والے طوفان میں بھی بنتے دیکھا ہے۔

اینٹی میٹر کو مختلف چیزوں میں استعمال کیا جاتا ہے جیسے طب کے شعبے میں پی ای ٹی اسکیننگ، تصاویر اور کینسر کے علاج میں، خلائی جہازوں میں ایندھن کے طور پر نیز اس سے ہتھیار بھی تیار کیے جاتے ہیں۔ امریکی فضائیہ نے سرد جنگ کے دوران اس سے تباہ کن ہتھیار بنانے کے لیے فنڈز بھی جمع کیے تھے۔ ◆◆◆

(دنیائے انٹرنیٹ کے ۱۰ بہترین سافٹ ویئر کون سے ہیں اور آپ انھیں مفت کیسے انسٹال کرسکتے ہیں۔ بہترین معلوماتی مضمون پڑھیں صفحہ ۱۳۴ پر)

ابو الفرح ہمایوں

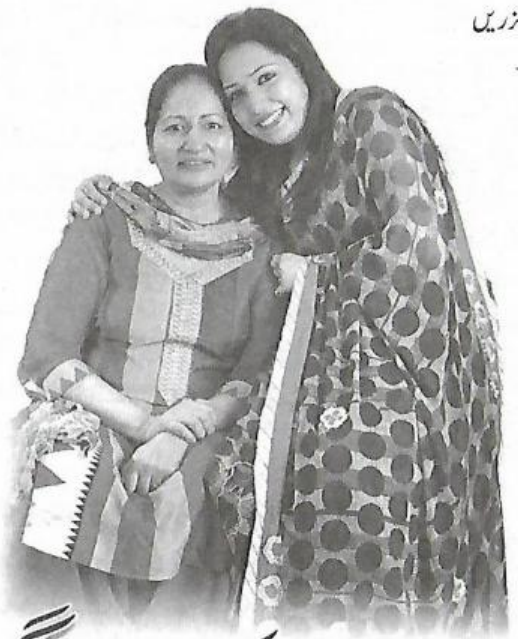

ساس بہو کی دل لگی

ایک خاتون کا قہقہہ بار قصہ، جس کے ارمان پورے نہ ہوسکے

میں نہ جانے کب سے ایک اچھی بہو کی تلاش میں سرگرداں تھی۔ بے شمار لڑکیاں نظر سے گزریں لیکن کوئی بھی میرے معیار پر پوری نہ اتری۔

ایسے میں اچانک تم اپنے والدین کے ہمراہ میرے سامنے والے مکان میں بہ حیثیت کرایے دار وارد ہوئیں۔ میں نے تمہیں دیکھا اور پہلی ہی نظر میں پسند کرلیا۔ اگلی دو تین ملاقاتوں میں تمہارے اندازِ گفتگو، سلیقہ مندی اور ذہانت نے مجھے تمہارا گرویدہ بنا دیا۔ میں نے اچھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کرلیا کہ بس تم ہی میری بہو بنو گی۔ تمہارے والدین بھی کسی شہزادے کے انتظار میں بیٹھے تھے اور انھیں میرا بیٹا پسند آ گیا۔

کہتے ہیں کہ رشتے آسمانوں پر بنتے ہیں، چناں چہ یہ رشتہ بھی آسمان پر طے ہوا اور زمین پر پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ میری خوشیوں کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا۔ اب میری تمناؤں اور ارمانوں کی تکمیل کا وقت آ گیا تھا۔

میں تمہارے ساتھ ایک دلچسپ بازی کھیلنا چاہتی تھی۔ اِس کھیل کا نام ہے... ”ساس بہو کی دل لگی“۔ میں نے نوکات پر مبنی اپنا منصوبہ مکمل کرلیا تھا۔ ہمارے معاشرے میں یہ کھیل عام ہے اور کم و بیش انھی اصولوں کو مدِّنظر رکھ کر کھیلا جاتا ہے۔ آؤ! میں تمہیں بتاتی ہوں کہ اِس لاجواب تفریح کا آغاز کیسے ہوتا۔

پہلا نکتہ

میرا بیٹا اپنی تمام کمائی میرے ہاتھ پر رکھے گا۔ یہ فیصلہ میں کروں گی کہ کتنی کہاں اور کیسے خرچ کرنی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ بہ طور جیب خرچ میں تمہیں ایک خطیر رقم مبلغ دو تین سو روپے دے

www.urdugem.com

دیا کروں، لیکن پھر سوچتی ہوں کہ آخر تم اتنے سارے پیسوں کا کروگی کیا؟ تمہاری تمام ضروریات کا خیال رکھنا تو میری ذمہ داری ہے۔ آخر تمہاری ساس ہوں، کوئی غیر تو نہیں۔

دوسرا نکتہ

تمہاری خوش لباسی کا شہرہ دور دور تک ہے۔ تمہیں تمام جدید فیشن ترک کرنے ہوں گے۔ سادگی کی بات ہی کچھ اور ہے۔ اپنے تمام زرق برق اور بھڑک دار کپڑے کسی صندوق میں بند کر کے ایک طرف رکھ دو۔ بعد میں کبھی کام آسکتے ہیں۔ میں تمہارے لیے نئے ڈھیلے ڈھالے کم خرچ بالانشیں قسم کے جدید شلوار قمیص سلوادوں گی۔ گھر کے استعمال کے لیے بہترین رہیں گے۔ میک اپ وغیرہ بھی واہیات چیز ہے اور فضول خرچی کے علاوہ کچھ نہیں۔ تم مجھے میک اپ کے بغیر ہی اچھی لگتی ہو۔

تیسرا نکتہ

خوراک کا مسئلہ ایک عالمی مسئلہ ہے۔ بیشتر بیماریوں کی جڑ بسیار خوری اور غیر متوازن غذا کو ہی گردانا گیا ہے۔ اس کا واحد حل ماہرین نے کم اور سادہ غذا کو قرار دیا ہے۔ آج سے تمہارا میٹھا کھانا بند۔ گوشت سے پرہیز، برگر، پیزا، بروسٹ، چاکلیٹ اور آئس کریم وغیرہ تو زہر ہیں۔ دن میں دو وقت ایک ایک پتلی چپاتی دال یا سبزی کے ساتھ کافی ہے۔

کبھی کبھی منہ کا مزا بدلنے کے لیے گوشت کا شوربا یا مسالہ وغیرہ لے سکتی ہو۔ کھانا تم میرے سامنے ہی کھاؤ گی اور تنہائی میں کچھ الابلا کھانے کے بارے میں کچھ سوچنا بھی مت۔ شادی بیاہ اور دیگر تقریبات میں تھوڑا بہت چکھنے کی اجازت ہے۔ آخر میں کہاں کہاں تم پر نظر رکھوں گی۔ بس ہر وقت یہ دھیان رہے کہ کوئی دیکھے یا نہ دیکھے، ساس تو دیکھ رہی ہے۔

چوتھا نکتہ

فون کو ہاتھ لگانا حرام ہے اور موبائل رکھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ فون صرف میں اٹھاؤں گی یا میرے بچے۔ اگر تمہارے کسی عزیز یا غیر عزیز کا فون آیا تو اُسے خوب صورتی سے ٹال دو، مثلاً روٹی جل رہی ہے، یا باہر دروازے پر کوئی ہے، ابھی آئی وغیرہ۔ جلد ہی تمہارے چاہنے والوں کو اندازہ ہوجائے گا کہ اُن کی اوقات کیا ہے۔

پانچواں نکتہ

ہمارا چھوٹا سا تو گھر ہے، چار سو گز پر بنا ہوا دو منزلہ۔ ہم ماسی یا ملازم وغیرہ رکھ کر کیا کریں گے؟ یہی لوگ چوریاں بھی کرتے یا کروا دیتے ہیں۔ اس جھنجھٹ سے بچنے کا یہی بہترین طریقہ ہے کہ ان سے دور رہا جائے۔ اپنی پوری توجہ گھر کی صفائی اور ہانڈی چولھے پر رکھو گی تو نہ سہیلیوں سے گفتگو ہو سکے گی اور نہ ٹی وی دیکھنے کا وقت ہوگا۔ خواہ مخواہ وقت کا ضیاع۔ کیاریوں، پھولوں اور پھلوں کا میں خود ہی خیال رکھوں گی۔ آخر مجھے تمہارا ہاتھ بھی تو بٹانا ہے اور مجھے باغبانی کا شوق بھی ہے۔

چھٹا نکتہ

تمہارے عزیز و اقارب پیشگی اجازت نامہ لیے بغیر نہیں آئیں گے۔ دو چار منٹ کی اجازت مل جایا کرے گی۔ اِس دوران تم اُن کی تواضع صرف پانی سے کروگی، کیوں کہ کچھ تکلف کرنے کے لیے وقت ہی نہیں۔ گرمی کے موسم میں ٹھنڈا پانی ایک نعمت ہے لیکن تمہارے چہیتے اگر دو چار گلاس چڑھا گئے تو گھر والے کیا کریں گے؟ پانی کی شدید قلت ہے اور ٹھنڈا پانی تو نایاب ہے۔ بس، نل کا پانی ہی ٹھیک رہے گا۔ کہہ دینا فریج خراب ہے۔

ساتواں نکتہ

اپنے والدین اور بھائی بہنوں کی تواضع چائے اور بسکٹ یا شربت سے کرسکتی ہو۔ کسی خاص موقع پر دعوت کر دینا بھی اچھے اخلاق کی نشانی ہے۔ نام تو میرا ہی ہوگا نا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ جب بھی آئیں گے، کچھ لے کر ہی آئیں گے۔ تم

ذرا خوش مزاجی کے ساتھ اُن کے کان میں یہ بات ڈال دینا کہ تحفہ لانے کے بجائے نقد رقم دے دیا کریں، اِن الفاظ کے ساتھ کہ ہم تمہارے لیے کچھ نہ لا سکے۔ جلدی کی وجہ سے کچھ سمجھ میں ہی نہیں آیا۔ لو! یہ تھوڑی سی رقم رکھ لو۔ اپنی مرضی کی کوئی چیز خرید لینا۔ اُن کے جاتے ہی تم وہ لفافہ چپ چاپ میرے حوالے کردو گی اور کبھی بھول کر بھی نہیں پوچھو گی کہ اُس میں کیا تھا۔

آٹھواں نکتہ

بار بار میکے کا چکر لگانا کوئی اچھی بات نہیں۔ نیک اور اچھی بہوئیں سسرال کو ہی اپنا گھر سمجھتی ہیں۔ عیدالفطر کے ایک ہفتہ بعد تم ایک ہفتے کے لیے ماں باپ سے ملنے چلی جانا اور عیدالضحیٰ پر اپنے یہاں اُن کی دعوت کر دینا۔ اگر کبھی ہنگامی حالات میں جانا پڑ گیا تو بس دو چار گھنٹے سے زیادہ نہیں ٹھہرنا۔ وہ بھی اس شرط پر کہ تمہارے گھر سے کوئی اگر لے جائے اور وقت مقررہ پر واپس پہنچا دے۔ اکیلے آنے جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور میرے بیٹے کے پاس وقت بالکل نہیں ہے۔

نواں نکتہ

تمہاری شادی کو ابھی دن ہی کتنے گزرے ہیں، فقط چند ماہ۔ ابھی تم بچوں کے بکھیڑوں سے آزاد ہو۔ مگر تم آزاد کہاں ہو؟ تمہاری نندوں کے بچے تمہارے ہی تو ہیں۔ مہینے میں صرف پندرہ دن کے لیے میرے پاس رہتے ہیں۔ اُن سے پیار کرو اور اُن کا دل بہلاؤ۔ بچے شرارتیں تو کرتے ہی ہیں، لیکن تم اُن کو آنکھیں نہیں دکھاؤ گی۔ غصّے کا اظہار بچوں کی نفسیات پر برا اثر چھوڑتا ہے۔ تم بچوں کو سنبھال لوگی تو اُن کی ماؤں کو بھی ذرا آزادی مل جائے گی اور وہ اطمینان کے ساتھ سیر و تفریح اور شاپنگ وغیرہ کرسکیں گی۔

اخبارات، رسائل اور ڈائجسٹوں کے ذریعے بہوؤں پر ڈھائے گئے مظالم کے بارے میں میرا مطالعہ نہایت وسیع ہے۔ فلموں اور ڈراموں میں دکھائے گئے نت نئے انداز بھی اچھے لگے۔ محلّے، پڑوس اور میل جول رکھنے والی خواتین سے بھی کافی معلومات ملتی رہتی ہیں۔ اکثر واقعات کی تو میں عینی شاہد بھی ہوں۔ جہیز کم لانے کی بنا پر بہوؤں کو طرح طرح کی اذیت، یہاں تک کہ زندہ جلا دینے تک کہ حادثات دیکھے۔ مگر تمہارا معاملہ اِن سب سے الگ ہے۔

تم تو اچھا خاصا جہیز لے کر آئی ہو اور ویسے بھی مجھے روپے پیسے کا لالچ نہیں۔ میرا ارمان تو بس یہ تھا کہ اپنے اوپر کیے گئے مظالم کا بدلہ اپنی بہو سے لوں گی اور اپنے دل کی حسرتیں چن چن کر نکالوں گی۔

مگر میری پیاری بہو! تم تو بڑی ہوشیار نکلیں۔ شاباش ہے تم پر۔ لگتا ہے کہ مستقبل بینی کے فن میں تم کچھ شد بد رکھتی ہو۔ تم نے اپنے کالے علم کے ذریعے یہ معلوم کرلیا کہ میرے عزائم کتنے عظیم ہیں، لہٰذا تم نے ''ایڑی چوٹی'' کا زور لگا کر میرے بیٹے کو اپنا تبادلہ کروانے پر مجبور کر دیا اور ایک ہزار میل دور جا کر بیٹھ گئیں۔

میری عزیز از جان بہو! مجھے تم سے محبت ہے، بے حد و حساب محبت۔ میری دعا ہے کہ تم جلد از جلد میرے پاس آ جاؤ اور ہم دونوں اچھی ساس بہو کی طرح مل جل کر رہیں۔ میرے پاس آجاؤ۔ تمہیں دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی ہیں۔ آج کل میری صحت بھی کچھ خراب چل رہی ہے۔ کیا تم چاہتی ہو کہ میں دنیا سے نامراد اُٹھ جاؤں؟

ضروری نوٹ:۔

میں بہ قائمی ہوش و حواس تمہیں اِس بات کی پوری اجازت دیتی ہوں کہ یہ شان دار نسخہ، جسے میں نہ آزما سکی، تم اپنی بہو پر ہو بہو آزما سکتی ہو، بلکہ تمہیں اِس میں کچھ کمی نظر آتی ہے تو وہ بھی شامل کرلینا۔

فقط

تم سے دوری جسے نہ آئی راس

میں وہی ہوں تمہاری اپنی ساس

www.urdugom.com

طاہرہ کامران

نیکی کا سفر

راہ سے بھٹکی بیٹی کو سیدھا راستہ دکھلانے والی جہاں دیدہ ماں کی انمول کتھا

دروازے پر گھنٹی بجتی ہی چلی گئی جیسے کوئی ہاتھ رکھ کر اٹھانا بھول گیا ہو۔ فائزہ نے احمد سے کہا ”جاؤ بیٹا جلدی سے جا کر دروازہ کھولو کوئی بہت جلدی میں لگتا ہے“۔ وہ بھاگ کر گیا اور دروازہ کھولا تو سامنے فاریہ کھڑی تھی۔

”اسلام علیکم باجی کیوں اتنی جلدی مچا رہی ہیں؟“ بھائی نے پوچھا لیکن فاریہ کوئی جواب دیے بغیر ہی اندر گھستی چلی گئی اور سیدھی ماں کی گود میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

فائزہ ہکا بکا سی بیٹی کو تکنے لگیں لیکن سنبھل کر بیٹی کا سر اٹھایا اور پیار سے پوچھا ”فاریہ میری جان رونا بند کرو اور مجھ سے بات تو کرو“۔ احمد نے بھی بہن کو دلاسا دیا اور پانی پلایا۔ پانی پی کر فاریہ کا رونا بند ہوا اور وہ خاموشی سے دونوں کو تکنے لگی کہ بات کس طرح شروع کرے۔

فائزہ ایک سمجھ دار ماں ہونے کے ساتھ اپنی بیٹی کے مزاج سے بھی خوب واقف تھیں۔ ضد اور جلد بازی دونوں ہی فاریہ کے مزاج کا خاصا تھے۔

”امی بس اب بہت ہو چکا۔ اسکول میں نوکری کی اجازت تو مجھے خوابوں میں بھی نہ مل سکے گی۔ حسن کی تنخواہ بچوں کے اخراجات اٹھانے کے قابل نہیں اور میں حسن کو قائل نہیں کر سکتی۔ اس لیے کڑھ کڑھ کر ساتھ رہنے سے اچھا ہے کہ ہم الگ ہی ہو جائیں“۔

فاریہ ایک سانس میں ہی ساری بات کہہ گئی۔ فائزہ کے لیے بیٹی کا یہ غصہ کوئی نئی بات نہ تھی لیکن شوہر سے علیحدگی کی بات ایک ایسا تیر تھا جو فائزہ کے دل میں جا لگا لیکن انھوں نے اپنی تکلیف کا اظہار نہ کیا بلکہ بیٹی کو سینے سے لگایا اور خوب پیار کیا پھر اپنے ہاتھ سے قمیص کی آستین کو اُوپر چڑھا دیا۔

”دیکھو فاریہ تم نے جب سے ہوش سنبھالا ہے ہمیشہ میرے ہاتھ میں اس نشان سے متعلق سوال کیا کہ امی یہ چوٹ کیسے لگی اور میں نے ہمیشہ تم دونوں کو ٹال دیا لیکن میری بیٹی آج تم اپنا گھر چھوڑنے کی بات کر رہی ہو تو میں چاہتی ہوں کہ تم اس چوٹ کی اصل حقیقت سے واقف ہو جاؤ“۔

اس لمحے فاریہ جیسے اپنا غصہ بھول ہی گئی اور ماں کے ہاتھ کو غور سے دیکھنے لگی۔

ماں نے بات جاری رکھی ”بیٹا تم جانتی ہو کہ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں۔ انھوں نے ہر ماں باپ کی طرح مجھے نہایت لاڈ پیار سے پالا لیکن اس کے ساتھ وہ میری تربیت سے بھی غافل نہ ہوئے۔ اُسی تربیت کا نتیجہ ہے کہ میرا گھر بسا رہا“۔

اب فاریہ کے ساتھ احمد بھی اپنی ماں کی جانب حیران نظروں سے دیکھنے لگا کیوں کہ اس سے پہلے یہ باتیں کبھی نہ سنی تھیں۔

”بچو جب میری شادی ہوئی تو میں صرف اٹھارہ برس کی تھی۔ دوسری طرف تمہارے والد دو بہنوں سے کافی چھوٹے تھے اور ان کے والدین وفات پا چکے تھے۔ بہنیں شادی شدہ تھیں۔ وہ اپنی بوڑھی خالہ کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ شادی کے ایک سال بعد خالہ بھی چل بسیں اور گھر میں کوئی بڑا نہ رہا۔ بہنیں دوسرے شہروں میں مقیم تھیں۔ ان حالات نے تمہارے والد کی شخصیت پر گہرا اثر ڈالا۔ ان میں بے تحاشا غصہ تھا۔ دوسری طرف پیسہ کمانے کی فکر نے انھیں چڑچڑا بھی بنا دیا۔ ان حالات میں وہ تربیت ہی کام آتی جو مجھے والدین سے مجھے ملی تھی۔ میں نے صبر اور خوش دلی سے تمام معاملات کو سنبھالا۔ راتوں کو دیر سے آنا تمہارے والد کا معمول بن گیا۔ رہی سہی کسر دوستوں نے پوری کر دی۔ تم دونوں کی پیدائش سے بھی معمولات زندگی تبدیل نہ ہوئے جبکہ میری ذمے داریاں مزید بڑھ گئیں۔

”یہی وہ دن تھے جب یہ نشان میرے ہاتھ کی زینت بنا۔ تمہارے والد ایک رات نشے کی کیفیت میں گھر آئے۔ یہ صورتحال میرے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ پہلی بار میں نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی تاکہ بات مزید نہ بڑھے، لیکن نشے کا جادو بھی سر چڑھ کر بولتا ہے۔ وہ مزید غصے میں آ گئے اور مجھے دھکا دے دیا۔ میں شیشے کی میز پر جا گری اور شیشہ ٹوٹ کر میرے بازو میں گھس گیا۔“

یہ کہہ کر فائزہ نے لمبا سانس لیا۔ احمد اور فاریہ آنکھوں میں آنسو لیے یہ سن رہے تھے۔ فائزہ دوبارہ گویا ہوئی ”اس وقت تمہارے نانا، نانی کی ہمت اور ان کی تربیت نے میرے گھر کو اجڑنے سے بچا لیا۔ بازو میں کئی ٹانکے آئے۔ مرہم پٹی چلتی رہی۔ کچھ دن والدین کے گھر رہ کر میں واپس آ گئی کیونکہ وہ بھی یہی چاہتے تھے۔ میں نے واپس آ کر تمہارے والد سے کچھ نہ کہا بلکہ معمول کے مطابق ذمہ داریاں ادا کرتی رہی۔

”وقت گزرنے کے ساتھ تمہارے والد کے مزاج میں تبدیلی آ گئی۔ میرے بچو! شاید اس نشان کی حقیقت کبھی نہ کھلتی لیکن فاریہ تم نے مجھے مجبور کر دیا، یہ کہہ کر کہ تم حسن سے الگ ہونا چاہتی ہو۔ بیٹی! وقت کبھی ایک جیسا نہیں رہتا۔ ماں گھر بناتی ہے۔ تم بھی ماں ہو۔ اپنے حالات کو دیکھو، تمہارے ساس سسر بوڑھے ہیں اور تمہاری نند ابھی چھوٹی ہے۔ تم نوکری کرو گی تو ان بوڑھے ماں باپ کو گھر کے کام کرنے پڑیں گے اور جب تم تھک کر آؤ گی تو تمہاری ذمہ داری مزید بڑھ جائے گی۔

حسن نے صحیح فیصلہ کیا ہے۔ وہ دوسری نوکری کی کوشش بھی تو کر رہا ہے۔ ذرا صبر سے کام لو، اللہ تمہارے ساتھ ہے۔ تمہارا گھر بسا رہے یہی اہم ہے۔ میری تربیت بھی یہی تھی اور آج میں تمہیں بھی گھر جوڑ کر رکھنے کی نصیحت کرتی ہوں۔ میرے بازو کا زخم مجھ سے گھر چھوڑنے کا تقاضا کر رہا تھا جبکہ والدین کی تربیت سے ملا صبر مجھ سے گھر جوڑنے کا تقاضا کر رہا تھا اور جیت تربیت کی ہوئی۔

تمہارے والد کی تربیت میں کمی رہ گئی تھی کیونکہ وہ ماں باپ سے محروم تھے! آج وہ اس دنیا میں نہیں لیکن وہ میرے احسان مند تھے کہ میں نے انھیں اکیلا نہیں چھوڑا نہ ان کے بچوں سے جدا کیا۔ تم بھی حسن کے حالات کو سمجھو۔ تمام مسئلے حل ہو جائیں گے، انشاء اللہ۔

فاریہ اب دوبارہ رونے لگی اور بولی۔ ”امی آپ نے یہ باتیں پہلے کیوں نہ بتائیں۔ آپ نے واقعی صبر کی مثال قائم کی ہے۔ میں آپ ہی کی بیٹی ہوں۔ مایوس نہیں کروں گی۔ چلو احمد مجھے گھر چھوڑ آؤ۔ بچے اسکول سے آنے والے ہیں“۔

بیٹی کی یہ بات سن کر فائزہ کے رگ و پے میں اطمینان بھر گیا اور اس نے اپنے آنسو پونچھ لیے۔ نیکی کا سفر منزل بہ منزل آگے بڑھ رہا ہے اور یہی اصل کامیابی تھی۔

www.urdugem.com

ڈاکٹر فیاض احمد ہرل
fayyazherl24@gmail.com

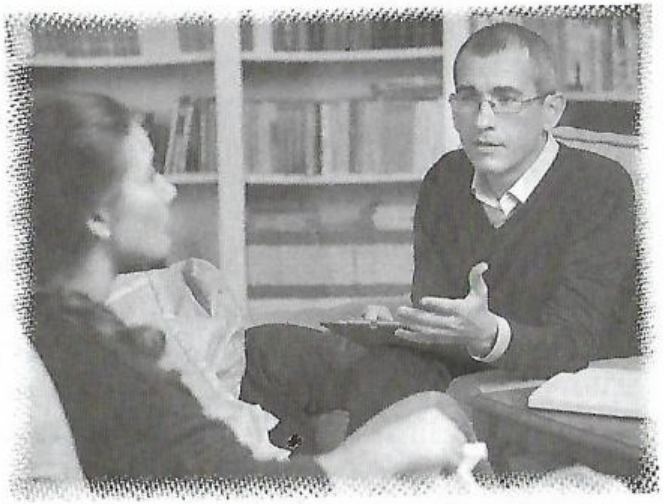

مشورہ حاضر ہے

علومِ طِب کی روشنی میں نفسیاتی مسائل کا شافی حل

بیٹے کا بُرا رویہ:

میں آپ سے اپنے بیٹے کے رویّے کے بارے میں مشورہ کرنا چاہتی ہوں۔ میرے تین بچے ہیں۔ بڑا بیٹا اور بیٹی یونیورسٹی اور کالج کی سطح پر پڑھ رہے ہیں اور بالکل ٹھیک ہیں۔ البتہ چھوٹا بیٹا، جس کی عمر نو برس ہے اور اسکول میں گریڈ ۴ میں پڑھ رہا ہے، اُس کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوں۔

مسئلہ یہ ہے کہ وہ ہر وقت بے چین اور بے قرار سا رہتا ہے۔ ناممکن ہے کہ ایک جگہ ٹک کر بیٹھ کر تھوڑی دیر کوئی کام کرلے۔ روز اسکول کا کام کروانا بھی ایک مصیبت بن جاتا ہے۔ اُس کے اساتذہ کا کہنا ہے کہ وہ پڑھائی پر توجّہ نہیں دیتا۔ اگرچہ جب چاہے فوراً بات سمجھ کر سبق یاد کرلیتا ہے۔ اُن کے مطابق اِس میں بے صبرا پن ہے، اپنی باری کا انتظار نہیں کرتا اور قطار میں سیدھا کھڑا ہونے کی بجائے ہلتا جلتا رہتا ہے۔ گھر میں بھی وہ ہر وقت بہن بھائی کو تنگ کرتا اور چیزوں کو اُلٹ پلٹ کرتا رہتا ہے۔

براہِ مہربانی مجھے مشورہ دیں کہ یہ کوئی بیماری ہے یا وہ جان بوجھ کر ایسا کرتا ہے، کیونکہ اس کے بارے میں سوچ سوچ کر میری اپنی طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔

والسلام
بشریٰ عزیز لاہور

جواب: آپ نے بیٹے کی کیفیت کے بارے میں جو تفصیلات بتائی ہیں وہ بچپن اور لڑکپن کی ایک جانی پہچانی بیماری Attention deficit hyperactivity clorder کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ آپ تسلی رکھیے کہ یہ بیماری قابلِ علاج ہے اور اِس کا علاج دواؤں اور نفسیاتی طریقۂ علاج دونوں کے ذریعے ممکن ہے۔ اِس بیماری کے حوالے سے

انسان روزمرہ زندگی گزارتے ہوئے قدرتاً مشکلات اور رکاوٹوں سے بھی نبرد آزما ہوتا ہے۔ بعض اوقات کڑی مشکلیں اس کے دل دماغ پر منفی اثرات مرتب کرتی ہیں۔ مثلاً وہ نفسیاتی مسائل کا نشانہ بن کر معمول کے کام کاج بھی صحیح طرح انجام نہیں دے پاتا۔ اس کی اچھی بھلی زندگی اجیرن بن جاتی ہے۔ انھی جذباتی و نفسیاتی مسائل کو سلجھانے کے لیے آپ کا دیرینہ رفیق، اُردو ڈائجسٹ ایک نیا سلسلہ شروع کر رہا ہے۔

اس سلسلے کے تحت معروف ماہر نفسیات، ڈاکٹر فیاض احمد ہرل خواتین و حضرات کی نفسیاتی اُلجھنوں کا شافی حل طبّی علوم اور اپنے تجربے کی روشنی میں پیش کریں گے۔ قارئین کرام باتوسط اُردو ڈائجسٹ یا ڈاکٹر صاحب کی ای میل پر نفسیاتی مسائل سے متعلق اپنے سوالات بھیج سکتے ہیں۔ آپ واپڈا اسپتال، لاہور سے منسلک ہیں۔

چند نکات غور کے قابل ہیں۔

۱۔ بیماری کی دو بنیادی خصوصیات باتوں اور کاموں کی طرف توجہ نہ دینا اور حد سے بڑھی ہوئی بے چینی اور تیزی ہیں۔

۲۔ اگر گھر کے باقی افراد میں بھی بے صبری اور چڑچڑا پن کا مادہ نمایاں ہو تو یہ بھی چھوٹے بچوں پر اثرات ڈالتا ہے اور اُن میں یہ خصوصیات بڑھ جاتی ہیں۔ اِس لیے خاص طور پر آپ اور آپ کے شوہر کو بھی احتیاط کرنی چاہیے کہ بچوں کے سامنے اُلجھاؤ، لڑائی جھگڑا یا اُونچی آواز میں گفتگو حتی الامکان کم سے کم ہو۔

۳۔ آج کل بچے جو بازاری غذائیں ذوق و شوق سے استعمال کرتے ہیں مثلاً چپس، آلو کے قتلے وغیرہ۔ اِن میں سے بیشتر غذاؤں میں ایک کیمیائی جزو مونوسوڈیم گلوٹامیٹ (Mono Sodium glutamate) کے نام سے شامل ہوتا ہے۔ طبّی تحقیقات کے مطابق یہ کیمیائی مادہ بچوں میں بے چینی اور تیزی کے مصنوعی اثرات پیدا کرتا ہے۔ اِس لیے آپ کوشش کر کے اِن غذاؤں کے استعمال میں کمی لائیے اور مختلف نئی تراکیب سے گھر میں پکوان بنا کر بیٹے کو ان کی طرف راغب کیجیے۔

۴۔ گھر میں کولا مشروبات کا استعمال کم سے کم کیجیے کیونکہ اِن میں کیفین نامی کیمیائی مادہ شامل ہوتا ہے۔ وہ ایسی کیفیات پیدا کرنے میں اپنا حصّہ ڈالتا ہے۔

۵۔ ایک اور نکتہ بھی توجہ کے قابل ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بچوں کے کچھ کارٹونوں اور کمپیوٹر گیمز میں کرداروں کو بہت تیزی سے حرکت کرتے دکھایا جاتا ہے۔ سائنسی تحقیق میں دیکھا گیا ہے کہ ایسے کارٹون بچوں کے مزاج میں تیزی اور بے صبری کا مادہ پیدا کرتے ہیں۔ یوں عام زندگی میں بھی وہ اپنی ہر خواہش جلد پوری ہوتا دیکھنے کے عادی بن جاتے ہیں اور ایسا نہ ہونے پر طوفان کھڑا کرتے رہتے ہیں۔

اگر آپ کا بیٹا ایسے کارٹونوں میں زیادہ دلچسپی لیتا ہے تو اسے آہستہ آہستہ ایسے کارٹونز کی طرف مائل کیجیے جن میں روزمرّہ زندگی کے واقعات پر مبنی کہانیاں پیش کی گئی ہوں۔ کئی تنظیموں نے بچوں کے لیے ایسی سی ڈیز (CD's) بنائی ہیں اور وہ تھوڑی سی تلاش پر بازار سے مل سکتی ہیں۔

۶۔ اِسی طرح بچوں کی بہت سی ویڈیو گیمز لڑائی اور تشدّد کے مناظر پر مبنی ہوتی ہیں جن کے بہت منفی اثرات دیکھے گئے ہیں۔ ایسے کھیلوں کے بجائے بیٹے کو صحت مندانہ کھیلوں کی طرف راغب کرنے کی کوشش کیجیے۔

www.urdugem.com

۷۔ بازار میں بچوں کے لیے بہت سی دلچسپ کہانیوں اور واقعات کی کتابیں بھی ملتی ہیں۔ اگر آپ ہمت کر کے پہلے خود ان کا مطالعہ کریں اور پھر وقتاً فوقتاً اِن میں سے دلچسپ انداز میں کہانیاں سنائیں تو اِس سے کچھ عرصے بعد ممکن ہے کہ وہ خود ہی اِن کی طرف مائل ہو جائے۔ اِس طرح کی مشق سے نہ صرف اُس میں بات توجّہ سے سننے کی صلاحیت بہتر ہو گی بلکہ خود مطالعہ کرنے کا رجحان بھی پیدا ہو سکتا ہے۔

۸۔ آپ بچے کے رویّے میں بہتری کے لیے کسی اچھے کلینیکل سائیکالوجسٹ (clinical psychologist) سے اِس کے کونسلنگ سیشنز (counselling sessions) بھی کروا سکتی ہیں۔ اِس سے آپ کو بیٹے کے رویّے کو سمجھنے میں مدد ملے گی اور اندازہ ہو گا کہ اُس سے کس انداز میں پیش آنا اُس کے رویے کو بہتر کر سکتا ہے۔

۹۔ اگر اِن سب طریقوں پر عمل پیرا ہونے کے بعد بھی آپ کو محسوس ہو کہ بیٹے کے رویے میں بہتری نہیں آ رہی تو آپ کسی سائیکاٹرسٹ سے بھی مشورہ کر سکتی ہیں۔ اُن کی تجویز کردہ مخصوص ادویات کے استعمال سے یہ مسئلہ بہتر ہو سکتا ہے۔

شادی کامیاب ہو گی؟

میرا نام نعیم ہے اور میری عمر ۲۸ برس ہے۔ میں نے ماس کمیونیکیشن میں ایم اے کیا ہے اور ایک پرائیویٹ فرم میں جاب کر رہا ہوں۔ میں ایک ذاتی مسئلے میں بہت کنفیوژن کا شکار ہوں اور اِس سلسلے میں آپ سے راہنمائی چاہتا ہوں۔ میں جب دس برس کا تھا تو میرے والد اچانک وفات پا گئے۔ اِس کے بعد سے مجھے میری والدہ نے پالا۔ میرا بچپن اور لڑکپن کا وقت بہت تنگی، عُسرت اور کشمکش میں گزرا۔ یتیمی اور بیوگی کی کسمپرسی کیا ہوتی ہے اور کیسے لمحہ لمحہ دل پر زخم لگتے ہیں، یہ مجھ سے اور میری والدہ سے بہتر کون جان سکتا ہے۔ البتہ جب سے میں نے ملازمت شروع کی ہے، حالات بہت بہتر ہو گئے ہیں۔

میں آپ سے شادی کے انتخاب کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں۔ میری فرم میں ایک لڑکی کام کرتی ہے جس سے میری اچھی شناسائی ہے۔ ہم ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے ہیں۔ میری والدہ اُس سے مل چکی ہیں اور اُنھیں اِس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں۔ لڑکی کے والدین بھی وفات پا چکے اور وہ اپنے ماموں کے گھر میں رہتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ چونکہ ہم دونوں زندگی میں ایک جیسے حالات سے گزرے ہیں اور دونوں محرومیٔ محبت کا شکار رہے ہیں اِس لیے ہم ایک دوسرے کے مزاج اور توقعات کو زیادہ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ یوں اُس کے مطابق ہماری شادی کے کامیاب ہونے کا امکان عام شادیوں سے زیادہ ہے۔

سچ پوچھیے تو مجھے لڑکی کی دلیل میں کافی وزن محسوس ہوتا ہے لیکن میں اُس کی بار بار ناراض ہونے کی عادت سے زچ بھی ہو جاتا ہوں۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ہماری بات چیت کا بیشتر وقت ایک دوسرے سے شکوہ و شکایت ہی میں گزر جاتا ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ میرے حالات کی روشنی میں مجھے مشورہ دیجیے کہ مجھے کیا فیصلہ کرنا چاہیے۔

جواب: آپ نے اپنے سوال میں بڑا غور طلب نکتہ اُٹھایا ہے۔ یہ اِس بات کی دلیل ہے کہ آپ جذباتی معاملات میں بھی عقل کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ اِس میں مرکزی نکتہ یہ ہے کہ آپ دونوں نے یتیمی کا زخم سہا ہے اور اِس محرومی نے دونوں کو حسّاس اور زود رنج بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ دونوں کے درمیان ہر وقت

الجھاؤ کی فضا رہتی ہے۔

جو شخص محرومیٔ محبت کا شکار رہا ہو، اُس کی نفسیات توجہ یا محبت دینے (care/ attention giving) کی بہ نسبت توجّہ طلبی (care/ attention seeking) پر زیادہ مرکوز رہتی ہے اور اُس میں دوسروں سے مسلسل شکوہ و شکایت کرنے کی عادت پیدا ہو جاتی ہے۔ کسی فرد کے ایسے رویّے کو دوسرے لوگ عام طور پر خود غرضی کا نام دیتے ہیں۔ اب اگر ایسے دو افراد، جو نیا بندھن استوار کرنے لگے ہوں، دونوں ہی اِس کیفیت یعنی توجہ طلبی میں مبتلا ہوں تو آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ اِس سے باہمی ٹکراؤ (conflict) پیدا ہونے کے امکانات ہی زیادہ ہوں گے۔

اُوپر بیان کردہ وضاحت اور تجزیے سے میرا یہ عندیہ نہیں کہ آپ شادی کی تجویز یکسر رَد کر دیں۔ اس کی بہ نسبت میرا مشورہ یہ ہو گا کہ آپ آپس میں اِس حوالے سے تفصیلی گفتگو کر لیں۔ اپنی فیملی کے کسی معاملہ فہم بزرگ سے بھی مشورہ کرنے میں حرج نہ سمجھیں اور ازدواجی موافقت کے حوالے سے متعلقہ کتابوں اور تحریروں کے مطالعے سے بھی فائدہ اٹھائیں۔

مجھے اُمید ہے کہ آپ اِس نکتے کا فہم رکھتے ہوئے جو بھی فیصلہ کریں گے، اُسے نبھانا کسی بھی فوری فیصلے کی نسبت زیادہ آسان ہو گا۔

نیند میں خرابی:

میرا نام عالیہ ہے۔ میرا تعلق درمیانے طبقے کے شہری گھرانے سے ہے۔ میری عمر ۲۶ برس ہے۔ والد ریٹائرڈ سرکاری ملازم جبکہ والدہ چند برس قبل وفات پا گئیں۔ تین بھائی اسکول اور کالج کی مختلف جماعتوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ میں نے چند برس قبل گریجویشن کی تھی لیکن گھر میں کوئی خاتون نہ ہونے کی وجہ سے تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رکھ سکی۔ اب میرا زیادہ تر وقت گھریلو ذمہ داریاں پوری کرتے گزرتا ہے۔

میرا مسئلہ یہ ہے کہ گزشتہ ایک برس سے میری نیند میں بہت خرابی آ چکی۔ سونے لیٹتی ہوں تو مختلف طرح کی پریشان کُن سوچیں ذہن میں چلنا شروع ہو جاتی ہیں۔ ماضی کے واقعات اور مستقبل کے خدشات کسی فلم کی صورت دماغ میں گردش کرتے ہیں۔ کچھ دیر کروٹیں بدلنے کے بعد میں گھبرا کر اُٹھ کر بیٹھ جاتی ہوں۔ جب وقت نہیں گزرتا تو لیپ ٹاپ پر کوئی فلم یا ڈرامہ وغیرہ لگا لیتی ہوں۔ ہفتے میں تین چار راتیں ایسا ہوتا ہے۔

نیند پوری نہ ہونے سے دن بھر طبیعت نڈھال اور جسم تھکا تھکا سا رہتا ہے۔ کسی سے بات کرنے کو دل نہیں کرتا اور چھوٹے سے چھوٹا کام بھی بوجھ لگتا ہے۔ میری آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے ہیں اور زندگی سے دل اُچاٹ ہوتا جا رہا ہے۔ میں تمام عُمر آپ کی احسان مند رہوں گی اگر آپ اِس مسئلے سے نکلنے میں میری مدد فرمائیں۔

جواب: آپ کے خط سے بہت پریشانی اور نا اُمیدی سی جھلک رہی ہے جو تشویشناک ہے حالانکہ آپ کا مسئلہ کوئی ایسا سنگین نہیں۔ اب میں نکتہ وار وہ اقدامات لکھتا ہوں جن پر عمل کرنے سے آپ کے مسئلے میں بہت بہتری آ سکتی ہے۔

۱۔ پہلی اور سب سے ضروری بات تو یہ ہے کہ آپ اللہ کریم کی رحمت سے ہرگز مایوس نہ ہوں۔ اُس کا یہ اٹل وعدہ ہے کہ وہ اپنے بندوں پر اُن کی ہمت سے بڑھ کر بوجھ نہیں ڈالتا۔ جب ہمیں محسوس ہونے لگتا ہے کہ مشکلات برداشت کرتے کرتے ہماری ہمت جواب دینے والی ہے اور ہر طرف فقط اندھیرا ہی اندھیرا ہے تو یقین کیجیے، وہی وقت اللہ کی مدد کے پہنچنے کا ہوتا ہے۔

www.urdudigest.com

۲۔دوسری بات یہ کہ گھریلو کاموں سے تھوڑا وقت نکال کر آپ ایسی کتابوں کا مطالعہ کیجیے جو حوصلہ افزائی اور ہمت پیدا کرنے والی ہوں۔ اِس سے میری مراد (Motivational books) سے ہے۔ آپ ماضی اور حال کی ایسی عظیم شخصیات کی سوانح عمریاں بھی پڑھ سکتی ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ اِن لوگوں نے کڑے اور مشکل حالات میں بھی اپنے عزم کو بلند رکھا اور بھرپور محنت اور قوی ارادے سے ہر مشکل پر قابو پالیا۔ اِس حوالے سے ایک بہت اچھی مثال ''اُردو ڈائجسٹ'' ہے جس میں عزم و ہمت کی کہانیاں اور اُمید پیدا کرنے والے مضامین ہر ماہ چھپتے ہیں اور آپ اِس کی باقاعدہ قاری بن کر بھرپور فائدہ اُٹھا سکتی ہیں۔

۳۔آپ نے نیند کے جس مسئلے کا ذکر کیا وہ بھی ڈپریشن کے مسئلے ہی کا ایک حصّہ ہے۔ ہماری نیند کے نظام پر بہت سے عوامل کا اثر ہوتا ہے جن میں سے چند میں آپ کی معلومات کے لیے درج کرتا ہوں:

☆ جن مشروبات میں کیفین نامی کیمیائی مادہ شامل ہو مثلاً چائے، کافی، کولا مشروبات وغیرہ۔ وہ نیند کے نظام میں خلل ڈالتے ہیں۔ اِس لیے سونے سے پہلے آخری تین چار گھنٹوں میں اِن سب سے پرہیز ضروری ہے۔

☆ سونے سے پہلے نیم گرم دودھ کا گلاس نیند لانے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

☆ لیپ ٹاپ، موبائل، وائی فائی اور دوسرے آلات جن سے برقی مقناطیسی لہریں پیدا ہوں، سائنسی تحقیق کے مطابق نیند میں خرابی کا باعث بن سکتے ہیں۔ سونے سے قبل آخری دو گھنٹوں میں اِن کا استعمال نیند کا مسئلہ پیدا کر سکتا ہے۔ اِس حوالے سے آپ کو احتیاط کرنی چاہیے۔

☆ سونے سے قبل آخری دو گھنٹوں میں کوئی سنسنی خیز یا جذباتی پروگرام دیکھنا نیند خراب ہونے کا سبب بن سکتا ہے سو اِس نکتے کو بھی مدِنظر رکھیے۔ اس کے بجائے اگر آپ ہلکی پھلکی موسیقی سُنیں جس میں بول نہ ہوں صرف سُر ہوں، اس سے آپ بہ نسبت ٹی وی پروگراموں کے، زیادہ پُرسکون ہو سکتے ہیں۔

☆ آپ نے سونے سے پہلے لیٹنے کے دوران جن پریشان کُن سوچوں کا ذکر کیا ہے وہ یقینی طور پر نیند کو آنے سے روکتی ہیں اگر آپ اس وقت کسی خوبصورت آواز میں قرآن پاک کی تلاوت سُنیں تو اِن سے نیند آنے میں مدد مل سکتی ہے۔

☆ اگر ممکن ہو تو سونے کے وقت سے دو تین گھنٹے قبل آدھ گھنٹے کے لیے تیز قدم سیر کا معمول بنائیے۔ اِس سے جسم کے مختلف کیمیائی اجزاء اعتدال کی سطح پر آتے ہیں اور بہتر نیند آنے کا امکان ہوتا ہے۔

☆ دن کے فارغ اوقات میں ٹی وی یا کمپیوٹر پر ہلکا پھلکا پُرمزاح پروگرام دیکھنے سے بھی ذہن و جسم کا کھچاؤ کم ہوتا ہے۔

۴۔کئی دفعہ انسان خوشی کے واقعات کا انتظار کرتا رہتا ہے۔ خود خوشی کا موقع پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اگر آپ کی کسی اچھی سہیلی سے عرصے سے بات نہیں ہوئی تو آپ اُس کے فون کا انتظار کرنے کی بجائے خود اُسے فون کر سکتی ہیں۔ کوئی چھوٹا سا تحفہ دے کر آپ کسی ایسے فرد یا بچے کو خوشی دے سکتی ہیں جو آپ کی طرف سے ایسی توقع نہیں رکھتا۔ مطلب کہ چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے مواقع خود پیدا کرنے کی کوشش کیجیے۔ اِس سے آپ خود بہتر محسوس کریں گی اور آپ کا ڈپریشن کم ہوگا۔

۵۔اگر اِن سب طریقوں کے باوجود بھی آپ کی نیند اور طبیعت بہتر نہ ہو تو ایک دفعہ کسی اچھے سائیکاٹرسٹ سے مشورہ بھی مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ ◆◆◆

اوہنری / مہر افروز

آخری پتا

ایک مددگار کی لاجواب کہانی، اس نے گورکنارے پہنچی مریضہ میں ہمت و توانائی بھر دی تھی

چھ، پانچ، چار، تین، دو...... لو صرف ایک رہ گیا! جونا اپنے بستر پر لیٹی باہر گرنے والے پتے دیکھ اور گن رہی تھی جونا کی کھڑکی کے باہر سامنے والی دیوار کے ساتھ عشق پیچاں کی بیل تھی جس کے پتے موسم خزاں کی وجہ سے ڈھیرے ڈھیرے جھڑتے جا رہے تھے۔ اب صرف ایک ہی پتا رہ گیا تھا۔

صرف چند دِن پہلے وُہ بیل پتوں سے لدی ہوئی تھی۔ سیو، جونا سے تھوڑے سے فاصلے پر کھڑی اس کی ہمکلامی سُن رہی تھی۔ جونا اور سیو کی چند ایک ملاقاتیں ایک کیفے میں ہوئیں اور گہری دوستی کا سبب بن گئیں۔ دراصل دونوں کا مزاج اور سرگرمیاں ایک جیسی تھیں۔ تصاویر بنانا اُن کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ جونا اور سیو کا تعلق گرین وچ ولیج (Greenwch Village) سے تھا۔ اِس علاقے کو آرٹسٹ کالونی بھی کہا جاتا تھا کیونکہ وہاں فلیٹ قدرے سستے اور اردگرد کا ماحول خاصا سہانا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آرٹسٹ خود کو پُرسکون محسوس کرتے تھے اور اپنا کام احسن طریقے سے انجام دینے میں اُنھیں کوئی دقت محسوس نہ ہوتی۔

جونا اور سیو نے مل کر ایک کمرہ کرایے پر لے لیا۔ کمرے میں ہر طرف بکھرے رنگ، پینٹ، برش مکینوں کے مزاج کی بھرپور عکاسی کرتے تھے۔ ہر طرف خوشیاں بکھری ہوئی تھیں

www.urdugem.com

کہ اچانک آرٹسٹ کالونی میں نمونیے کی وبا پھیل گئی۔ چند لوگ دیکھتے ہی دیکھتے زندگی کی بازی ہار گئے۔ جونا کو بھی اِس بیماری نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

بیماری سے زیادہ جونا کی کم ہمتی تھی کہ بخار ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ دراصل جونا نے خود کو یقین دلا دیا تھا کہ اب وہ زندہ نہیں رہ پائے گی اور یہ بیماری اُسے قبر تک لے جائے گی یہی مایوس کن سوچ اُسے بستر سے اُٹھنے نہیں دے رہی تھی۔ ساتھ ساتھ جونا کی توجہ کا مرکز وہ عشق پیچاں کی بیل بن گئی جس کا صرف ایک پتا باقی تھا۔ جونا سمجھتی تھی کہ جیسے جیسے بیل کے پتے گر رہے تھے، اُسی تعداد میں نمونیہ سے انسان مَر رہے ہیں۔ اب یہ آخری پتا جونا نے اپنے لیے مخصوص کرلیا کہ جیسے ہی وہ گرے گا، وہ مرجائے گی۔

سیو کو جب اِن مایوسی بھرے خیالات کا پتا چلا تو وہ اپنی دوست جونا کے لیے بہت پریشان ہوئی۔ سیو ہر حال میں جونا کو زندگی کی طرف واپس لانا چاہتی تھی۔ سیو جانتی تھی کہ بیماری انسان کو اِس قدر موت کے قریب نہیں کرتی جتنا کہ مایوسی! اسی لیے مذہب نے بھی مایوسی کو گناہ قرار دیا ہے۔ ہمیں کسی بھی صورت امید کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔ خدا بڑا رحیم ہے، کریم ہے۔ اگر انسان کوشش کرے تو وہ ایسے ہزاروں راستے دکھا دیتا ہے۔ ڈاکٹر نے بھی سیو کو یہی بتایا کہ جونا بستر سے جلد اُٹھ سکتی ہے اگر وہ اپنے اندر جینے کی امنگ پیدا کر لے۔ سیو تو جونا کے حالِ دل سے بخوبی واقف ہے اور اُسے بہت پیار کرتی ہے۔

سیو چاہتی ہے کہ جونا جلد از جلد ٹھیک ہوجائے۔ سیو جلدی سے نچلے والے فلیٹ میں گئی اور بہرمن (Behrman) نامی آرٹسٹ سے ملی۔ سیو نے جونا کے متعلق بہرمن کو ساری تفصیلات سے آگاہ کیا اور درخواست کی کہ وہ جونا کی مدد کرے۔ بہرمن ایک بوڑھا آرٹسٹ تھا۔

اُس نے چالیس برس سے اپنے فن کی طرف خاص توجہ نہیں دی یا یوں کہہ لیں کہ اپنی پینٹنگز پر دھیان نہیں دیا۔

جب بہرمن کو پتا چلا کہ جونا اتنی کم ہمت لڑکی ہے تو اُسے بہت افسوس ہوا۔ اب بہرمن نے اپنے اندر پختہ عزم کر لیا کہ وہ جونا کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔

خدا کی قدرت اُسی رات بہت خوفناک طوفان آیا اور اپنے ساتھ بارش بھی لایا۔ یہ طوفان اور بارش چھوٹی موٹی اشیاء کو اپنے ساتھ اُڑا اور بہا کر لے گئے۔ درختوں کے پتے سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے لگے۔ جونا سوچ رہی تھی کہ یقیناً وہ آخری پتا آج گر چکا اور جونا کی زندگی کا بھی آج آخری دِن ہوگا۔

جونا نے سیو سے گزارش کی کہ کھڑکی کے پردے ہٹا دے تاکہ وہ بیل اور آخری پتے کو دیکھ سکے۔ جیسے ہی سیو نے پردہ ہٹایا تو جونا بولی ”لو دیکھو! دیکھو! وہ پتا ابھی تک وہیں ہے۔ شاید اُس نے گرنے سے انکار کر دیا ہے۔ وہ زندہ رہنا چاہتا ہے۔“

یہ سوچ کر جونا کو تھوڑی توانائی محسوس ہوئی۔ اگلی رات بھی اپنے ساتھ تند و تیز ہوائیں لائی مگر یہ کیا؟ آخری پتا ابھی تک بیل اور دیوار سے چپکا ہوا تھا۔ جونا کے اندر بہت ہمت آچکی تھی۔ اُس نے جینے کا فیصلہ کرلیا۔ اُس کی قوتِ ارادی بخار کے سامنے تن کر کھڑی ہوگئی۔ اتنی دیر میں ڈاکٹر صاحب تشریف لے آئے اور اُنھوں نے یہ نوید سنائی کہ جونا خطرے سے باہر ہے۔ وہ خوش بھی تھے کہ صرف دو روز میں ہی جونا کا بخار ٹوٹ گیا۔

دوسری طرف دو روز سے بوڑھا بہرمن شدید بخار میں مبتلا تھا۔ جس رات بوڑھے آرٹسٹ کو بخار ہوا اُس کے کپڑے اور جوتے بھیگے ہوئے تھے۔

ڈاکٹر چلا گیا تو سیو جونا کے پاس آئی۔ جونا بہت

پرسکون! اپنے نرم بستر میں گرم نیلے رنگ کی شال اوڑھے بیٹھی تھی۔ سیو بولی، ”جونا میں تمہیں ایک راز کی بات بتانا چاہتی ہوں۔ جب بوڑھے بہرمن کو اسپتال پہنچایا گیا تو اُس وقت اُس کے کپڑے اور جوتے برف کی طرح ٹھنڈے تھے۔ کوئی کچھ بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ اتنی طوفانی بارش میں کہاں بھیگتا رہا؟ پھر جب بوڑھے آرٹسٹ کی لالٹین، برش، رنگ اور سیڑھی ملی تو سارا ماجرا کھل کر سامنے آگیا۔

دراصل بارش والی رات بہرمن دیوار پر بیل اور پتا بناتا رہا۔ وہی پتا جو اتنے طوفانوں میں بھی نہیں گرا اور جسے دیکھ کر تمہارے اندر زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ یہ پتا تو بہرمن کا شاہکار ہے۔ ایک جان بچانے کے لیے بہرمن نے اپنی زندگی کا نذرانہ پیش کر دیا۔ اسپتال میں دو دِن بہرمن اپنی بیماری سے لڑتا رہا اور آخر کار دنیائے فانی سے رُخصت ہوگیا۔ بہرمن جیسے لوگوں کے لیے کہا گیا ہے کہ

کون کہتا ہے موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا

ہمیں کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ انسانوں کے بلند حوصلے اور مضبوط ارادے ہی اُنھیں منزلِ مقصود تک پہنچاتے ہیں ورنہ راہی راستوں میں ہی بھٹک جاتے ہیں۔ منزل کے تعین کے ساتھ ساتھ دشوار گزار راستوں پر چلنے کا عزم ہی کامیابی و کامرانی کی ضمانت ہے۔“

مجھے ایک چھوٹا سا واقعہ یاد آرہا ہے آپ سب کو بھی سنانا چاہوں گی۔ ایک بار دو بیج زمین میں ایک ساتھ بوئے گئے۔ ایک بیج دوسرے سے کہنے لگا کہ میں ابھی زمین سے باہر نہیں نکلنا چاہتا، باہر موسموں کی شدت برداشت کرنا پڑے گی۔

دوسرے بیج نے جواب دیا کہ موسموں کی شدت برداشت کرنے سے ہی میں بڑھ پاؤں گا۔ مجھ میں آگے بڑھنے کی لگن ہے۔ میں ہر طرح کی مشکلات برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں۔ میں ضرور باہر نکلوں گا۔

بس بیج کا پختہ عزم تھا کہ ایک دو روز ہی میں اُس کی ننھی سی کونپل پھوٹ پڑی۔ دوسرا بیج ابھی مٹی میں ہی دبا ہوا تھا کہ پہلے والے کے پتے بھی نکلنا شروع ہوگئے۔ کچھ مرغیاں کھیتوں میں دانہ چگنے میں مصروف تھیں۔ ایک مُرغی پنجوں سے زمین کھود رہی تھی کہ اُسے مٹی میں دبا وہ بیج مل گیا۔ مُرغی نے اُسے فوراً کھالیا۔

جو اپنے اندر حوصلہ اور اعتماد نہیں رکھتے وہ اِس بیج کی طرح ایک روز ختم ہوجاتے ہیں یا کر دیے جاتے ہیں۔ یقیناً دوسرے بیج کی کونپل ایک دن تناور درخت بن جائے گی۔

شمارۂ مارچ میں قارئین کے لیے تحفۂ خاص

اعضائے جسمانی کے درست کام کرنے اور بیماریوں کی مدافعت کا فریضہ قدرت نے ذہن کو عطا کر رکھا ہے۔ انسانی ذہن میں خلل اور نقص کی صورت میں انسان معاشرے سے کٹ کر رہ جاتا ہے۔

☆ نفسیاتی عارضہ کیا ہے؟
☆ اس کی وجوہات کیا ہیں؟
☆ پاکستان میں نفسیاتی بیماریوں کی شرح و وجوہ؟
☆ ان کا علاج اور تدارک کیسے ممکن ہے؟

”فاؤنٹین ہاؤس“

ڈاکٹر سید عمران مُرتضیٰ کے ساتھ تفصیلی گفتگو پر مبنی خصوصی رپورٹ

www.urdugem.com

راؤ محمد شاہد اقبال

۱۰ بہترین سافٹ ویئرز

دنیائے کمپیوٹر میں روزمرّہ کا کام سہل بنانے والے مفید پروگراموں کا ذکرِ خیر

تیزی سے بدلتی دنیا میں کمپیوٹر کے میدان میں جو نت نئی تبدیلیاں آتی رہیں، وہ بنی نوع انسان کے لیے مفید ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی حیران کن بھی ہیں۔ اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہمارے قومی شاعر، حکیم الامت علامہ اقبال نے کئی دہائیوں پہلے ہی فرمادیا تھا:

''آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں۔''

محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہوجائے گی''۔

کمپیوٹر کے میدان میں ہونے والے انکشافات و ایجادات کا جتنا عمل دخل ہماری زندگی میں آج در آیا ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ اسی بات کو محسوس کرتے ہوئے بہترین سافٹ وئیر مسیں سے انتہائی عرق ریزی سے کیا گیا چنیدہ انتخاب پیش ہے، اس اُمید کے ساتھ کہ اپنی سہولیات اور افادیت کی بنا پر یہ انتخاب آپ کی روزمرہ زندگی کو مزید سہل اور جدید خطوط پر استوار کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوگا۔ کلین ماسٹر ۶ (Clean Master 6)

ویب سائٹ:

www.cleanmasterofficial.com

فائل سائز ۲۰ : ۱ ایم بی

ہم مسلمانوں کے نزدیک صفائی نصف ایمان ہے لیکن اگر کمپیوٹر کی کارکردگی کی بات کی جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ کمپیوٹر کے لیے ''صفائی نصف رفتار ہے''۔ جو بھی استعمال کنندگان کمپیوٹر کی صفائی کا خیال رکھتے ہیں، وہ کبھی کمپیوٹر کی کارکردگی کے حوالے سے شکایت کرتے دکھائی نہیں دیتے۔ کمپیوٹر کی ہارڈ ڈسک، میموری اور رجسٹری سے غیر ضروری مواد کی صفائی کے لیے عموماً جو پروگرام استعمال کیے جاتے ہیں انہیں ''سسٹم کلینر'' کہا جاتا ہے۔

یہ سسٹم کلینر کمپیوٹر میں موجود تمام غیر ضروری مواد اور کچرا صاف کرکے کمپیوٹر کی رفتار اور کارکردگی میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔ دنیا بھر میں ''سی سی کلینر'' اس حوالے سے سب سے زیادہ استعمال ہونے والا سسٹم کلینر ہے۔ سی سی کلینر کی افادیت سے ہمیں انکار نہیں لیکن ہمارا دعویٰ ہے کہ ایک بار آپ ''کلین ماسٹر ۶'' کو اپنے کمپیوٹر میں صفائی کرنے کا موقع فراہم کریں پھر آپ بھی اسے ہماری طرح سی سی کلینر سے بہتر پائیں گے۔

''کلین ماسٹر ۶'' کی خوبیوں اور خوبصورتی کو آپ سی سی کلینر کے مقابلے میں ایک قدم آگے پائیں گے۔ ''کلین ماسٹر ۶'' کا اینڈرائڈ ورژن دنیا بھر میں انتہائی مقبول ہے۔ جسے اب تک تو ے کروڑ سے زائد بار ڈاؤن لوڈ کیا جاچکا۔ اس سے آپ سافٹ وئیر کی قابلیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ''کلین ماسٹر ۶'' کا تازہ ورژن بے شمار اضافی خوبیوں سے لیس ہے۔ یہ پروگرام آپ کے کمپیوٹر میں غیر ضروری اور خفیہ طور پر چلنے والے پروگراموں کو بھی روکتا ہے اور اگر آپ انٹرنیٹ استعمال کرتے ہیں تو اُس پر بھی بڑی گہری نظر رکھتا ہے۔

اس کی وہ اضافی خوبی جو اسے دیگر تمام سسٹم کلینرز سے ممتاز بناتی ہے وہ یہ ہے کہ دنیائے انٹرنیٹ سے ایسی کوئی چیز آپ کے کمپیوٹر میں داخل ہونے نہیں دیتا جس کی وجہ سے مشین کی کارکردگی یا رفتار میں کسی طرح کی بھی کمی آئے۔ اسے آپ بیک وقت اپنے کمپیوٹر اور اسمارٹ فون میں مفت میں ڈاؤن لوڈ کرکے انسٹال کرسکتے ہیں۔ اپنی انھی دلفریب خوبیوں کی وجہ سے اسے ۲۰۱۷ء کا بہترین ''سسٹم کلینر'' کہا جاسکتا ہے۔

ایکس این ویو۔ ایم پی (XnView MP)

ویب سائٹ :http://bit.ly/2BE45lB

فائل سائز ۵۲ : ۱ ایم بی

مسکرا مسکرا کر نہ دیکھو اسے، جان پڑ جائے گی میری تصویر میں! شاعر نے جو بات اس شعر میں کہی وہ حقیقت میں اُسی وقت ممکن ہوسکتی ہے جب آپ کی بنائی ہوئی تصویروں میں واقعی کچھ ''جان'' ہو۔ اسمارٹ فونز اور ڈیجیٹل کیمروں کی بہتات نے ہمارے لیے تصویریں بنانا تو آسان بنادیا ہے لیکن انھیں محفوظ کرنے کا مسئلہ آج بھی درپیش ہے۔ گو ایک سے بڑھ کر ایک ''امیج ویور'' پروگرام موجود ہیں۔

امیج ویور وہ پروگرام ہیں جن کے ذریعے تصاویر کو اُن کی اصل حالت اور ترتیب وار محفوظ کرکے رکھا جاتا ہے تاکہ بوقت ضرورت اپنی تصویروں کو خود بھی دیکھ لیں اور دوسروں کو بھی دکھا سکیں۔ امیج ویور کا انتخاب اتنا آسان نہیں، آپ کا غلط انتخاب آپ کی تصاویر کے معیار پر بھی اثر انداز ہوسکتا ہے۔

ان تمام باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے آپ کو ایک بہترین امیج ویور ''ایکس این ویو۔ ایم پی'' سے متعارف کروا رہے ہیں۔ یہ دوسرے تمام امیج ویوور پروگرامز کے مقابلے میں انتہائی سادہ، ہلکا اور غیر معمولی سہولیات کا حامل پروگرام ہے۔ ''ایکس این ویو۔ ایم پی'' ۵۰۰ سے زائد امیج فارمیٹ کی تصاویر دکھانے اور محفوظ رکھنے کی سہولت مہیا کرتا ہے۔ اس کے ذریعے آپ اپنی تصاویر اسکین اور پرنٹ بھی کرسکتے ہیں۔ جبکہ تصاویر کے اسکرین شاٹس مع تفصیلی معلومات جتنے اچھے اس پروگرام میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ کسی دوسرے پروگرام میں اس کا عشر عشیر بھی ممکن نہیں۔

ایک تصویر کو مختلف زاویوں سے دکھانا اس کی اضافی خوبی ہے۔ ''ایکس این ویو۔ ایم پی'' ۲۰۱۸ء میں اپنی بیسویں سالگرہ منا رہا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ میدان میں یہ نیا نہیں، آپ اس پر آنکھ بند کرکے اعتماد کرسکتے ہیں۔

اے وی جی فری بیٹا (AVG Free Beta)

ویب سائٹ : http://bit.ly/2BwQL1g

فائل سائز ۴ : ۱ ایم بی

www.urdugem.com

ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ جب گھر سے کوئی فرد کسی طویل سفر کے لیے نکلتا تھا تو اُس کے پیارے، بازو پر امام ضامن باندھ دیتے تھے تاکہ حفاظت کا کچھ بندوبست ہو سکے۔ اب نہ وہ زمانہ رہا اور نہ خیال رکھنے والے وہ خوش عقیدہ لوگ۔ لیکن سفر ہمیں درپیش ہے دنیا بھر کا یعنی انٹرنیٹ پر دنیا کے قریہ قریہ، نگر نگر کی سیر کرنے والوں کو آخر اپنی حفاظت کا کچھ تو بندوبست کرنا چاہیے کیونکہ دنیائے انٹرنیٹ پر ایک سے بڑھ کر ایک دشمن جان یعنی ہیکر موجود ہے جو ''رینسم وئیر'' وائرس کے ذریعے آپ کو کنگال اور ''بلیو وہیل گیم'' کے ذریعے آپ کی جان تک بھی لے سکتا ہے۔

مگر آپ گھبرائیں نہیں ہم آپ کو دنیائے نیٹ میں راج کرنے والے ایک ایسے اینٹی وائرس کا بتاتے ہیں جسے انسٹال کرنے کے بعد کمپیوٹر اور اسے استعمال کرنے والے آپ کے تمام پیارے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ و مامون ہو جائیں گے۔ اس اینٹی وائرس پروگرام کا نام ''اے وی جی فری بیٹا'' ہے۔ اے وی جی دنیا کی مشہور سیکورٹی سافٹ وئیر بنانے والی کمپنی ہے۔ یوں تو اس کمپنی کے بنائے گئے اور بھی بے شمار اینٹی وائرس سافٹ وئیر اپنے صارفین سے مقبولیت کی سند حاصل کر چکے لیکن ''اے وی جی فری بیٹا'' بطور خاص آن لائن ہیکر حملوں، رینسم وئیر، سپائی ویئر سے تحفظ کے لیے بنایا گیا۔

یہ استعمال میں انتہائی سادہ اور تحفظ میں بے مثال ہے۔ یہ آپ کے کمپیوٹر کو متاثرہ ای میلز، اٹیچمنٹ فائلوں، ڈاؤن لوڈ اور آلودہ ویب سائٹ سے مکمل تحفظ فراہم کرے گا۔ آزمائش شرط ہے۔

زوم پلیئر ۱۴ بیٹا (Zoom Player 14 Beta)

ویب سائٹ : http://bit.ly/2kiG7Ir

فائل سائز ۲۹ : ایم بی

کمپیوٹر پر فلمیں، کارٹون، ڈرامے یا گانے دیکھنے یا سننے میں اُس وقت بڑی کوفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے جب کچھ میڈیا فائلیں آپ کے انسٹال کیے ہوئے میڈیا پلیئر پر چلنے سے انکار کر دیتی ہیں۔ پھر آپ کو اپنے کمپیوٹر میں ایک سے زائد میڈیا پلیئر انسٹال کر کے رکھنا پڑتے ہیں۔ یوں پھر کسی پلیئر پر آپ ایم پی تھری ویڈیو دیکھتے ہیں، کسی پر ڈی وی ڈی فلمیں دیکھی جاتی ہیں، کسی پر ایم پی فور کارٹون اور کسی پر ایمپیگ ڈرامے چلاتے ہیں۔

آپ سوچتے ہوں گے کہ کیا کوئی ایسا ویڈیو پلیئر آپ کو مل سکتا ہے جو ہر قسم کی ویڈیو فائلیں چلا سکے۔ آپ کا انتظار ختم ہوا ''زوم پلیئر ۱۴ بیٹا'' ایک ایسا ہی ویڈیو پلیئر ہے جو ہر قسم کی ویڈیو اور آڈیو فائلیں چلانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

''زوم پلیئر ۱۴ بیٹا'' کے ذریعے آپ اپنی ویڈیو فائلوں کو آرگنائز اور بک مارک بھی کر سکتے ہیں۔ جبکہ یہ آپ کو ویڈیو دیکھنے کے ایک سے زائد مختلف موڈ کی سہولت بھی فراہم کرتا ہے یعنی اب آپ کی مرضی ہے کہ آپ اپنے پسندیدہ ڈرامے ''تھیٹر موڈ'' میں دیکھنا چاہتے ہیں یا ''ہوم موڈ'' میں۔ اس ویڈیو پلیئر کے ذریعے آپ اپنی ویڈیو کی آواز اور ڈسپلے میں حسب منشا تبدیلی بھی کر سکتے ہیں۔ ہے نا یہ ایک ''آل اِن ون'' ویڈیو پلیئر!

ٹیم ویور ۱۳ (Team Viewer 13)

ویب سائٹ : http://bit.ly/2zZ76j0

فائل سائز ۱۸ : ایم بی

''ٹیم ویور ۱۳'' ایک سادہ، تیز اور محفوظ ترین کمپیوٹر کنٹرول کرنے والا سافٹ وئیر ہے۔ اس کی مدد سے آپ دنیا بھر میں موجود کسی بھی کمپیوٹر کو چند سیکنڈز میں اپنے کمپیوٹر کے ساتھ منسلک کر کے بالکل ویسے ہی اُس میں بھی تمام اُمور انجام دے سکتے ہیں جیسے آپ اپنے کمپیوٹر میں انجام دیتے ہیں۔

یہ سافٹ وئیر اُس وقت بہت زیادہ فائدہ مند ہو سکتا ہے کہ آپ اپنے دفتر میں موجود ہیں اور آپ کے گھر میں رکھا ہوا کمپیوٹر خراب ہو گیا لیکن گھر میں موجود کسی شخص کو کمپیوٹر کی اُن مبادیات کا علم نہیں جن کی مدد سے وہ کمپیوٹر ٹھیک کر کے اپنا ضروری کام کر سکے۔ اس سافٹ وئیر کی مدد سے آپ اپنے اُس کمپیوٹر سے منسلک ہو کر نہ صرف اُسے درست کر سکتے ہیں بلکہ اگر چاہیں تو اُس کمپیوٹر میں موجود فائلوں کو اپنے آفس والے کمپیوٹر میں کاپی بھی کر سکتے ہیں۔

''ٹیم ویور ۱۳'' آپ کو کسی بھی کمپیوٹر پر مکمل کنٹرول فراہم کرتا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو اس کے ذریعے آپ اپنے کمپیوٹر کو کسی دوسرے شخص کے کنٹرول میں بھی دے سکتے ہیں۔ بس ایک بات کا خیال رہے کہ کسی انجان شخص کو ''ٹیم ویور ۱۳'' کے ذریعے اپنے کمپیوٹر پر کنٹرول کی دعوت مت دیں کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ آپ کے کمپیوٹر کو غلط استعمال میں لائے اور آپ کو خبر بھی نہ ہو۔ اس لیے جس شخص پر آپ کو مکمل اعتماد اور بھروسا ہو، صرف اُسے ہی ''ٹیم ویور ۱۳'' میں اپنے کمپیوٹر کا بنایا گیا یوزر نیم اور پاس ورڈ دیں۔

براو ویب براؤزر (Brave Web Browser)

ویب سائٹ : www.brave.com

فائل سائز ۱۱۵ : ایم بی

بلاشبہ دنیا بھر میں زیادہ تر افراد انٹرنیٹ استعمال کرنے کے لیے گوگل کا ''کروم براؤزر'' یا پھر موزیلا کا مشہور زمانہ ''فائر فاکس ویب براؤزر'' استعمال کرتے ہیں۔ لیکن ۲۰۱۷ء میں ایک ویب براؤزر اور بھی دنیائے انٹرنیٹ کے فلک پر ستارا بن کر اُبھرا جس نے اپنی خوبیوں اور خوبصورتی سے بڑے بڑے براؤزر کو مات دے دی ہے۔ اس براؤزر کا نام براوٗ ہے۔

''براوٗ'' نامی یہ ویب براؤزر موزیلا فائر فاکس کے سابق سی ای او، برینڈن ایرچ (Brendan Eich) کے ذہن رسا کی تخلیق ہے۔ برینڈن ایرچ نے موزیلا سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد ایک ایسا ویب براؤزر بنانے کا تہیہ کیا جو اشتہارات سے پاک اور ہیکرز کی دسترس سے مکمل محفوظ ہو اور جو اپنی خدمات فراہم کرنے کی بنا پر موزیلا فائر فاکس کو بھی پچھاڑ سکے۔

آخر اُس کی یہ محنت رنگ لائی۔ اُس نے ''براوٗ'' کی صورت میں ایک انتہائی خوبصورت اور بے پناہ خوبیوں سے مزین ویب براؤزر صارفین کے استعمال کے لیے پیش کر دیا۔ ''براوٗ'' نے ۲۰۱۷ء میں اپنے استعمال کنندگان سے خوب داد سمیٹی۔ ماہرین اسے مستقبل کا ویب براؤزر بھی قرار دے رہے ہیں۔ اگر آپ نے ابھی تک اسے استعمال نہیں کیا تو کوئی بات نہیں، ابھی دیر نہیں ہوئی، جلدی اسے انسٹال کریں اور ایک محفوظ ترین ویب براؤزر کے مزے اُڑائیں۔

فاکس اِٹ ریڈر ۹ (FoxIt Reader 9)

ویب سائیٹ :http://bit.ly/2khz9Dy

فائل سائز ۵۱ : ایم بی

انٹرنیٹ پر کتابیں ہوں یا رسالے زیادہ تر پی ڈی ایف فارمیٹ میں دستیاب ہوتے ہیں۔ انھیں پڑھنے کے لیے پی ڈی ایف ریڈر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس وقت دنیا بھر میں زیادہ تر افراد ''ایڈوب پی ڈی ایف ریڈر'' ہی استعمال کرتے ہیں لیکن اس پروگرام میں سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ یہ ایک بھاری بھرکم پروگرام ہے۔ یہ آپ کے کمپیوٹر کو سست بھی کر دیتا ہے جس کی وجہ سے کمپیوٹر پر کتابیں اور رسائل کا مطالعہ کرنے میں آپ کو مسائل کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔

اس کے مقابلے میں ''فاکس اِٹ ریڈر ۹'' انتہائی ہلکا پھلکا، استعمال میں آسان ہونے کے ساتھ ساتھ اور بھی بے شمار اضافی خوبیوں کا حامل پروگرام ہے۔ اس کے ذریعے آپ پی ڈی ایف فائل میں من چاہا ردوبدل بھی کر سکتے ہیں جبکہ بک مارک اور ٹیکسٹ ہائی لائٹ کرنے کی اضافی سہولت اس میں مزید چار چاند لگا دیتی ہے۔ اس لیے آپ ایک بار اس میں کتابیں پڑھ کر دیکھیں۔ آپ بھی اس کی سہل پسندی کے قائل ہو جائیں گے۔

ایف بیک اَپ ۷ (FBackup 7)

www. urdugem. com

ویب سائٹ www.fbackup.com :

فائل سائز ۷۹ :، ایم بی

کمپیوٹر استعمال کرنے والے تمام افراد اپنے اہم ترین ڈیٹا کو محفوظ کرنے کی افادیت سے بخوبی آگاہ ہوتے ہیں۔ اس کے لیے وہ مختلف قسم کے ڈیٹا بیک اَپ پروگرام اپنے کمپیوٹر میں پہلے ہی سے انسٹال کر کے رکھتے ہیں تاکہ وقتاً فوقتاً اپنے اہم ترین ڈیٹا کا بیک اَپ بناتے رہیں۔ لیکن اگر آپ کو اس کام کے لیے ایک انتہائی طاقت ور پروگرام کی ضرورت ہے تو اس کے حصول میں ہم آپ کی مدد کر سکتے ہیں۔ گھبرائیے نہیں، یہ پروگرام ہم آپ کو قیمتاً نہیں بلکہ بالکل مفت میں دیں گے۔

جی ہاں! ''ایف بیک اَپ ۷'' مفت میں دستیاب ڈیٹا بیک اَپ بنانے کا سب سے طاقتور اور ملٹی پرپز پروگرام ہے۔ ''ایف بیک اَپ ۷'' سے آپ اپنے اہم ترین ڈیٹا بیک صرف اپنی ہارڈ ڈسک اور یو ایس بی پر ہی نہیں بنا سکتے بلکہ یہ آپ کو دنیا کی تقریباً ہر ایک معروف کلاؤڈ اسٹوریج سروس پر بھی ڈیٹا محفوظ کرنے کی سہولت فراہم کرتا ہے۔ ڈیٹا کا بیک اَپ بنانے میں اس پروگرام کی رفتار بے مثال ہے۔ اگر آپ اسے ایک بار استعمال کریں گے تو آپ بھی ہماری طرح اس کے گرویدہ ہو جائیں گے۔

واٹس ایپ ڈیسک ٹاپ (WhatsApp Desktop)

ویب سائٹ http://bit.ly/2At8Pu3 :

فائل سائز ۶۴ :، ایم بی

کیا آپ اپنے اسمارٹ فون پر واٹس ایپ استعمال کرتے ہیں؟ ہم جانتے ہیں کہ آپ کا جواب ہاں! میں ہی ہوگا۔ لیکن کیا آپ اپنے واٹس ایپ اکاؤنٹ کو اپنے ڈیسک ٹاپ کمپیوٹر پر بھی استعمال کرتے ہیں؟ اس کا جواب زیادہ تر قارئین انکار میں ہی دیں گے۔ حالانکہ آپ اپنا واٹس اَپ اکاؤنٹ کمپیوٹر پر بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ جی ہاں! اب یہ ممکن ہے۔

آپ دیے گئے آفیشل واٹس ایپ ویب سائٹ لنک سے واٹس اَپ کا ''پی سی ورژن'' ڈاؤن لوڈ کر کے اپنے کمپیوٹر میں انسٹال کر لیں۔ انسٹال ہونے کے بعد آپ کے کمپیوٹر اسکرین پر وہ آپ سے ''کیو آر'' اسکین کی درخواست کرے گا۔ اب اپنے اسمارٹ فون کی واٹس ایپ اکاؤنٹس کی سیٹنگ میں جا کر ''کیو آر'' اپنے کمپیوٹر اسکرین سے اسکین کر لیں۔ چند سیکنڈ میں آپ کا واٹس ایپ اکاؤنٹ آپ کی کمپیوٹر اسکرین پر بھی نمودار ہو جائے گا۔ لیجیے! اب آپ اپنے کمپیوٹر پر بھی واٹس ایپ بالکل ویسے ہی استعمال کر سکتے ہیں جیسے آپ اپنے اسمارٹ فون سے کرتے ہیں۔

ایچ ڈی ویڈیو کنورٹر فیکٹری ۱۱ (HD Video Converter Factory 11)

ویب سائٹ http://bit.ly/2APMIBd :

فائل سائز ۴۷ :، ایم بی

ویڈیو کنورٹرز کے میدان میں دنیائے انٹرنیٹ میں اس سافٹ ویئر کا دور دور تک کوئی بھی مدمقابل نہیں۔ یہ بات ہم نہیں کہتے بلکہ دنیا بھر میں مفت سافٹ ویئر فراہم کرنے والی پانچ سب سے بڑی کمپنیاں کہتی ہیں۔ ماہرین کا خیال ہے ''ایچ ڈی ویڈیو کنورٹر فیکٹری ۱۱'' جو کچھ اپنے صارفین کو مفت میں فراہم کرتا ہے، بڑی بڑی ویڈیو کنورٹر سافٹ ویئر کمپنیاں پیسے لے کر بھی وہ سہولیات یا خدمات اپنے استعمال کنندگان کو فراہم نہیں کرتیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ سافٹ ویئر ۲۰۱۷ء سے پہلے اپنی خدمات منہ مانگی رقم کے عوض ہی فراہم کرتا تھا لیکن نہ جانے اس کمپنی کی انتظامیہ کے من میں کیا سمائی کہ انھوں نے گزشتہ سال اس سافٹ ویئر کو بالکل مفت کر دیا۔ تفصیل میں جائے بغیر ہم تو آپ کو صرف یہ ہی مشورہ دیں گے کہ آپ جلد از جلد اس سافٹ ویئر کو ڈاؤن لوڈ کر کے اپنے کمپیوٹر میں انسٹال کر لیں۔ اللہ جانے اس کمپنی کی انتظامیہ کب دوبارہ اس بے مثال سافٹ ویئر کو قیمتاً فروخت کرنا شروع کر دے۔ ◆◆◆

تم رب کی کس کس نعمت کو...

محمد ذکی احمد

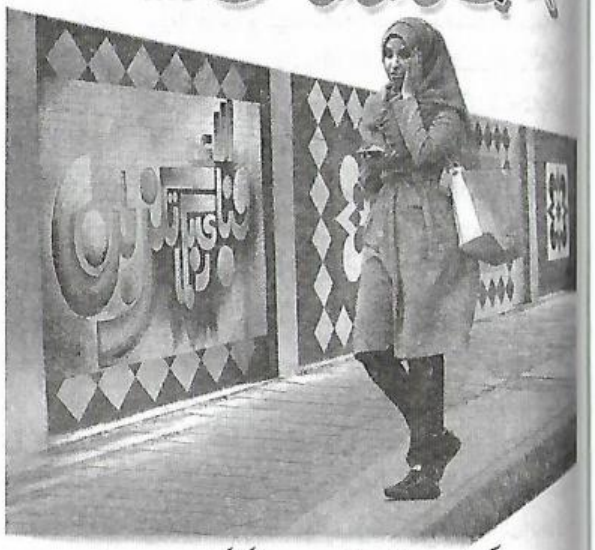

کفر پہ آمادہ ایک نادان لڑکی کی روح پرور داستان

اس کے قدم تیزی سے بس سٹاپ کی طرف اُٹھ رہے تھے۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ پھر اس کی اپنی امی سے خرچ پر بحث ہوئی تھی۔ اس بار بھی مہینہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا اور تنخواہ ختم ہو چکی تھی۔ امی مزید رقم کا مطالبہ کر رہی تھیں۔ آج سے پانچ سال پہلے ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ ان کے لیے نوالے تنگ نہ تھے۔ اس کے ابو ایک بڑی سیمنٹ فیکٹری میں کام کرتے تھے اور ایک اچھے عہدے پر فائض تھے۔

زندگی اچھی گزر رہی تھی۔ اس نے انگریزی میں ایم۔اے کیا تھا۔ کئی انگلش کورس بھی کر چکی تھی۔ ایک رات جب اس کے والد فیکٹری سے واپس آ رہے تھے ان کی گاڑی تیز رفتار ٹرک سے ٹکرا گئی۔ ٹرک والا خود تو ٹکر مار کر بھاگ گیا لیکن یہ ٹکراؤ اس کے والد سے ان کی ٹانگیں چھین لے گیا۔ والد کے علاج پر بہت خرچ آیا۔ ڈاکٹروں نے بہت مشکل سے جان بچائی لیکن ان کی ٹانگیں نہ بچا سکے۔

اس کے بعد سے ان کے حالات روز بروز خراب ہونے لگے۔ جو جمع پونجی تھی وہ علاج میں خرچ ہو گئی۔ رشتے داروں نے جھوٹی ہمدردیاں دکھائیں۔ فیکٹری مالکان نے زبانی ہی ہمدردی کا اظہار کیا لیکن عملی طور پر کسی نے کوئی سہارا نہ دیا۔ اسے اپنا مستقبل تاریک، بہت تاریک نظر آنے لگا۔ اس نے کافی ہاتھ پیر مارے تو اسے ایک دور دراز کے علاقے میں نیم سرکاری کالج میں بحیثیت انگلش لیکچرار نوکری مل گئی۔ روزانہ اتنی دور جانا مشکل تھا لیکن اُسے اپنے خاندان کی بقاء کے لیے یہ کٹھن مرحلہ اپنانا پڑا۔

اس کے خیالوں کا سلسلہ تب ٹوٹا جب وہ بس اسٹیشن پہنچ گئی۔ بس میں بیٹھ کر وہ پھر سے خیالوں میں کھو گئی۔ اچانک اس کی نظر ساتھ بیٹھی لڑکی کی گود میں رکھی کتاب پر پڑی۔ اس پر بہت جگمگاتے الفاظ میں لکھا تھا۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ○

ترجمہ: تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔

اس کی نظر ان الفاظ پر پڑی تو دل میں تنفر کی لہر سی اُٹھی۔

www.urdudigest.com

اپنی ساری مشکلات کا خیال اس کے ذہن میں شعلے کی طرح بھڑکا۔ اس نے انتہائی کفرانہ طریقے سے سوچا، آخر کیا ضرورت تھی اللہ کو اس کی ہستی کھیلتی زندگی اجاڑنے کی۔؟ آخر اللہ نے انھیں کون سی نعمت دی ہے۔ ”مشکلات بھری زندگی میرا مقدر بن چکی“۔ کیوں اللہ نے انھیں ان مشکل حالات سے دوچار کردیا ہے۔ الغرض اس نے اپنی ساری پریشانیوں کا ذمہ دار نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کو ٹھہرادیا۔

اس کا ذہن کفر کی حد کو چھو رہا تھا۔ وہ اپنے دین ایمان سے دور ہو رہی تھی۔ بس اس کے اسٹاپ پر پہنچ چکی تھی۔ سوگوار موڈ کے ساتھ وہ نیچے اتری اور سڑک پر کھڑی ہوگئی۔ اس نے سڑک پار کرنے کے لیے پیر آگے بڑھایا لیکن فوراً پیچھے کھڑی لڑکی نے اسے کھینچ لیا۔ وہ بے دھیانی میں اپنے سامنے آتی ہوئی گاڑی کو نہ دیکھ سکی تھی۔ اگر اس کی گاڑی سے ٹکر ہو جاتی تو اسے شدید چوٹیں آتیں لیکن وہ بچ گئی۔ اس نے دھیان تو نہیں دیا لیکن سڑک کے ساتھ بنی ہوئی دیوار پر بڑے خوبصورت انداز میں لکھے گئے الفاظ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ○ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اپنے بندے سے پیار کا اظہار زور و شور سے کر رہے تھے۔

کالج پہنچ کر اس نے دن کا آغاز معمول کے مطابق کیا۔ اس کا پہلا پریڈ فارغ ہوتا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کس طرح وہ امی کے لیے رقم کا بندوبست کرے۔ اس نے اپنے بھائیوں کی رواں مہینے والی فیس تک ادا نہ کی تھی۔ اسی اثنا میں اس کی سب سے اچھی دوست مومنہ آئی اور کہنے لگی ”بھئی کن خیالوں میں گم ہو؟ آج تو ہم سے ملی بھی نہیں۔

”مومنہ اس کی سب سے اچھی دوست تھی جس سے وہ ہر بات شیئر کرلیتی تھی سو اس نے مومنہ کو سب کچھ بتادیا۔ مومنہ نے اسے کہا ”شمائلہ! تم بالکل فکر نہ کرو۔ مجھ سے دو ہزار روپے ادھار لے لو۔ نیا مہینہ آیا تو واپس کردینا۔ شمائلہ کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں اور اس نے مومنہ کو گلے لگالیا۔

واقعی دوستی کا کوئی مول نہیں۔

کالج کا یہ دِن اس کے لیے بہت مصروف گزرا۔ کالج کے سربراہ کا ارادہ تھا کہ کچھ اساتذہ کو خصوصی تربیت کے لیے لاہور جانا چاہیے تاکہ وہ عمر رسیدہ اساتذہ کے تجربے اور طریقہ تدریس سے فائدہ اٹھا کر اپنے کالج کے معیار تعلیم کو بلند کرسکیں۔ ان میں مومنہ اور اس کی دوست شمائلہ کا نام بھی شامل تھا۔

کالج سے واپسی پر وہ پیدل بس اسٹاپ کی طرف چل پڑی۔ اُسے اِس علاقے میں پیدل جانا سخت ناپسند تھا کیونکہ اس سے بہت خطرناک باتیں منسوب تھیں۔ ابھی وہ ایک موڑ مڑ ہی رہی تھی کہ سامنے ایک آدمی آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں چاقو تھا۔ اس نے چاقو لہراتے ہوئے کہا۔ بی بی! ”تمہارے پاس جو کچھ ہے وہ مجھے دے دو ورنہ تمہارے ساتھ کچھ اچھا نہ ہوگا“۔

شمائلہ بُری طرح گھبرا گئی کیوں کہ وہ کسی صورت اس ڈاکو کو وہ دو ہزار روپے نہیں دے سکتی تھی۔ اُسے اِن ادھار کے پیسوں سے بھائیوں کی فیس ادا کرنی تھی اور ابھی تو مہینے کے دِن بھی باقی تھے۔ لہٰذا وہ ایک دم بھاگ کھڑی ہوئی۔ ڈاکو بھی اس کے پیچھے لپکا۔ اچانک اس کے سامنے ایک گلی آئی۔ وہ فوراً اس گلی میں گھس گئی لیکن یہ اس کی غلطی تھی۔ گلی آگے سے بند کچھ گھروں کا پچھلا حصہ تھی۔ اب اسے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔

اچانک ایک فوجی وین اس گلی میں داخل ہوئی۔ ڈاکو اُسے دیکھتے ہی پریشان ہو کر بھاگا لیکن فوجیوں نے اسے جا لیا۔ وہ فوراً سے پیشتر سمجھ گئے کہ وہ نہتی لڑکی کو لوٹنا چاہتا تھا۔ اس نے فوجیوں کا شکریہ ادا کیا۔ فوجی وین نے اسے بس اسٹاپ تک چھوڑ دیا۔ اس نے دھیان تو نہیں دیا لیکن ایک بس پر کیا ہی خوبصورت الفاظ درج تھے۔:

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ○

شمائلہ کی لاہور جانے کی تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ اسے گھومنے پھرنے کا شوق تو نہیں تھا لیکن اس کا دِل جوش سے بھرا ہوا تھا۔ اپنے والد کے ساتھ ہونے والے حادثے کے بعد یہ اس کا پہلا دورہ تھا۔ وہ مقررہ وقت پر اسٹیشن پہنچ گئی۔ مومنہ اور باقی دو ٹیچرز بھی پہنچ چکی تھیں۔ ریل میں ان کا سفر بہت اچھا گزرا۔

تربیت کا سیشن چودہ دِن پر محیط تھا۔ یہ چودہ دِن اس کے بہت مزے میں گزرے۔ کالج کی طرف سے انھیں مختلف جگہوں کی سیر کروائی گئی۔ ایک دن وہ تنہا ٹیکسی میں واپسی آ رہی تھی کیونکہ اس کی طبیعت خراب تھی۔ اچانک اس کا دِل دھک سے رہ گیا۔ دائیں سمت سے ایک آئل ٹینکر تیزی سے ان کی طرف آرہا تھا۔ لیکن ٹیکسی ڈرائیور اپنی ہی دھن میں ٹیکسی دائیں طرف لے جاتا رہا۔ اچانک ٹیکسی ڈرائیور کی نظر ہارن بجاتے آئل ٹینکر پر پڑی اور اس نے ایک دم بریک لگادیے۔ اگر اسے ایک لمحے کی دیر ہو جاتی تو خوفناک حادثہ وقوع پزیر ہو چکا ہوتا۔ اس کا دھیان کسی اور طرف تھا لیکن قریب ہی واقع ایک مسجد میں مولوی صاحب لوگوں کو فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ○ جیسی عظیم اور خوبصورت آیت کا مطلب سمجھا رہے تھے۔ بہرحال اس نے ہولناک واقعے کا ذکر اپنی دوستوں سے کیا اور سب نے اسے بچ جانے پر مبارکباد دی۔

آج پروگرام کا آخری دِن تھا۔ کورس مکمل ہو چکا تھا اور انھیں سرٹیفکیٹ وغیرہ دیے جا چکے تھے۔ آج ان کا پروگرام واپادر بار جانے کا تھا۔ اُسے مذہب سے کوئی لگاؤ تو نہیں تھا لیکن وہ دربار میں ہونے والے ایک درس کے پروگرام میں بیٹھ گئی۔ اس درس نے اس کے دِل کی دنیا ہی بدل دی۔ اس کے اللہ سے سارے گِلے شکوے ختم ہو گئے۔ اُسے احساس ہوا کہ اگر اللہ نے اسے مشکلوں میں ڈالا تو اس نے بھی صبر شکر سے مشکلات برداشت نہیں کیں۔

وہ جانتی تھی کہ نماز پڑھنا، باپردہ رہنا عورت کے لیے ضروری ہے۔ جھوٹ بولنا، گانے سننا، غیبت کرنا اور فلمیں دیکھنا یہ سب اسلام میں منع ہیں لیکن اس نے اِن چیزوں سے پرہیز نہیں کیا۔ اس کے ابّا کی ٹانگیں چلی گئیں۔ ان کے لیے حالات مشکل ہو گئے۔ اللہ چاہتا تو اس کے ابّو کی جان بھی جا سکتی تھی۔ اُس کو نوکری نہ ملتی تو ان کے لیے دو وقت کی روٹی بھی مشکل ہو جاتی۔ اللہ نے اس کو کتنے مشکل حالات میں بھی بچالیا، لیکن کیا اس نے اللہ کا شکر ادا کیا؟

آخر وہ لوگ بھی تو ہیں جن کے پاس رہنے کو مکان نہیں، کھانے کو روٹی نہیں۔ پہننے کو پہناوا نہیں لیکن اللہ نے اسے ہر نعمت سے نوازا۔ حادثے سے پہلے وہ لوگ بہترین پُرآسائش زندگی گزار رہے تھے۔ اللہ نے ہر موڑ پر اس کی مدد کی۔ اُسے شدید چوٹوں سے بچایا، لٹنے سے بچایا۔ اس کو یقینی موت سے بچالیا۔ کیا یہ سب اُس کی نعمتیں نہیں؟ کیا یہ اللہ کا پیار نہیں کہ وہ اپنے نافرمان بندے کو بھی اتنا نواز رہا ہے۔

انسان پر جب آزمائش آتی ہے تو وہ اللہ سے گلے شکوے کرنے لگتا ہے کہ اس کا حق ادا نہیں کیا گیا۔ لیکن کیا انسان نے بھی سوچا کہ آیا وہ بھی حقوق الٰہی ادا کر رہا ہے؟ اگر انسان کو کوئی مشکل پیش آتی ہے تو وہ یہ سوچ کر صبر کرلے کہ اللہ نے اتنی نعمتیں مجھے دی ہیں۔ اب اس مشکل کو بھی قبول کرلینا چاہیے۔ شاید یہ مشکل میرے لیے گناہوں کا کفارہ بن جائے۔

آج اس کا دِل روشن ہو چکا تھا۔ اُس کے دِل کی آنکھیں کھل چکی تھیں۔ اس کے دِل میں نور کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ اِرد گرد کی ہر چیز اپنے رب سے بندے کے تعلق اور پیار کا اظہار کر رہی تھی۔ آج اس کا ایمان ایک بات پر پختہ ہو گیا تھا اور وہ یہ تھی:

”پس تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔“

www.urdugem.com

حکیم محمود احمد برکاتی

سبز سونا

معدنیات اور حیاتین سے بھرپور ایک قدرتی نعمت

قدرت نے ہمیں دو نہایت قیمتی سبزی پھل خوب عطا کیے ہیں۔ ایک کینو، دوسرا آم۔ اسی طرح سبزیوں میں سب سے سستا اور مفید سبز سونا یعنی پالک بھی سال بھر خوب فراہم ہوتا ہے، لیکن ہم اس کی توانائی بخش خاصیت کے باوجود اسے بہت کم استعمال کرتے ہیں۔ پالک شوق سے کھائی جاتی تو خواتین اور نوعمروں کے چہرے زرد نہ رہتے۔ اس کے مفید اجزا سے چہرہ گل رنگ بن جاتا ہے۔

یہ قدرت کی طرف سے ایک تحفہ ہے جس میں بے شمار غذائی اجزا موجود ہیں۔ اس میں وٹامن کے، وٹامن اے، میگنیشیم، فولیٹ، بینگنیز، آہن، کیلشیم، پوٹاشیم، وٹامن سی، وٹامن بی ۲ اور وٹامن بی موجود ہے۔ علاوہ ازیں یہ سبزی پروٹین، فاسفورس، وٹامن ای، جست، ریشہ اور تانبا کا ایک ذریعہ بھی ہے۔

پالک ایسی سبزی ہے جو ہر موسم میں مل جاتی ہے۔ اسے سلاد میں کچا بھی کھایا جاسکتا ہے۔ اسے پکا کر بھی کھایا جاتا ہے یا اسے کسی اور غذا کے ساتھ ملا کر کھایا جاسکتا ہے۔ ہمارے ہاں پالک انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔ اسے "مرغ" کے گوشت، آلو کے ٹکڑوں، دال کے اندر اور پنیر کے ساتھ بھی پکایا جاتا ہے۔

پالک دنیا میں کثرت سے استعمال کی جانے والی ایک خوش نما ہرے پتوں والی سبزی ہے جو بے شمار وٹامنز اور دیگر معدنیات سے بھرپور ہوتی ہے۔ گاجر اور بند گوبھی کے مقابلے پالک میں فولاد (آئرن) دگنی مقدار میں پایا جاتا ہے۔ یہ دوسری سبزیوں سے زیادہ زود ہضم ہے۔ یہ معدے کی جلن کو دور کرتی ہے۔ پالک پیشاب آور سبزی ہے۔ خشکی اور گرمی کے شکار لوگوں کے لیے پالک کا استعمال بے حد مفید ہوتا ہے۔

کچی پالک کا رس انسانی صحت کے لیے زیادہ مفید ہے، کیونکہ پالک کو پکانے سے اس میں موجود بہت سے اجزا ضائع ہوجاتے ہیں۔ روزانہ ایک گلاس پالک کا جوس پینے سے انسان کو جسمانی صحت کے حوالے سے کئی فوائد حاصل ہوسکتے ہیں، بشرطیکہ یہ نامیاتی طرز کاشت کے ذریعے حاصل کی جانے والی پالک ہو۔

ہم لوگ اس کا استعمال کم کرتے ہیں، شاید اس لیے اسے صاف کرنے میں خاصی دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں پالک کے بارے میں عام لوگوں کے ذہنوں میں کچھ غلط عقائد نے جنم لے لیا ہے۔ مثلاً پیشاب خراب ہے تو پالک نہیں کھا سکتے، معدہ میں کوئی پرابلم ہے تو پالک کھانا منع ہے، گردوں کی کوئی بیماری ہے تو پالک چکھ نہیں سکتے۔ نقرس (گاؤٹ)، تھائرائیڈ اور گال بلیڈر کی بیماریوں میں سبزی کھانا منع ہے۔ ان خرافات کی وجہ سے بعض لوگ پالک جیسی بے حد مفید سبزی کھانے سے "پرہیز" کرتے ہیں۔

پالک چھوت کے امراض کے ذریعے پھیلنے والے اور زہریلے جراثیم سے پیدا ہونے والی بیماریوں سے بچاتی ہے۔ پالک میں پایا جانے والا وٹامن اے میوکس ممبرین کی حفاظت کرتا ہے۔ اس میں موجود غذائی اجزا کی خاصی مقدار خون کے سرخ خلیات بننے میں مدد دیتی ہے، یعنی یہ خون پیدا کرنے والی سبزی ہے جس کے باقاعدہ استعمال سے انسان خون کی کمی سے پیدا شدہ بیماریوں میں مبتلا نہیں ہوتا۔

اس میں موجود آئرن سے انسان جوڑوں کے درد سے مکمل سکون حاصل کرتا ہے۔ پالک آپ کے جسم کے ٹشوز (بافتوں) کو صاف کرتی اور خون میں شکر کی سطح کو برقرار رکھنے میں مدد دیتی ہے۔ پالک وٹامن سی سے بھرپور سبزی ہے۔ اس سبزی میں موجود فولک ایسڈ اور اینٹی آکسیڈینٹس خون کے پلازما میں پائے جانے والے Amino Acid کو متوازن کرتا ہے۔ (خون میں اس جزو کے بڑھ جانے سے دل کے دورے کے امکانات بڑھ سکتے ہیں)۔ پالک میں موجود وٹامن اے اور کروٹونائڈز بینائی سے متعلق کئی مسائل جیسے کہ شب کوری (رات کے وقت نظر نہ آنے) کے تدارک میں مدد دیتا ہے۔

پالک میں فائبر بھی پایا جاتا ہے، اس لیے اس کا مسلسل استعمال نظام ہضم کے مسائل مثلاً قولنج کا ورم، السر، ہاضمے کی خرابی اور قبض دور کرنے میں مدد دیتا ہے، ہڈیوں کے بھربھرے پن کی شکایت دور کرنے کے لیے پالک کھانا مفید ہے۔ اس میں وٹامن کے، کیلشیم کو ضائع نہیں ہونے دیتا۔ اس سے انسان کی ہڈیاں صحت مند اور مضبوط رہتی ہیں۔ یہ بلڈ پریشر میں بھی مفید ثابت ہوتا ہے۔ غذائیت سے بھرپور یہ سبزی ماں بننے والی خواتین کے لیے بے حد مفید ہے۔

ایک پیالی پالک میں روزانہ درکار ۲۰ فیصد غذائی ریشہ موجود ہوتا ہے۔ جو نظام ہضم کا دوست ہے، قبض سے نجات دلاتا، خون میں شوگر کی سطح کو اعتدال میں رکھتا اور زیادہ کھانے سے روکتا ہے۔ (اینٹی آکسیڈنٹ) وٹامن سی، وٹامن ای، بینا کروٹین کی بیماری اور سٹیو پوروسس اور ہائی بلڈ پریشر سے بچانے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔

پالک میں موجود بیٹا ٹائیٹس، ہائی بلڈ پریشر کو کم کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ مانع تکسیدی اجزا لیوٹن (LEUTIN) اور زیاز یتھن (ZIAZINTHANE) پالک کے پتوں میں وافر مقدار میں موجود ہیں۔ یہ موتیا بند سے بچانے کے علاوہ آنکھوں کی بینائی پر مثبت اثرات مرتب کرتے ہیں۔

ایک کپ پالک میں وٹامن اے کی روزانہ تعین شدہ مقدار ۳۳۷ فیصد موجود ہے۔ یہ جسم کے داخلی دروازوں جیسے کہ منہ، نظام نفس اور نظام ہاضم کے جراثیموں، وائرسوں اور کیڑوں سے بچانے میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ ایک کپ پالک وٹامن کے کے روزانہ تعین شدہ مقدار کا ۱۰۰۰ فیصد سے زیادہ حصہ فراہم کرتا ہے جو ہڈیوں کے حجم اور مضبوطی کے لیے ضروری ہے۔ وٹامن کے کا پالک میں وافر مقدار میں موجود ہونا دماغ اور اعصابی نظام کے لیے ایک انتہائی ضروری جز "صفنگولیپڈس" بنانے میں مدد کرتا ہے، جو نسوں کے اردگرد غلاف "مایلین" (Myelin) بنانے میں انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔

گرم اور سرد مزاج دونوں افراد کے لیے یکساں مفید ہے۔ فوری ہضم ہونے میں مفید ہے۔ معدے کی سوزش اور پیشاب کی جلن دونوں میں نافع ہے۔ نزلہ، سینہ اور پھیپھڑوں کے درد اور بخار میں اس کا کھانا بہت مفید ہے۔ گرمی کی وجہ سے ہونے والے یرقان اور کھانسی کو رفع کرتی ہے۔ پالک کے پانی سے غرغرہ کرنا حلق سنگھڑی) کے درد کو آرام دیتا ہے۔

پتوں والی دوسری تمام سبزیوں کی نسبت پالک زیادہ نافع اور غذائیت کے لحاظ سے چولائی اور باتھو کے ساگ سے بھی زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔ صفرا کی وجہ سے اگر کسی بھی قسم کا جنون یا چڑچڑا پن ہو تو پالک کو بکرے کے گوشت میں پکا کر استعمال کروائیں۔ سر میں درد ہو یا مسلسل رہتا ہو تو بکرے کی سری میں پکا کر استعمال کریں۔ اسے اگر مونگ کی دھلی ہوئی دال میں پکا کر کھایا جائے تو پیشاب کی سوزش اور پیشاب نہ آنے کی شکایت دور کرتی ہے۔

پالک کو کاٹ کر باریک باریک کر کے نمک لگا کر

www.urdugem.com

اسے بطور سلاد کچا کھایا جائے تو جسم میں حیاتین کی مقدار بڑھ جاتی ہے۔ معدے کی سوزش کو ختم کرتا ہے۔ پیاس زیادہ لگنے اور پیشاب جل کر آنے کی صورت میں پالک کا استعمال ان امراض کو ختم کرنے میں بہت مفید ہے۔ یہ مرض دور کر دیتا ہے۔ سرد مزاج والے لوگ اسے گوشت کے ساتھ پکا کر کھائیں، کیونکہ پالک خود ایک سرد سبزی ہے اور یہ سرد مزاج لوگوں پر قدرے اثر انداز ہو سکتی ہے۔

پالک کی سرد مزاجی کو ختم کرنے کے لیے پکاتے وقت دار چینی کوٹ کر اس کے ہمراہ شامل کر لی جائے تو بہتر ہے، اس طرح اس کا مزاج تبدیل ہو جاتا ہے۔ دائمی قبض پالک کثرت سے استعمال کرنے سے مستقل ختم ہو جاتی ہے کیونکہ یہ زود ہضم ہے۔ یہ خشک کھانسی اور یرقان کے لیے بھی بے حد سود مند ہے۔ بخار میں مبتلا لوگ اسے شوق سے اور بلا جھجک استعمال کریں۔

اس کا استعمال انسانی جلد کی خوبصورتی کو برقرار رکھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہ جلد کو نرم و ملائم اور صاف و شفاف رکھتا ہے۔ جھریوں، سیاہ حلقوں اور لٹکی ہوئی جلد سے چھٹکارا پانے کے لیے ہر روز ایک گلاس پالک کا تازہ جوس پینے سے اس میں موجود اینٹی آکسیڈینٹس جلد کو لچک دار اور ہائیڈریٹ رکھنے میں مدد کرتے ہیں اور آپ کو اینٹی ایجنگ کریموں اور اسکن ٹانک کی ضرورت کم ہی پڑتی ہے۔

بال ہماری شخصیت کا اہم حصہ ہوتے ہیں۔ اس سبزی کا استعمال بالوں کو صحت مند، پرکشش اور چمک دار بنانے میں مدد دیتا ہے۔ اگر بال روکھے، پتلے اور بے رونق ہوں اور سر میں خشکی بھی ہو تو اس کا علاج کیمیائی ہیئر ٹانک سے کرنے کے بجائے ہفتے میں چار مرتبہ ایک گلاس پالک کا جوس پی لینا چاہیے۔ اس میں موجود وٹامن 'بی' بالوں کی نشوونما کو متحرک کر دیتا ہے اور ان کو موئسچرائز اور چمک دار رکھنے میں مدد دیتا ہے۔

کھانسی، گلے کی جلن، اور پھیپھڑوں کی سوجن ہو تو پالک کے رس سے غرارے کرنے سے فائدہ ہوتا ہے۔

خون کی کمی میں آدھا گلاس پالک کے رس میں دو چمچ شہد ملا کر ۵۰ دن پینے سے جسم میں خون کا اضافہ ہوتا ہے۔ خون کی کمی دور کرنے کے لیے پالک بہترین ہے۔ اگر روزانہ پالک کا رس تین بار ۱۲۵ گرام کی مقدار میں لیا جائے، تو تمام بیماریاں ختم ہو کر چہرے پر سرخی، جسم میں پھرتی، امنگ اور طاقت کی سینچائی اور خون کے دورے میں تیزی آجاتی ہے۔ باقاعدہ استعمال سے چہرے کے رنگ میں نکھار آجاتا ہے۔ اس کا رس کچے پتے یا مونگ کی دال میں پالک کے پتے ڈال کر سبزی کھانی چاہیے۔ یہ خون صاف کرتی اور قوت دیتی ہے۔

پالک یرقان، دیوانگی، ہسٹریا، پیاس، جلن اور صفراوی بخاروں میں مفید ہے۔

پالک کا رس دانتوں اور مسوڑھوں کو مضبوط بناتا ہے۔ پائیوریا کے مریض کو کچا پالک دانتوں سے چبا کر کھانا چاہیے۔ صبح خالی پیٹ پالک کا رس پینے سے پائیوریا ٹھیک ہو جاتا ہے۔ گاجر کے رس میں پالک کا رس ملانے سے مسوڑھوں سے خون بہنا بند ہو جاتا ہے۔

کئی لوگ یہ کہتے ہیں کہ پالک کھانے سے پتھری ہو جاتی ہے لیکن یہ ضرور سمجھ لیں کہ کچے پالک کے رس کے استعمال سے ہرگز پتھری نہیں ہوتی۔ کچے پالک کا رس آدھا گلاس صبح پیتے رہنے سے قبض کچھ ہی دنوں میں ٹھیک ہو جاتا ہے۔ آنتوں کی بیماریوں میں اس کی ترکاری مفید ہے۔ پالک اور باتھو کی سبزی کھانے سے بھی قبض دور ہوتی ہے۔

کچھ دنوں تک لگاتار زیادہ مقدار میں کھانے سے پیٹ کی بیماریوں میں فائدہ ہوتا ہے۔ معدے کی جلن، آنتوں کے زخم وغیرہ میں پالک کا رس مفید ہے۔

شام کو پالک کے پتے ابال کر پانی چھان لیں اور پتے بھی نچوڑ لیں۔ اس گرم گرم پانی سے غرارے کرنے سے گلے کا درد ٹھیک ہو جاتا ہے۔ ◆◆◆

ڈاکٹر آصف محمود جاہ (ستارۂ امتیاز)

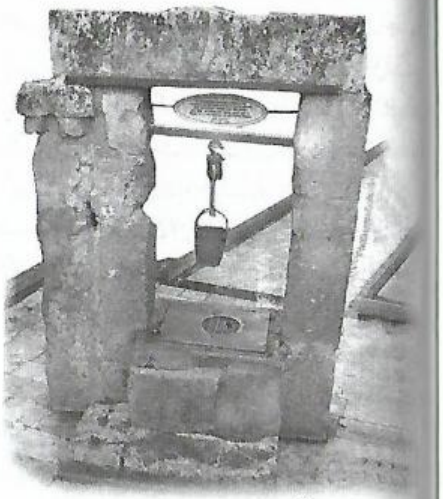

عُرفہ کا مقدس کنواں

اللہ تعالیٰ کے ایک برگزیدہ نبی کی مثالی داستانِ حیات

ترک شہر عرفہ میں حضرت ایوبؑ سے منسوب کنوئیں کے قریب کھڑا میں پیغمبر کے حالاتِ زندگی تازہ کر رہا تھا۔ حضرت حسن اور قتادہ فرماتے ہیں، بیماری میں مبتلا ہونے کے بعد سات سال اور کئی ماہ تک حضرت ایوبؑ تکلیف میں مبتلا رہے۔ بنو اسرائیل نے کوڑے پھینکنے کی جگہ ایک غار میں آپ کو ڈال رکھا تھا۔ بدن میں کیڑے پڑ گئے تھے پھر اللہ نے آپ پر رحم و کرم کیا اور تمام بلاؤں سے نجات دی۔

وہب بن منبہ کا بیان ہے کہ پورے تین سال آپ اس تکلیف میں رہے۔ سارا گوشت جھڑ گیا صرف ہڈیاں اور چمڑا رہ گیا۔ آپؑ راکھ میں پڑے رہتے۔ صرف ایک آپؑ کی بیوی صاحبہ تھیں جو آپؑ کے پاس تھیں۔ جب زیادہ زمانہ گزر گیا تو ایک روز عرض کرنے لگیں کہ اے نبی اللہ، آپ اللہ سے دعا کیوں نہیں کرتے کہ وہ اس مصیبت کو ہم پر سے ٹال دے۔

آپؑ فرمانے لگے بیوی صاحبہ، سنو! ستر برس تک اللہ تعالیٰ نے مجھے صحت و عافیت میں رکھا۔ اگر ستر برس تک میں اس حالت میں رہوں اور صبر کروں تو یہ بھی بہت کم ہے۔ اس پر بیوی صاحبہ کانپ اٹھیں۔ اب وہ شہر میں جاتیں۔ کچھ کام کاج کرتیں۔ جو تھوڑا بہت ملتا، لا کر حضرت ایوبؑ کو کھلاتیں پلاتیں۔

آپؑ کے دو دوست اور دلی خیر خواہ تھے۔ انھیں فلسطین میں جا کر شیطان نے خبر دی کہ تمہارا دوست سخت مصیبت میں مبتلا ہے تم جاؤ ان کی خبر گیری کرو اور اپنے ہاں کی کچھ شراب اپنے ساتھ لے جاؤ، وہ پلا دینا، اس سے انھیں شفا ہو جائے گی۔ چنانچہ وہ دونوں آئے حضرت ایوبؑ کی حالت دیکھتے ہی ان کے آنسو نکل آئے۔ بلبلا کر رونے لگے۔ آپؑ نے پوچھا تم کون ہو؟

انھوں نے یاد دلایا تو آپؑ خوش ہوئے، انھیں مرحبا کہا۔ وہ کہنے لگے۔ اے جناب آپ شاید کچھ چھپاتے ہوں گے اور ظاہر اس کے خلاف کرتے ہوں گے۔ آپ نے اپنی نگاہیں آسمان کی طرف اُٹھا کر فرمایا 'اللہ خوب جانتا ہے کہ میں کیا چھپاتا اور کیا ظاہر کرتا تھا۔ میرے رب نے مجھے اس میں مبتلا کیا ہے تاکہ وہ دیکھے کہ میں صبر کرتا ہوں یا بے صبری'۔

وہ کہنے لگے اچھا ہم آپ کے واسطے دوا لائے ہیں۔ آپ اسے پی لیجیے۔ شفا ہو جائے گی۔ شراب کو دیکھتے ہی آپؑ سخت غضبناک ہوئے اور فرمانے لگے تمہیں شیطان خبیث لایا ہے۔ تم سے کلام کرنا، تمہارا کھانا پینا مجھ پر حرام ہے۔ یہ سن کر دونوں آپؑ کے پاس سے چلے گئے۔

صابر پیغمبر کی صابر اور وفا شعار بیوی:

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ آپؑ کی بیوی صاحبہ نے ایک

www.urdugem.com

گھر والوں کی روٹیاں پکائیں۔ ان کا ایک بچہ سویا ہوا تھا تو انھوں نے اس بچے کے حصے کی ٹکیہ انھیں دے دی۔ یہ لے کر حضرت ایوبؑ کے پاس آئیں۔ آپؑ نے کہا 'یہ آج کہاں سے لائیں' انھوں نے سارا واقعہ بیان کر دیا۔ آپؑ نے فرمایا 'ابھی فوراً واپس جاؤ۔ ممکن ہے۔ بچہ جاگ گیا ہو اور اسی ٹکیہ کی ضد کرتا ہو اور رو رو کر سارے گھر کو پریشان کرتا ہو'۔

آپ روٹی واپس لے کر چلیں۔ ان کی ڈیوڑھی میں ایک بکری بندھی ہوئی تھی۔ اس نے زور سے آپ کو ٹکر ماری۔ آپ کی زبان سے نکل گیا 'دیکھو ایوبؑ کیسے غلط خیال والے ہیں'۔ پھر اور پر گئیں تو دیکھا واقعی بچہ جاگا ہوا اور ٹکیہ کے لیے مچل رہا ہے۔ گھر بھر کا ناک میں دم کر رکھا ہے یہ دیکھ کر بے ساختہ زبان سے نکلا 'اللہ ایوبؑ پر رحم کرے۔ اچھے موقعے پر پہنچی'۔

بچے کو ٹکیہ دے دی اور واپس لوٹیں۔ راستے میں شیطان بہ صورت طبیب ملا اور کہنے لگا کہ 'تیرے خاوند سخت تکلیف میں ہیں۔ مرض میں مدتیں گزر گئیں۔ تم انھیں سمجھاؤ، فلاں قبیلے کے بت کے نام پر ایک مکھی مار دیں۔ شفا ہو جائے گی پھر توبہ کر لیں'۔ جب آپ حضرت ایوبؑ کے پاس پہنچیں تو ان سے یہ کہا۔ آپؑ نے سن کر فرمایا 'شیطان خبیث کا جادو تجھ پر چل گیا۔ میں اگر تندرست ہو گیا تو تجھے سو کوڑے لگاؤں گا'۔

بیوی کے بالوں کی لٹیں اور حضرت ایوبؑ کا کھانا:

ایک دن آپ حسبِ معمول تلاش معاش میں نکلیں۔ گھر گھر پھر آئیں لیکن کہیں کام نہ ملا۔ مایوس ہو گئیں۔ شام کو پلٹنے کے وقت حضرت ایوبؑ کی بھوک کا خیال آیا۔ آپ نے اپنے بالوں کی لٹ کاٹ کر ایک امیر لڑکی کے ہاتھ فروخت کر دی۔ اس نے آپ کو بہت کھانے پینے کا سامان دیا جسے لے کر آپ آئیں۔ حضرت ایوبؑ نے پوچھا، یہ آج اتنا سارا اور اتنا اچھا کھانا کیسے مل گیا؟ فرمایا 'ایک امیر گھر کا کام کر دیا تھا'۔ آپؑ نے کھا لیا۔ دوسرے روز بھی اتفاق سے ایسا ہی ہوا۔ نیک دل بیوی نے اپنے بیمار شوہر کے لیے اپنے بالوں کی دوسری لٹ کاٹ کر فروخت کر دی۔ کھانا لے آئیں۔ کھانا دیکھ کر

حضرت ایوبؑ نے فرمایا۔ 'واللہ! میں ہرگز نہ کھاؤں گا۔ جب تک تو مجھے یہ نہ بتلا دے کہ یہ کیسے لائی ہو؟' وفا شعار بیوی نے اپنا دوپٹہ سر سے اتار کر دکھایا۔ سر کے بال سب کٹے چکے تھے۔ اس وقت گھبراہٹ اور بے چینی ہوئی اور اللہ سے دعا کی کہ 'مجھے ضرر پہنچا ہے اور تو سب سے زیادہ رحیم ہے'۔

حضرت نوف کہتے ہیں کہ جو شیطان حضرت ایوبؑ کے پیچھے پڑا تھا اس کا نام مبسوط تھا۔ حضرت ایوبؑ کی بیوی صاحبہ عموماً آپؑ سے عرض کیا کرتی تھیں کہ اللہ سے دعا کرو لیکن آپؑ نہ کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک دن بنو اسرائیل کے کچھ لوگ آپؑ کے پاس آ نکلے اور آپؑ کو دیکھ کر کہنے لگے 'اس شخص کو یہ تکلیف ضرور کسی نہ کسی گناہ کی وجہ سے ہے'۔ اس وقت بے ساختہ آپ کی زبان سے یہ دعا نکل گئی۔ حضرت عبداللہ بن عبید بن عمیرؓ فرماتے ہیں کہ حضرت ایوبؑ کے دو بھائی تھے۔ ایک دن وہ ملنے کے لیے آئے لیکن جسم کی بدبو کی وجہ سے قریب نہ آ سکے۔ دور ہی سے کھڑے ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ 'اگر اس شخص میں بھلائی ہوتی تو اللہ تعالیٰ اسے اس مصیبت میں نہ ڈالتا'۔

حضرت ایوبؑ کی دعا اور بیماری سے شفاء:

اس بات نے حضرت ایوبؑ کو وہ صدمہ پہنچایا جو آج تک آپؑ کو کسی چیز سے نہ ہوا تھا۔ اس وقت کہنے لگے 'اے اللہ کوئی رات مجھ پر ایسی نہیں گزری کہ کوئی بھوکا شخص میرے علم میں ہو اور میں نے پیٹ بھر لیا ہو۔ پروردگار! اگر میں اپنی اس بات میں تیرے نزدیک سچا ہوں تو میری تصدیق فرما'۔ اسی وقت آسمان سے آپ کی تصدیق کی گئی اور وہ دونوں سن رہے تھے۔

پھر فرمایا 'پروردگار کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میرے پاس ایک سے زائد کپڑے ہوں اور میں نے کسی ننگے کو نہ دیے ہوں۔ اگر میں اس میں سچا ہوں تو تو میری تصدیق آسمان سے کر'۔ اس پر بھی آپؑ کی تصدیق ان کے سنتے ہوئے کی گئی۔ پھر یہ دعا کرتے ہوئے سجدے میں گر پڑے کہ 'اے اللہ میں تو اب سجدے سے سر نہ اٹھاؤں گا جب تک تو مجھ سے ان تمام مصیبتوں کو دور نہ کر دے جو مجھ پر نازل ہوئیں'۔ چنانچہ یہ دعا مقبول ہوئی۔

مقامِ شفاء:

ابن ابی حاتم میں ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں ''حضرت ایوبؑ اٹھارہ برس تک بلاؤں میں گھرے رہے۔ پھر ان کے دو بھائیوں کے آنے اور بدگمانی کرنے کا ذکر ہے جس کے جواب میں آپؑ نے فرمایا کہ 'میری تو یہ حالت تھی کہ راستہ چلتے دو شخصوں کو جھگڑتا دیکھتا اور ان میں سے کسی کو قسم کھاتے سن لیتا تو گھر آ کر اس کی طرف سے کفارہ ادا کر دیتا کہ ایسا نہ ہو کہ اس نے اللہ کا نام بے حق لیا ہو'۔ آپؑ اپنی بیماری میں اس قدر نڈھال ہو گئے تھے کہ آپؑ کی بیوی صاحبہ آپؑ کا ہاتھ تھام کر پاخانہ پیشاب کے لیے لے جاتی تھیں۔ ایک مرتبہ آپؑ کو حاجت تھی۔ آپؑ نے آواز دی لیکن انھیں آنے میں دیر لگی۔ آپؑ کو سخت تکلیف ہوئی۔ اسی وقت آسمان سے ندا آئی 'اے ایوب! اپنی ایڑی زمین پر مارو۔ اسی پانی کو پی بھی لو اور اسی سے نہا بھی لو'۔ میں عین اسی جگہ کھڑا حضرت ایوبؑ کے صبر کو خراجِ تحسین پیش کر رہا تھا اور وہ منظر یاد کر رہا تھا کہ کیسے اللہ تعالیٰ نے طویل آزمائش کے بعد حضرت ایوبؑ کو شفا بخشی۔

ان کی ساری بیماری دور ہو گئی اور پھر سے وہ جوان رعنا بن گئے۔ ان کی نیک دل بیوی آئی تو حیران ہو کر پوچھنے لگی کہ 'اے شخص، یہاں میرا مرد بیمار تھا۔ ایک ایسا بوڑھا شخص جس کے قریب کوئی نہ آتا تھا'۔ حضرت ایوبؑ کہنے لگے کہ 'اے نیک دل صابر عورت، میں ہی ایوب ہوں'۔ بیوی نے کہا کہ 'اے شخص میرے ساتھ مذاق مت کر۔ میں پہلے ہی بہت دکھی اور پریشان ہوں'۔ حضرت ایوبؑ نے بڑی مشکل سے بیوی کو مطمئن کیا۔ وہ نیک دل عورت اپنی دعاؤں کے قبول ہونے پر اور اللہ کی نعمتوں پر اس کے حضور جھک گئی۔

ڈنمارک کی خاتون کا قبولِ اسلام:

حضرت ایوبؑ کے نام سے منسوب کنوئیں پر کھڑا میں گردشِ ایام کو تصور میں لا رہا تھا کہ اسماء دوڑتی دوڑتی آئی اور کہنے لگی کہ ایک غیر ملکی عورت کلمہ پڑھ رہی ہے۔ میں نے اپنے تئیں اسے کلمہ پڑھانے اور اس کا ترجمہ بتانے کی کوشش کی ہے۔ آپ اسے دین کی بنیادی باتیں بتا دیں۔ یہ سن کر میں نے فوراً دوڑ لگائی کہ کہیں یہ حسین لمحات گذر نہ جائیں۔ وہاں ایک عجیب روحانی منظر دیکھا کہ ایک پچاس سال کی ڈنمارک کی عورت سر پہ اسکارف اوڑھے کھڑی تھی۔ اسماء اور ایک ترک عورت اسے کلمہ پڑھا رہی تھیں۔

وہ بے چاری اٹک اٹک کر الفاظ ادا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ قریب پہنچ کر اُسے دوبارہ کلمہ پڑھوایا۔ وہ اٹک اٹک کر پڑھ رہی تھی۔ دو تین دفعہ پڑھ کر کلمہ اس کی زبان پر چڑھ گیا۔ الحمدللہ! پڑھ چکی تو اسے انگریزی میں سب سے پہلے مبارکباد دی اور بتایا کہ آج سے تم ہماری مسلمان بہن ہو۔ آج سے پچاس سال تک کیے گئے تمام گناہ دھل گئے ہیں۔ آپ اس وقت ایسے ہی ہو جیسے ایک نومولود بچہ ماں کے پیٹ سے نکلتا ہے۔ اسلام کے حلقہ میں آ کر آپ کے لیے ایک اللہ کو ماننا، رسول اللہ ﷺ کو آخری نبی ماننا، قیامت کے دن پر، آسمانی کتابوں اور فرشتوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔

کلمہ کا نور:

کلمہ پڑھ کر ڈنمارک کی عورت کے چہرے پر ایمان کی روشنی آ گئی۔ اس کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا اور اس کے اردگرد ایک نور کا ہالہ محسوس ہوا۔ ہمیں بھی روحانی خوشی ہو رہی تھی۔ ایک دم ایسے محسوس ہوا کہ نور کے ایک ہالے نے اس نومسلم بہن اور اس کے طفیل ہمیں بھی اپنے اندر لے لیا ہے۔ اس کے چہرے پہ خوشی تھی، سکون تھا اور ہم سب بھی اس کی خوشی میں شامل ہو کر بے حد مسرور تھے اور اللہ کا شکر ادا کر رہے تھے کہ ہم اس وقت یہاں موجود ہیں۔

ترک بابا کا خوشی سے جھومنا:

ایک ترک بابا بھی پاس کھڑا تھا۔ وہ بھی اس نیک

www.urdugem.com

خاتون کو کلمہ پڑھانے لگا۔ جب ایک دفعہ اس نے بابا کے کہنے پہ کلمہ پڑھا تو بابا خوشی سے جھومنے لگا۔ جھومتے جھومتے بار بار وہ خود بھی پڑھنے لگا اور گواہی دینے لگا۔ لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ سب ساتھی آ گئے۔ یہ منظر دیکھ کر حیران ہو گئے۔ نورانیت اور روحانیت کا ماحول بن گیا۔ وقار بادشاہ مٹھائی لے آئے۔ مسلمان بہن کو کہا، ہم آپ کے اسلام میں داخل ہونے کی خوشی منا رہے ہیں۔ وہ بھی خوشی سے ہاتھ اُوپر اٹھا کر خوشی منانے لگی۔ اسماء نے سوسن جہت کے منہ میں مٹھائی کا ٹکڑا ڈالا۔ اس کے چہرہ کا رنگ بالکل متغیر ہو چکا تھا۔ خوشی کے مارے اس سے مزید نہ بولا گیا۔

اسماء نے کہا کہ آج سے آپ کا نام ''آمنہ'' ہے۔ میں نے بتایا کہ حضرت آمنہ ہمارے پیارے نبی کریم ﷺ کی والدہ محترمہ کا نام ہے، اللہ سے دعا کی کہ اس نیک دل عورت کو اسلام میں پکا پکا داخل فرما دے۔ ڈنمارک کی عورت کو کلمہ پڑھوا کر اتنی روحانی خوشی ہوئی کہ دن بھر کی تھکاوٹ اُتر گئی۔ ترکی بابا تھوڑا سا توقف کر کے آگے بڑھتا ہماری نئی مسلمان ہونے والی بہن کو کلمہ پڑھاتا اور جب وہ کوشش کر کے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ﷺ پورا پڑھ لیتی تو بابا خوشی سے نہال ہو جاتا۔ زور سے نعرہ لگاتا۔ دائرے میں گھومنے لگتا۔ وہ بابا مجھے مولانا رومی کا درویش لگا جو مست ہو کر اس خوشی سے رقص درویش کا استعارہ بن گیا۔

حضرت ایوبؑ کے نام اور مقام کی برکت سے ایک عورت جہنم کی آگ سے بچ کر حقیقی جنت کی طرف آ گئی۔ اس سے بڑی خوشی کیا ہو گی؟ حضرت ایوبؑ جیسے جلیل القدر پیغمبر کے مقام صبر کی زیارت اور وہاں ایک نو مسلم کا قبول اسلام آج اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانیوں کی انتہا کر دی۔ مقام ایوبؑ سے نکلنے کو دل نہیں کر رہا تھا۔ صابر پیغمبر کے مقام پر روحانی انوارات کی بارش ہو رہی تھی۔ فضا میں نورانیت اور روحانیت بسی ہوئی تھی پھر ڈنمارک کی عورت کے کلمہ پڑھنے اور ترک بابا کے رقص درویش نے ماحول کو اور بھی معطر کر دیا تھا۔ لیکن وقت کم تھا، آگے بھی جانا تھا۔

عرفہ کے بے مثال میوزیم:

نبیوں کے شہر کی گلیوں، سڑکوں، راہداریوں، نئی و پرانی عمارتوں سے گذرتے ہوئے آگے بڑھے۔ الروحہ ہوٹل کے سامنے ہی عرفہ کا میوزیم ہے جس میں ہزاروں سال پہلے کی ثقافت، کلچر، معاشرت کے نوادرات محفوظ کیے گئے ہیں۔ یہاں پیغمبروں کے ادوار کی بھی چیزیں ہیں۔ رومن اور آرمینیائی سلطنتوں کے بھی آثار ہیں اور ہزاروں سال پہلے کی تاریخ سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔ میوزیم کو اچھی طرح دیکھنے کے لیے پورا دن چاہیے۔ عبداللہ نے بتایا کہ عرفہ کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ ہزاروں سال پہلے یہاں کئی تہذیبوں نے جنم لیا اور یہ کئی قوموں کا مسکن رہا۔ آخری بار عرفہ کی گلیوں کو جی بھر کے دیکھا پتہ نہیں دوبارہ کب آنا ہو۔

دو ہزار شامی خاندانوں کے لیے راشن پیکج:

دو ہزار خاندانوں کے لیے مہینے بھر کا راشن خریدنے کی خاطر رقم دی تھی۔ حیرۃ فاؤنڈیشن نے اس رقم سے راشن کے دو ہزار پیکیجز خرید کر عرفہ بھجوا دیے۔ دلی خوشی ہوئی کہ جس مقصد کے لیے وہ رقم لائے تھے، خرچ ہو گئی۔ حیرۃ فاؤنڈیشن ترکی کی بڑی این جی اوز میں سے ایک ہے۔ اس میں زیادہ تر لوگ بلا معاوضہ کام کرتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی بات اس کا اسلامی تشخص ہے۔ مصیبت زدہ افراد کو راشن اور ضرورت کی چیزیں مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ یہ ان کی اسلامی اور اخلاقی تربیت کا بھی کما حقہ خیال رکھتے ہیں تاکہ مصیبت کی گھڑی میں وہ اللہ کے احکام اور رسول اللہ ﷺ کے پیغام کو بھول نہ جائیں۔

جب بھی حیرۃ کے اہم لوگوں سے ملاقات ہوئی، یہ سن کر خوشی ہوتی کہ ان کا ارتکاز اسلامی تعلیمات پر ہے۔ فاؤنڈیشن کے تحت چلنے والے اسکولوں، یتیم خانوں اور دوسرے اداروں میں بھی اسلامی تشخص نمایاں نظر آیا۔ پچھلے تین چار دن ان کے ساتھ کام کرتے ہوئے اور ان کے بڑوں سے مل کر حقیقی خوشی

ہوئی اور یہ پیغام ملا کہ مسلمانوں کو تکلیف کی گھڑی میں بھی اپنے اللہ کو نہیں بھولنا چاہیے کیونکہ رجوع الی اللہ اور اس کے احکام پر عمل کرنے سے ہی سارے مسائل حل ہوں گے۔

عرفہ کے نیک دل گورنر سے ملاقات:

آج ہم نے عرفہ کے گورنر سے ملاقات کرنی ہے جس کا وقار بادشاہ نے بندوبست کیا ہوا تھا۔ مقام ایوبؑ سے گورنر ہاؤس کا رُخ کیا۔ وقت مقررہ پر گورنر ہاؤس پہنچ گئے جہاں تھوڑے سے استفسار پر اندر جانے کی اجازت مل گئی۔ وسیع و عریض گورنر ہاؤس کی خوبصورت عمارت شہر کے عین وسط میں تھی۔ چند کنالوں پر بنے ہوئے گورنر ہاؤس کے باہر سکیورٹی کا جم غفیر تھا نہ ہٹو بچو کی صدائیں تھیں۔ عملے نے خوش آمدید کہا۔

دفتر میں سب سے پہلے نائب گورنر نے استقبال کیا۔ وقت مقررہ پر گورنر صاحب تشریف لائے۔ سب سے گرم جوشی اور مسکراہٹ کے ساتھ ملے۔ وقار بادشاہ نے فرداً فرداً سب ساتھیوں کا تعارف کروایا۔ راقم کو وفد کا سربراہ ہونے کی وجہ سے گورنر صاحب کے برابر بٹھایا گیا۔

میں نے عرض کیا ''گورنر صاحب ہم اس مقدس سرزمین میں آ کر بہت خوش ہیں۔ عرفہ کے لوگوں نے ہمارا بہت خیر مقدم کیا۔ ہمارا ہر طرح سے خیال رکھا۔ ہمارے کھانے اور رہائش کا بہترین بندوبست کیا۔ جس طریقے سے ترکی کی حکومت مہاجرین کا خیال رکھ رہی ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ آپ لوگوں نے انصار مدینہ کا کردار ادا کیا ہے۔ ترکی کی موجودہ لیڈرشپ اللہ کا خاص عطیہ ہے۔ اللہ کرے عثمانی دور کا سنہری وقت واپس آ جائے اور ترک ایک دفعہ پھر مسلمانوں کی راہنمائی کریں۔ ہم پاکستان سے محبت کا پیغام لائے ہیں اور ہم ان شاءاللہ ترکی کے لوگوں کے ساتھ ہیں'' گورنر صاحب نے کہا کہ 'میں آپ لوگوں کے جذبے کو سلام پیش کرتا ہوں۔ عرفہ پیغمبروں کا شہر ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ یہاں آئے۔ اصل میں اس وقت بہت سی عالمی سازشیں مسلمانوں کے خلاف ہو رہی ہیں۔ مسلمانوں کو آپس میں لڑا کر اور سازشیں کر کے ختم کیا جا رہا ہے۔ ہم اپنے اختلافات ختم کر کے اور اللہ کی طرف رجوع کر کے کامیاب ہو سکتے ہیں۔ عرفہ کے لوگ بہت مہمان نواز ہیں۔ ان کے جدِ امجد حضرت ابراہیمؑ اس وقت کھانا نہ کھاتے تھے جب تک ان کے ساتھ مہمان شامل نہ ہوں۔ ہم شام کے مہاجرین کو اپنا بھائی اور مہمان سمجھتے ہیں اور ان کو مہاجرین نہیں بلکہ مسافر کہتے ہیں۔ ہم نے ان کے لیے ہر قسم کی سہولیات مہیا کی ہیں۔

میں نے عرض کیا کہ 'ہم مہاجرین کے کیمپوں میں گئے ان سے بات کی ہے۔ وہ ترکی کی حکومت اور عوام سے بہت خوش ہیں۔

چائے کے بعد یہ خوش گوار ملاقات ختم ہوئی۔ آخر میں گورنر صاحب نے عرفہ میں مقامی طور پر بنا ہوا دیدہ زیب کافی سیٹ تحفہ میں دیا۔ اٹھتے اٹھتے گورنر صاحب دروازے تک ساتھ گئے اور مجھے آگے چلنے کو کہا۔ عرفہ کے گورنر سے یادگار ملاقات ہمیشہ یاد رہے گی۔

گورنر ہاؤس سے نکل کر سیدھا ہوائی اڈے کی طرف بھاگے کیونکہ پرواز کا وقت ہونے والا تھا۔ نوری مجتبیٰ اور عبداللہ ساتھ تھے۔ عبداللہ صاحب نے گاڑی کو خوب بھگایا اور پندرہ منٹ میں ائیر پورٹ پہنچا دیا۔ حضرت ایوبؑ کے چشمے سے سب نے پانی کے کین لیے تھے کیونکہ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ آب شفا ہے۔ سب نے پانی کے کین ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے تھے مگر ائیر پورٹ اہل کاروں نے یہ کہہ کر سب کی امیدوں پر پانی پھیر دیا کہ پانی آپ اس طرح جہاز میں نہیں لے جا سکتے۔

اسماء نے ایک بوتل بڑے بریف کیس میں رکھنے کی کوشش کی مگر فوراً پانی لیک ہو کر دوسرے سامان کو گیلا کرنے لگا۔ اس لیے سارے کین عبداللہ کے حوالے کیے۔ مجتبیٰ اور عبداللہ سے گلے ملے۔ ان کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے محبت سے الوداع کیا۔

www.urdugem.com

محمد فاروق عزمی

ابّا جی فارغ ہی ہیں!

ملازمت سے سبکدوشی کے بعد پیش آنے والے تلخ و شیریں حالات کی سبق آموز رُوداد، ایک ریٹائرڈ بابا کے قلم سے

رات سے ہی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، شاید عمر کا بھی تقاضا ہوتا ہے، پھر موسم بھی بدل رہا تھا، ہلکی ہلکی سردی نے پاؤں جما لیے تھے اور بنا سویٹر یا جیکٹ کے گھر سے نکلنا مناسب نہیں تھا۔ کئی دنوں سے سردی کی آمد کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ سردیوں کے کپڑے گرمیوں میں صندوقوں میں رکھ دیے جاتے ہیں۔ میں دو تین بار بہورانی سے کہہ چکا تھا کہ گرم کپڑے نکال دیں، لیکن بات ''اچھا ابو جی'' تک ہی رہی۔

ساڑھے سات بجے صبح بچوں کو اسکول چھوڑنے جانا ہوتا ہے۔ اس وقت خاصی سردی ہوتی ہے۔ پوتا اور پوتی ضد کرتے ہیں کہ دادا ابو کے ساتھ ہی جانا ہے۔ میرے لیے بھی یہ لمحات بہت خوشگوار ہوتے ہیں۔ ان کی معصومانہ باتیں، چھوٹی چھوٹی ضدیں اور پیار بھری دھمکیاں لہو میں حرارت کا باعث بن جاتی ہیں۔ بچوں کو اسکول چھوڑ کر واپسی پر دودھ انڈے اور ڈبل روٹی لے آتا ہوں۔

ایک دن گھر پہنچ کر یاد آیا کہ چڑیوں کا دانہ کل ہی ختم ہو گیا تھا۔ انڈے اور دودھ فریج میں رکھ کر الٹے قدموں پھر واپس باہر نکل گیا۔ ابھی ساری دکانیں نہیں کھلی تھیں۔ مین روڈ پر ایک دکان جلد کھل جاتی ہے۔ چہل قدمی کو ''جواز'' بنا کر پیدل ہی چل دیا۔ ذہن کے کسی گوشے میں پیٹرول کی بچت کا خیال بھی تھا، اس لیے ''بائیک'' گیراج میں کھڑی کر دی تھی۔

وہاں پہنچ کر پتا چلا کہ مذکورہ دکان بوجہ فوتیدگی دو دن کے لیے بند ہے۔ اب کیا کیا جائے؟ آگے کالونی کے بالمقابل سڑک کے اس پار ایک سپر سٹور ہے۔ شاید وہ کھل گیا ہو؟ لہٰذا چلتے ہوئے سڑک کے دوسری طرف نکل گیا۔ پرندوں کا دانہ خرید کر گھر واپس آتے آتے نو بجے کا وقت ہو گیا۔ رات طبیعت کی خرابی کے باعث بنا کھانا کھائے ہی سو گیا تھا۔ سو اس وقت بھوک چمک اٹھی تھی۔ بہو کو ناشتا بنانے کا کہہ کر چھت پہ دانہ ڈالنے چلا گیا۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بے حد تھکاوٹ محسوس ہوئی۔ شاپر سے مٹھی بھر دانہ لے کر مخصوص جگہ پر بکھیر دیا تو چڑیاں منڈیروں سے اتر کر میرے اردگرد منڈلانے لگیں۔

میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ میرے پیچھے پیچھے بہورانی بھی تازہ اخبار لیے کمرے میں داخل ہوئی۔ اخبار میرے سامنے میز پر رکھتے ہوئے اطلاع دی کہ گیس بہت کم آ رہی ہے۔ ناشتا بنانا ممکن نہیں۔ اس لیے بازار سے ہی کچھ لانا پڑے گا۔ شاید چائے بڑی مشکل سے بن پائے۔ سردیوں میں ہمیشہ گیس کا مسئلہ ہو جاتا ہے اور ابھی تو موسم بھی شدید نہیں ہوا۔ جب ٹھنڈ زیادہ پڑنے لگے گی تو کیا صورت ہو گی؟ یہی سوچتے اور بہو سے مشورہ کرتے ہوئے کہ ناشتے کے لیے کیا لاؤں، پھر باہر نکل گیا۔

ساڑھے دس بجے ناشتا نصیب ہوا۔ روزانہ صبح فجر کی اذان کے وقت اٹھ جاتا ہوں۔ آج کی بھاگ دوڑ کے بعد سوچ رہا ہوں کہ اکثر صبح صبح ناشتا کرنا ممکن نہیں رہتا۔ کوئی نہ کوئی چھوٹا موٹا کام ''ایمرجنسی'' کی طرح روزانہ ہی نکل آتا ہے، لہٰذا کوئی ایسا بندوبست ہونا چاہیے کہ نمازِ فجر کے بعد کچھ ہلکا پھلکا کھا پی لیا جائے تاکہ سہولت کے ساتھ بچوں کو اسکول چھوڑنے کے علاوہ دیگر چھوٹے موٹے کام آسانی کے ساتھ نمٹا سکوں، پھر چاہے ناشتا دس بجے ملے یا ساڑھے دس، مسئلہ نہیں ہو گا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے میں نے دوسرا ہاتھ اخبار کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ ڈور بیل کی تیز آواز نے ''سماعِ خراشی'' کر دی۔ چائے اور اخبار ایک ساتھ تپائی پر رکھتے ہوئے میں بڑبڑایا کہ اس وقت کون آ سکتا ہے؟ تبھی بیگم کی آواز آئی، سُنیے! وہ گیزر ٹھیک کرنے والا لڑکا آیا ہے باہر۔ مجھے یاد آیا میں کل خود اسے تاکید کر آیا تھا کہ گیارہ بجے تک ضرور آ جائے اور دیکھ کر بتائے کہ کیا مسئلہ ہے۔ پچھلی سردیوں میں بھی پریشانی ہوتی تھی جب گرم پانی نہیں ملتا تھا۔ لڑکوں نے تو توجہ نہیں دینی ہوتی، رات دیر تک نیٹ (NET) پر بیٹھے رہتے ہیں۔ صبح اسی وقت اٹھتے ہیں جب اپنے دفتر اور کام پر جانا ہوتا ہے۔

پاؤں میں چپل گھسیٹتے ہوئے میں، مرکزی دروازے پر تھا۔ لڑکے کو ساتھ لے کر پھر چھت پر جا پہنچا کیونکہ گیزر یہاں نصب ہے۔ وہ اپنا اوزاروں والا ڈبا کھول کر گیزر چیک کرنے لگا۔ میں نے اسے بتایا کہ گیس بھی بہت ہلکی آ رہی ہے، پریشر بالکل نہیں۔ اِدھر اُدھر ہاتھ مارنے اور چیک کرنے کے بعد اس نے ماچس طلب کی۔ تیسری منزل کی چھت سے اتر کر نیچے باورچی خانے تک گیا اور ماچس لا کر اسے تھما دی۔ اس نے مزید پانچ سات منٹ کی جانچ پڑتال اور ماچس کی کئی تیلیاں پھونکنے کے بعد اپنی ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے اعلان کیا کہ گیزر میں زیادہ گڑبڑ ہے اور سارے کا سارا کھول کر ورکشاپ پر لے جانا ہو گا۔ چونکہ اس کا ڈرم بھی ایک دو جگہ سے لیک ہے اور پانی رستا رہتا ہے، لہٰذا بہتر ہے کہ اسے دکان پر (جسے وہ ورکشاپ کہتا ہے) لے جایا جائے، تاکہ تسلی بخش مرمت ہو سکے۔ ساتھ ہی اس نے کوئی پک اَپ یا گدھا گاڑی لانے کا حکم ارشاد فرمایا تاکہ اس پرلاد کر ورکشاپ پہنچایا جا سکے۔

وہ گیزر کو پانی اور گیس کے پائپوں سے الگ کرنے میں جُت گیا اور میں کسی ''لوڈر رگاڑی'' کا بندوبست کرنے سیڑھیاں اتر کر سیدھا باہر کی طرف چل دیا۔ بڑی مشکل سے گھر سے دو فرلانگ دور ایک سوزوکی پک اَپ والا ملا۔ اس سے بات کی اور اسے ساتھ لے کر گھر واپس آیا۔ ایک بار پھر

www.urdugem.com

سیڑھیاں چڑھنے کا مرحلہ درپیش تھا۔ لڑکے نے گیزر کے کنکشن الگ کردیے تھے۔ پک اَپ کے ڈرائیور کو میں ساتھ ہی چھت تک لے آیا تھا تاکہ وہ گیزر اتارنے میں مدد کر سکے۔ اللہ بھلا کرے اُن دونوں نے مل کر سیڑھیوں سے گیزر نیچے اتارا اور میں نے لڑکے کا ٹولز بکس اٹھا کر نشیب تک کا سفر مکمل کیا۔ گیزر کو پک اَپ میں لوڈ کروا کے روانہ کرنے کے بعد وہی آسودگی اور اطمینان محسوس ہوا، جو ایک باپ بیٹی کی ''ڈولی'' رخصت کر کے محسوس کرتا ہے۔

کمرے میں آ کر ذرا کمر سیدھی کرنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ سامنے گھڑی پر نظر جا ٹھہری۔ گھڑی بارہ بج کر دس منٹ کا وقت بتا رہی تھی۔ اب اگر پاؤں پسار لیے تو سبزی ترکاری لانے میں دیر ہو جائے گی اور پھر سوا ایک بجے بچوں کو بھی لینے جانا ہوتا ہے، لہٰذا بغیر کسی تاخیر کے بہورانی کو آواز دی اور روزمرہ کے سودا سلف اور سبزی وغیرہ کی فہرست اور ہدایات لے کر بازار کی طرف نکل گیا۔ اللہ کا شکر ہے، گھر کے قریب ہی دو تین دکانیں ایسی ہیں جہاں سے پیاز ٹماٹر سبزی اور چکن وغیرہ باآسانی مل جاتا ہے۔ لہٰذا موٹر بائیک کا تکلف نہیں کرنا پڑتا اور میں پیدل ہی خریداری کے لیے نکل لیتا ہوں۔ ویسے بھی پیدل چلنا صحت کے لیے اچھا ہے اور بچے بھی کہتے ہیں کہ ابو پیدل چلنے سے شوگر کنٹرول میں رہتی ہے۔ لہٰذا اس خیال سے کہ بدن میں شوگر زیادہ اور بائیک میں پیٹرول کم نہ ہو جائے، میں بھی پیدل چلنے کو ترجیح دیتا ہوں۔

پیاز اور ٹماٹر آج کل بہت مہنگے ہو گئے ہیں۔ دو گلیاں پرے سبزی کی ایک نئی دُکان کھلی ہے۔ وہ بندہ قدرے بہتر قیمت پر سودا دے دیتا ہے۔ آج کل اسی سے سبزی ترکاری لاتا ہوں لیکن آج طبیعت کی ناسازی کے سبب یہ فاصلہ کچھ زیادہ ہی محسوس ہوا۔ بہرحال بچت کے خیال سے اسی دکان تک گیا اور سبزی وغیرہ خرید کر لوٹ رہا تھا کہ یاد آ گیا کہ کل ''ہوم منسٹر'' نے کپڑے کی دو چھوٹی چھوٹی ''کترنیں'' دے کر ارشاد فرمایا تھا کہ اس رنگ کی دھاگے کی نلکیاں لادوں۔ وہ کپڑے کی کترنیں جیب میں رکھی ہیں۔ بازار کھل چکے تھے۔ دو تین دکانیں پھرنے پر صرف ایک رنگ کی نلکی مل سکی۔ ایک دکان دار لڑکے نے مشورہ دیا کہ انکل! آپ دس بارہ دکانیں چھوڑ کر آگے دائیں ہاتھ مڑ جائیں۔ وہاں کوئی آدھے فرلانگ بعد جو نئی مارکیٹ تعمیر ہوئی ہے، اس میں ایک بڑی دکان کھلی ہے۔ وہاں دھاگے، بٹن اور نلکیوں کی بہت ورائٹی ہے، وہاں جا کر دیکھ لیں۔ اس رنگ کی نلکی وہاں سے یقیناً مل جائے گی۔

بادلِ نخواستہ اُدھر کا رُخ کیا۔ سبزی کے شاپر اٹھا کر دکان دکان پھرنا عجیب لگا لیکن سوچا اگر مطلوبہ رنگ کی نلکی مل جائے تو ''آپ کو اس رنگ کی ایک نلکی نہیں ملی'' جیسا عجیب و غریب تبصرہ یا طعنہ بہ زبان ہوم منسٹری سننے سے بچ جاؤں گا۔ قسمت اچھی تھی، اس بڑی دکان سے یہ چھوٹی سی نلکی کپڑے کی کترن کے رنگ کے عین مطابق برآمد ہو گئی۔ اپنی اس کامیابی پر سینے کے قفس سے بے اختیار ایک ٹھنڈی لمبی سانس نکلی۔ اُسے میں سُکھ کی سانس قرار دینے ہی لگا تھا کہ سامنے دیوار پر لگی گھڑی کو دیکھتے ہی فکر دامن گیر ہو گئی کہ ایک تو بج گیا۔

ایک بج کر پندرہ منٹ پر بچوں کو اسکول سے لینے کے لیے نکلنا ہوتا ہے۔ جلدی جلدی سات روپے دکاندار کو ادا کیے۔ پھر سوچا کہ کیا حماقت ہے کہ سات روپے کی چھوٹی سی نلکی کی خاطر گھر سے سات فرلانگ دور تک پیدل ہی چلا آیا ہوں۔ تیز قدموں سے چل کر گھر تک آیا، سبزی کے شاپر اور نلکیاں میز پر پٹخ کر موٹر بائیک کی چابی اٹھائی اور بچوں کو اسکول سے لانے کے لے نکل لیا۔

محلے کی مسجد میں نمازِ ظہر کی جماعت ایک بج کر تیس منٹ پر کھڑی ہوتی ہے۔ اس میں بچوں کی اسکول سے چھٹی والے دن ہی شامل ہوا جا سکتا ہے، لہٰذا روزانہ بچوں کو اسکول سے لانے کے بعد نمازِ ظہر گھر پر ہی ادا کرتا ہوں۔ نماز کے دوران یاد آیا کہ تین دن سے اُردو ڈائجسٹ کے لیے ایک

مضمون لکھ کر رکھا ہے۔ جسے سپردِ ڈاک کرنا بہت ضروری ہے۔ نماز ادا کر کے پھر گھر سے نکل گیا۔ ڈاک خانے سے واپسی پر ملک صاحب کے دروازے پر رُک گیا۔ وہ کئی دِن سے بخار میں مبتلا ہیں اور نماز کے لیے مسجد میں نہیں آ پا رہے۔ ذرا دیر رُک کر ان کی عیادت کی اور انھیں تسلی اور آرام کا مشورہ دے کر گھر کی راہ لی۔ گھر پہنچتے ہی ایک نیا ''ورلڈ آرڈر'' تیار تھا۔

دراصل گزشتہ دِنوں بیگم صاحبہ کی بڑی ہمشیر صاحبہ کی آنکھ کا آپریشن ہوا تھا۔ بیگم صاحبہ ان کی بیمار پرسی کے لیے جانے کو تیار بیٹھی تھیں۔ حکم ہوا کہ کوئی رکشا منگوا دیں، میں کھڑے کھڑے ''باجی'' کا پتا کر آؤں۔ ان کی آنکھ کا آپریشن ہوا ہے۔ میں جا ہی نہیں پائی۔ آج تین دن ہو گئے۔ وہ کیا سوچتی ہوں گی۔ نہ کوئی رکشے والا میرا دوست ہے اور نہ کسی کا رابطہ نمبر میرے پاس ہے۔ سیدھا سا مطلب یہ کہ رکشا لانے کے لیے مجھے خود ہی جانا تھا، لہٰذا مرتا کیا نہ کرتا، ایڑیوں پر گھوم کر واپس مڑا اور گھر سے نکل گیا۔

رکشا لے کر گھر واپس آیا اور ''ہوم منسٹری'' کو رکشے میں سوار کروا اور کرایہ ادا کر کے فارغ ہوا۔ نمازِ عصر سے کچھ پہلے ''لنچ'' تناول فرمایا۔ دورانِ طعام موبائل کی گھنٹی مسلسل بجتی رہی، لیکن میں دانستہ نظر انداز کرتا رہا۔ دوسری طرف جو کوئی بھی تھا، دھن کا بڑا پکا تھا۔ لگاتار چھ بار اس نے نمبر ملایا۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہی نمبر دیکھا تو اسی گیزر والے لڑکے کا تھا، جسے صبح بلایا تھا اور وہ گیزر کھول کر اپنی ورکشاپ پر لے گیا تھا۔ میں نے کال ملائی، رابطہ ہونے پر اس نے یہ نوید سنائی کہ گیزر ''ماشاء اللہ'' ٹھیک ہو گیا ہے، آ کر لے جائیں۔

چونکہ نمازِ عصر کا وقت قریب تھا لہٰذا جلدی جلدی وضو تازہ کیا اور یہ سوچتا ہوا چل دیا کہ پہلے نماز مسجد میں جماعت سے ادا کر لوں پھر گیزر والے کی طرف جاؤں گا۔

ادائیگیِ نماز کے بعد اس بندے کو کال ملائی جو اپنی پک اَپ میں گیزر ورکشاپ تک لے گیا تھا۔ صبح میں نے اس سے موبائل نمبر لے لیا تھا۔ رابطہ ہونے پر اس نے بتایا کہ وہ تو کوئی ''لوڈ'' لے کر کہیں دور نکل گیا ہے، اسے دیر ہو جائے گی، لہٰذا میں کوئی اور گاڑی دیکھ لوں۔ یعنی ''وہی آبلے وہی جلن کوئی سونر دل میں کمی نہیں''۔ پھر کسی لوڈر پک اَپ کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

دن چھوٹے ہو گئے ہیں جلد ہی شام ہو جاتی ہے۔ نمازِ مغرب سے چند لمحے قبل بہ مشکل گیزر واپس گھر لا کر چھت پر لے جانے، دوبارہ پانی اور گیس کے کنکشن کروانے کے مراحل سے سبکدوش ہوا۔ اس دوران تین چار بار سیڑھیاں اترتے چڑھتے اب یہ یقین اور پختہ ہونے لگا ہے کہ ''ڈیگر تے دن گیا محمد تے اوڑک نوں ڈُب جاناں'' (آنیاں جانیاں کہیں مجھے قبر تک نہ پہنچا دیں)۔

بڑھاپا بذاتِ خود بیماری ہے اور پھر ناسازیِ طبع اور کمزوری کے باعث آج کچھ زیادہ ہی تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی۔ چائے کی شدید طلب تھی لیکن مساجد سے درود و سلام کی صدائیں بلند ہونے لگیں جو اس بات کا اشارہ تھا کہ بس اذانِ مغرب ہوا چاہتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے مسجد گھر کے قریب ہی ہے۔ مسجد میں ادائیگیِ نمازِ مغرب کے بعد گھر آتے ہی بہورانی سے چائے کی ''درخواست'' کرتے ہوئے میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ چند لمحوں میں چائے لوازمات کے ساتھ حاضر تھی۔ چائے کی ٹرے تپائی پر رکھ کر بہورانی خود بھی کمرے میں رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ ''ابا جی'' کے لیے کوئی نیا ''مشن'' ابھی باقی ہے۔ میں نے چائے کے ایک دو گھونٹ لیے ایک آدھ نمک پارہ منہ میں رکھا اور بہو سے پوچھا، بیٹا! خیریت ہے نا؟

جی ابا جی سب خیریت ہے۔ آپ کو پتا ہے گڑیا کی کل سالگرہ ہے۔ وہ ضد کر رہی ہے کہ میری سالگرہ منائیں۔ اس

www.urdudigest.com

کے لیے کیک، غبارے موم بتیاں اور چند دیگر چھوٹی موٹی چیزیں لانی ہیں۔ آپ پلیز عشاء کی نماز تک لادیں تاکہ اس کے ابو کے آنے سے پہلے پہلے سب کچھ تیار ہوجائے۔ پھر سارے مل کر ''سیلی بریٹ'' کریں گے۔ گڑیا بھی خوش ہو جائے گی۔

پوتی ہوتا تو میری جان ہیں، گڑیا کی سالگرہ کا سُن کر میں بھی خوش ہوگیا۔ ماشاء اللہ پورے پانچ سال کی ہوگئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نیکیوں، ایمان اور خوشیوں والی زندگی دے۔ میں نے جلدی جلدی چائے ختم کی اور گڑیا کے لیے دعائیں دیتا ہوا مطلوبہ اشیاء لانے گھر سے نکل گیا۔

ہمیں شوقِ مطالعہ سکول کالج کے زمانے سے ہی تھا۔ پھر لکھنے کا چسکا بھی پڑ گیا لیکن ساری زندگی فکرِ معاش اور حصولِ معاش میں گزر گئی۔ دن بھر ملازمت اور پھر جز وقتی ملازمتیں بھی۔ اتنی فرصت ہی نہ مل سکی کہ اپنے کسی شوق کی تکمیل ہو سکے۔ جب بچے پڑھ لکھ کر برسرِ روزگار ہوئے تو ان کی شادیوں کی فکر دامن گیر ہوگئی۔ بیٹی سب سے بڑی تھی، وہ بیاہ کر سسرال چلی گئی تو گھر سُونا سُونا ہوگیا۔ بیٹیاں گھر میں چہکتی رہتی ہیں تو گھر میں رونق رہتی ہے۔ یہ چڑیاں اڑ کر جب سسرال چلی جاتی ہیں تو ساعتیں اس چہکار سے محروم ہوجاتی ہیں۔

آنگن اُداس ہوا تو میں نے اور بیگم نے چھت پر چڑیوں کو دانہ ڈالنا شروع کر دیا۔ بہت سی چڑیاں ہمارا دل بہلانے کو منڈیر پر آکر چہکنے لگیں۔ بڑا بیٹا ملازمت کرنے لگا تو بیگم بہو تلاش کرنے لگی۔ یکے بعد دیگرے دو بیٹوں کی شادیاں کر دیں۔ گھر میں پھر رونق ہوگئی۔ پوتی اور پوتے کی نعمت ملنے تک میں ریٹائرمنٹ کی عمر کو جا لگا۔ برسوں سے منصوبہ دل ہی دل میں پروان چڑھتا رہا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد خوب جی بھر کتابیں پڑھنی ہیں اور لکھنے کا شوق بھی پورا کرنا ہے۔ گھر میں اپنی لائبریری بھی بنانی ہے اور ساتھ ہی ساتھ جی بھر کے آرام ہی آرام کرنا ہے، وغیرہ۔

ریٹائرمنٹ کے بعد تین چار ہفتے تو خوب آرام کیا۔ گھر والے بھی خوب خاطر مدارت کرتے رہے۔ پھر بڑے چھوٹے سب ''اباجی'' کو فارغ سمجھ کر چھوٹے موٹے کسی نہ کسی کام کی ''درخواست'' کرنے لگے۔ میں بھی سدا کا مزدور بندہ گھر کا ہر کام فرض سمجھ کر کرنے لگا۔ صبح بچوں کو اسکول چھوڑنا، پھر دوپہر کو اسکول سے لانا، ناشتے کا سامان دودھ انڈے ڈبل روٹی لانا روزانہ کا معمول بن گیا۔ ناشتے کے بعد گوشت سبزی ترکاری کے لیے نکل جانا، دھوبی کو کپڑے دینا، واپس لانا، بچوں کی فیس، بجلی اور گیس کے بل جمع کروانا، گھر میں کچھ خراب ہو جائے۔ پانی کی موٹر پنکھا، بجلی کا سوئچ یا ساکٹ سب درست اور مرمت کروانا میری ذمہ داری بن گیا۔ حتیٰ کہ فیوز بلب بدلنے اور پنکھوں کی صفائی تک میں اپنے ہاتھ سے کرنے لگا۔

یوں رفتہ رفتہ سارے چھوٹے بڑے کام میرے ذمے لگتے چلے گئے۔ بڑے چاؤ سے کوئی کتاب اٹھا کر ورق گردانی شروع کی۔ ابھی چند صفحے ہی دیکھے تھے کہ کبھی بیگم کی طرف سے کبھی بچوں یا بہو کی طرف سے کوئی ''درخواست'' آ گئی، سُنیے یہ چھوٹا سا کام کر دیں، ابو جی! پلیز یہ کر دیں۔ یہ چیز بازار سے لادیں۔ وہاں جانا ہے ذرا ساتھ چلیں، وغیرہ وغیرہ۔ یہاں تک کہ میں نے خود بھی ہاتھ بٹانے کی نیت سے دھلے کپڑے سوکھنے کے لیے رسی پر پھیلانے کا مزہ بھی لوٹا۔

کبھی کوئی مضمون یا کہانی لکھنا شروع کی تو عین اس وقت کوئی نہ کوئی مصروفیت نکل آئی۔ کاغذ قلم ایک طرف رکھ کر اس کام میں جُت گیا۔ ذہن میں کہانی کے جو کردار پلاٹ سوچے تھے، وہ سب غائب ہوگئے، یا اِدھر کوئی مصرع موزوں ہوا اُدھر کسی نے کوئی فرمائش کر دی۔ اب نہ قافیہ یاد رہا نہ ردیف۔ سوچتا ہوں یہ جو ہیر رانجھا، یا لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد کے عشق کی داستانیں ہیں تو شاید اس میں عشق کا اتنا عمل دخل نہ تھا، اصل بات یہ تھی کہ لوگوں کو فرصت تھی۔

ہم نے تو صرف ''کتاب'' سے محبت کی مگر ہمیشہ اس کو

ہجر کا موسم ہی نصیب ہوا۔ کہاں کا شوق اور کہاں کا لکھنا پڑھنا؟ ریٹائرمنٹ کے تین سال بعد اب زندگی پھر اتنی ہی دشوار اور مصروف ہے جتنی دورانِ ملازمت تھی۔ وہی دن رات کو ہلو کے بیل کی طرح صبح شام ایک ہی دائرے میں گھومنا۔ ایک دن چند ریٹائرڈ ''بابوں'' کی مجلس جمی ہوئی تھی۔ میں بھی بیٹھا تھا۔ سب اپنے اپنے دکھڑے سنا رہے تھے۔ اندازہ ہوا اب یہ تقریباً ہر گھر کی کہانی ہے۔ ریٹائرڈ ''اباجی'' تو پنا تنخواہ کے گھر بھر کی ایسی ''نوکری'' میں آجاتے ہیں جہاں نہ ڈیوٹی شروع ہونے کا وقت مقرر ہے اور نہ چھٹی کی گھنٹی بجتی ہے۔ نوکری بھی ایسی کہ اب نہ ریٹائرمنٹ ہے نہ کوئی پنشن کی اُمید۔

بیکری سے سالگرہ کے لیے کیک، ایک جگہ سے موم بتیاں، غبارے اور سجاوٹ کا دیگر سامان لیا۔ خور و نوش کی دیگر اشیاء ایک الگ سٹور سے خرید کر گھر آیا تو بیگم صاحبہ بھی عیادت کا ثواب کما کر تشریف لا چکی تھیں۔ تبھی عشاء کی اذانیں ہونے لگیں۔ بہو کو سارا سامان تھمایا اور وضو کر کے نماز کے لیے نکلنے لگا تو بیگم نے یاد دلایا کہ جو کمبل گزشتہ ہفتے ڈرائی کلین کے لیے دیا تھا، وہ لیتا آؤں۔ کہیں وہ گم ہی نہ کر دے۔ یہ فرمانِ شاہی سُن کر ایک بار تو میٹر گھوم گیا، لیکن یہ وقت دماغ کو ٹھنڈا رکھنے کا تھا۔ بیگم صاحبہ سے کچھ کہتا تو ایک نیا ٹاک شو شروع ہوجاتا۔ جماعت کھڑی ہونے میں وقت بہت قلیل رہ گیا تھا، لہٰذا میں کان اور مفلر لپیٹ کر گھر سے نکل گیا۔

ڈرائی کلین والے خلیل صاحب کسی تیرہ چودہ سالہ لڑکے کو دکان کے کاؤنٹر پر کھڑا کر کے کہیں ضروری کام سے گئے ہوئے تھے۔ لڑکے کو پرچی دکھانے کے باوجود کمبل نہ ملا تو اس نے کہا کہ تھوڑا انتظار کرلیں، بس خلیل صاحب آنے ہی والے ہیں۔ دن بھر کی بھاگ دوڑ سے اس قدر تھکاوٹ ہوگئی تھی کہ اب ایک لمحہ بھی یہاں رُکنا دشوار تھا لیکن دوسرے چکر اور بیگم کی ٹکر سے بچنے کے لیے انتظار کرنا ہی مناسب سمجھا۔

کوئی آدھ گھنٹہ انتظار کے بعد خلیل صاحب تشریف لائے اور میں کمبل لے کر گھر پہنچا تو نو بج چکے تھے۔ بچوں نے سالگرہ کی تقریب کا ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ ہم بوڑھوں کی خوشیاں بچوں کی خوشی سے وابستہ ہیں۔ میں بھی ''پیپی برتھ ڈے'' کی تالیاں بجاتا اس ہنگامے میں شامل ہوگیا۔ بچوں نے والدین کے ساتھ مل کر خوب ہلا گلا کیا۔ رات ساڑھے دس بجے تک یہ تقریب جاری رہی۔ میں یکان کے باعث ایک صوفے میں دھنسا بچوں کو خوش ہوتے دیکھ کر خوش ہوتا رہا۔ اس وقت ہلکا ہلکا بخار بھی محسوس ہو رہا تھا۔ میں اٹھنا ہی چاہتا تھا کہ اسلام آباد سے بیٹی کا فون آ گیا۔

اس نے سلام دعا کے بعد کہا کہ بھابھی سے بات کروا دیں۔ میں نے فون بہو کی طرف بڑھا دیا۔ وہ برتن سمیٹنے میں مصروف تھی، لہٰذا اس نے فون کا سپیکر آن کر کے قریب میز پر رکھ لیا اور گڑیا کی سالگرہ کی مبارک باد وصول کرنے لگی۔ گڑیا کی ''پھوپھو'' بہت خوش تھی۔ اس کی آواز مجھ تک بھی آ رہی تھی۔ گڑیا کو مبارک باد اور دعائیں دینے کے بعد اس نے فرداً فرداً سب کا حال احوال پوچھا۔ اپنی ماں اور بھائیوں کی خیریت دریافت کی۔ امی کی صحت کے متعلق تشویش کا اظہار کیا اور اپنی بھابھی کو ان کا خیال رکھنے کی تاکید کی۔ آخر میں پوچھا، ''اباجی کا کیا حال ہے؟''

بہو کا جواب تھا! ''اباجی بھی ٹھیک ٹھاک ہیں۔''

اُدھر سے پوچھا گیا:

''کیا کرتے رہتے ہیں سارا دن؟''

جواب دیا گیا:

''کچھ نہیں! بس فارغ ہی ہوتے ہیں۔'' ◆◆◆

ایک بدلحاظ بیٹا اور دوسرا بے حس بھائی، کیسے مکافاتِ عمل کا شکار ہوئے، پڑھیے ''نافرمان اولاد'' صفحہ نمبر ۲۱۵ پر

www.urdugem.com

سید قاسم محمود

ہندوستان کا پہلا مسلمان حکمران

جس کے انسان دوست اقدامات اور رواداری نے طاقتور برہمنوں کو بھی اس کا گرویدہ بنا دیا

ایک دلچسپ تاریخی داستان

پچھلی قسط کا خلاصہ

ہندوستان میں مالابار کے ایک ہندو راجا نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا۔ بعد ازاں خلفائے راشدین کے زمانے میں ہندوستان میں اسلام کی اشاعت ہوئی۔ ساتویں صدی میں سندھی راجا داہر نے مسلمانوں کے بحری جہازوں پر قبضہ کرلیا۔ چناں چہ اس کی سرکوبی کے لیے اموی دربار سے محمد بن قاسم کو سندھ بھجوایا گیا۔ وہ پے در پے سندھی شہر فتح کرتے راجا داہر کی فوج کے قریب پہنچ گئے۔

اب آگے پڑھیے...

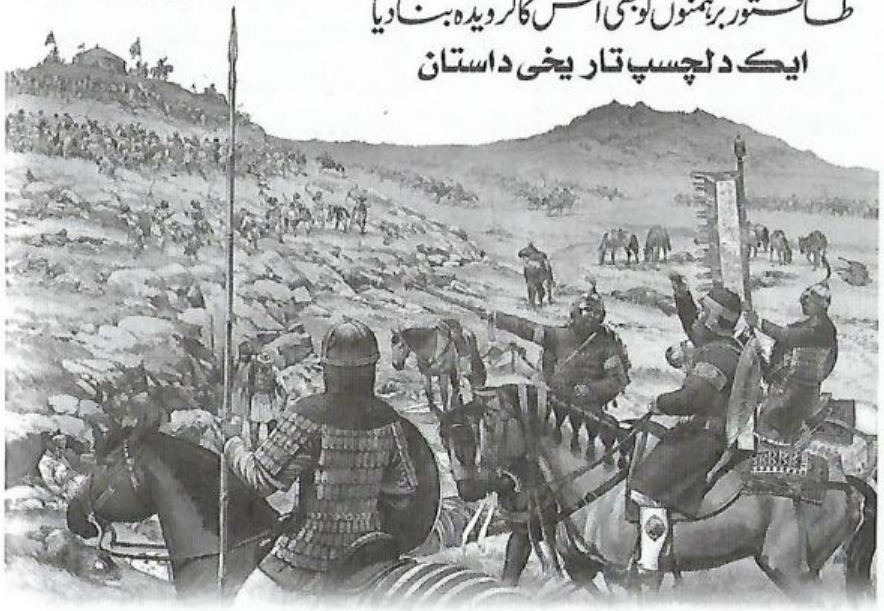

محمد بن قاسم دریائے سندھ عبور کرنے کی تدبیریں سوچنے لگے۔ بہت غور کے بعد محمد بن قاسم نے ایک لشکری موکو بن وسایو کو کشتیوں کے فراہم کرنے پر مامور کیا۔ جب کشتیاں جمع ہوگئیں تو یہ تدبیر عمل میں لائی گئی کہ دریا کے مغربی کنارے سے متصل پانی میں کشتیوں کو ایک دوسرے سے باندھ کر ایک قطار بنائی گئی۔ اس طرح کشتیوں کا ایک پل قائم ہوگیا۔ اس پل پر سے محمد بن قاسم کی پوری فوج صحیح و سلامت مشرقی کنارے پر اُتر گئی۔ صرف ایک سپاہی تراب نامی جو بنی حنظلہ سے تھا، پل سے گزرتے ہوئے دریا میں گر کر شہید ہوا۔

محمد بن قاسم کا اعلان

دریا عبور کرنے کے بعد محمد بن قاسم نے اپنے لشکر کے سامنے ایک تقریر کی جس میں کہا:

''مجاہدو! دریائے سندھ تمہارے پیچھے ہے اور دشمن کی فوج تمہارے سامنے، جس سے عنقریب ہمارا مقابلہ ہوگا، اس لیے جو تم میں واپس جانا چاہتا ہے، ابھی چلا جائے، اس سے پہلے کہ دشمن سے ہمارا مقابلہ ہو، کیونکہ اگر عین جنگ میں کوئی بھاگا تو وہ ہمارے بہادروں کو بددل بنائے گا''۔

اس ولولہ انگیز تقریر کے بعد پورے لشکر میں سے سوائے تین آدمیوں کے کوئی بھی واپس جانے کے لیے تیار نہ ہوا۔ ان تینوں میں سے ایک نے محمد بن قاسم سے کہا، میری ایک لڑکی ہے اور اس کا پرورش کرنے والا میرے سوا کوئی نہیں، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ واپس چلا جاؤں۔ دوسرے نے کہا، میری ماں بوڑھی ہے اور میرا کوئی ایسا قریبی عزیز نہیں جو اس کی دیکھ بھال کر سکے۔ تیسرے نے کہا، مجھ پر بے حد قرض ہے اور میرا کوئی رشتہ دار ایسا نہیں جو اس کو ادا کردے۔ محمد بن قاسم نے ان تینوں کو واپس جانے کی اجازت دے دی۔

آخری جنگ

۱۰ رمضان جمعرات کے دن ۹۳ ھ کو محمد بن قاسم اور داہر کے درمیان جنگ شروع ہوئی۔ راجا بڑی شان و شوکت سے میدان میں آیا، اس کے ساتھ اس کا بیٹا جے سینہ بھی تھا، جو فوج کے درمیان تھا۔ دس ہزار بہادر اس کے گرد و پیش تھے جو سر تا پا لوہے میں غرق تھے۔ ان میں سے بعض ایسے بھی تھے کہ ان کے بال لٹکے ہوئے تھے اور وہ تلواریں کھینچے ہوئے تھے۔ بعض ایسے تھے کہ ان کے بال بندھے ہوئے تھے اور ان کے ہاتھوں میں تلواریں اور ڈھالیں تھیں۔ اس شان سے یہ لوگ مسلمان فوج کے مقابلے میں آئے۔

معصومی کا بیان ہے کہ داہر کی فوج کے آگے جنگی ہاتھی تھے۔ ان کے بعد دس ہزار سوار زرہ پوش تھے، پھر تیس ہزار پیادے ہتھیاروں سے لیس تھے۔ لشکر کے وسط میں راجا داہر سفید ہاتھی پر سوار تھا۔ راجا کے ہاتھی کو بڑے بڑے سردار اور امیر گھیرے ہوئے تھے۔ داہر ہاتھی پر عماری میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ دو نہایت خوبصورت کنیزیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک داہر کو شراب کے جام دیتی اور دوسری تھوڑی دیر سے پان کے بیڑے کھلاتی جاتی تھی۔

دونوں فوجوں میں سخت جنگ شروع ہوئی۔ اسلامی فوجیں اللہ اکبر کا نعرہ بلند کرتی ہوئی آگے بڑھیں اور اس زور و شور سے لڑیں کہ داہر کی فوج بھاگ کھڑی ہوئی اور گڑبڑ میں ان کی صفیں متزلزل ہوگئیں۔ محمد بن قاسم نے اپنی فوج کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا، مسلمانو! بڑھتے چلے جاؤ، کیونکہ کافروں کی فوج اب منتشر ہوچکی۔ محمد بن قاسم کے ان جملوں نے اسلامی فوج کے حوصلے اور بڑھا دیے اور مسلمان اس بہادری سے لڑے کہ کشتوں کے پشتے لگا دیے۔

داہر نے یہ رنگ دیکھا تو وہ اپنے سفید ہاتھی پر سوار ہوکر

www.urdugem.com

چار سو سواروں کو لیے جو تلواریں، ڈھالیں اور نیزے لیے ہوئے تھے، میدان جنگ میں نکلا۔ راجا داہر کے ہاتھ میں ایک چکر تھا، جس میں تیز چاقو لگے ہوئے تھے، جس کو وہ گھماتا تھا۔ جو بھی اس کے قریب آتا تھا، فوراً ہی اس کا سر تن سے جدا ہو جاتا۔ داہر اور اس کے ساتھی آخری جنگ بہادری سے لڑ رہے تھے۔ کبھی کبھی داہر اسلامی فوج کو روندنے کے لیے اپنے ہاتھی کو اسلامی فوج کی طرف بڑھاتا، اس کا یہ عمل نہایت خطرناک تھا۔

شجاع حبشی کی قسم

محمد بن قاسم کی فوج میں ایک سپاہی تھا شجاع حبشی جو نہایت دلیر اور بہادر تھا۔ اس نے یہ رنگ دیکھا تو محمد بن قاسم کے پاس آیا اور قسم کھائی کہ میں اس وقت تک کھاؤں گا نہ پیوں گا جب تک کہ میں داہر کا مقابلہ کر کے اس کے ہاتھی کو زخمی نہ کرلوں گا میں اس سے لڑتا رہوں گا، یہاں تک کہ اس کا سر کاٹ کر لاؤں یا پھر وہیں شہید ہو جاؤں۔

یہ کہہ کر شجاع جو ایک سیاہ گھوڑے پر سوار تھا، بجلی کی طرح دشمن کی فوج میں گھس کر داہر کے ہاتھی کے قریب پہنچ گیا۔ داہر نے شجاع کو آتے ہوئے دیکھا تو اس کے روندنے کے لیے ہاتھی بڑھایا۔ شجاع نے بھی اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور ہاتھی کے سامنے لایا۔ گھوڑا ہاتھی کو دیکھ کر

راجا داہر کے دور میں سندھ کے بڑے شہر

ایک طرف مڑنے لگا۔ شجاع نے فوراً ہی اپنے سر سے پگڑی اتار کر گھوڑے کی آنکھوں پر باندھ دی، تاکہ وہ ہاتھی کی دہشت سے نہ بھاگے، پھر اس نے اپنے گھوڑے کو ہاتھی کی طرف بڑھایا اور ایک تلوار کا وار ہاتھی کی سونڈ پر کیا، جس سے ہاتھی زخمی ہو گیا۔ داہر نے بھی ایک دو شاخہ تیر تاک کر اپنی پوری طاقت و قوت سے شجاع پر چلایا، جو شجاع کی گردن میں لگا اور یہ مجاہد شہید ہو گیا۔

گھمسان کی لڑائی

شجاع حبشی کی شہادت سے داہر کی فوج کے حوصلے بلند ہو گئے اور چاروں طرف سے انھوں نے اسلامی فوج پر حملہ کر دیا، یہ حملہ اس قدر سخت تھا کہ اسلامی فوج متزلزل ہو گئی اور ان کی صفیں درہم برہم ہو گئیں۔ داہر کی فوج کو گمان ہو گیا کہ مسلمانوں کو شکست ہو گئی اور ان میں دہشت پھیل چکی۔ اسلامی فوج کا یہ حال دیکھ کر محمد بن قاسم سخت پریشان ہوئے، انھوں نے پانی پلانے والے سے کہا کہ مجھے تھوڑا سا پانی دو۔ محمد بن قاسم کی پریشانی کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے بجائے پانی پلا کہنے کے، پانی کھلا کہا اور پھر فوراً ہی میدان جنگ میں آ کر للکار کر کہا:

”اے اہل عرب! میں تمہارا سپہ سالار محمد بن قاسم موجود ہوں، تم کہاں بھاگے جا رہے ہو، ڈھالیں اٹھاؤ اور حملہ کرو، تاکہ دشمن کو شکست ہو اور تمہیں دشمن پر فتح حاصل ہو“۔

محمد بن قاسم کے ان جملوں نے اسلامی فوج کو پھر یک جا کر دیا۔ اب موکو بن وسایو بھی ان کے سامنے آیا اور اپنے لشکر کے ساتھ حکم کا منتظر ہو کر کھڑا ہو گیا۔

محمد بن قاسم نے اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر حملے کا حکم دیا۔ داہر کی فوج بھی اپنی جگہ مضبوط کھڑی رہی۔ گھمسان کی لڑائی شروع ہوئی، تلواروں کے شعلے آسمانوں میں بلند ہوئے اور تلواریں اور نیزے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرانے لگے۔ داہر کی فوج پوری قوت سے لڑ رہی تھی اور مسلمان بھی جذبۂ جہاد سے سرشار ہو کر ان کی صفیں الٹ رہے تھے۔ دن ڈھل رہا تھا، داہر کی فوج لڑتے لڑتے تھک کر چور ہو چکی تھی۔

یکا یک داہر نے اسلامی فوج کی طرف اپنا ہاتھی بڑھایا۔ محمد بن قاسم نے منجنیق اندازوں کو حکم دیا کہ وہ اپنی منجنیقیں چلائیں۔ ادھر مسلمان تیر اندازوں نے آگ کے تیر داہر کے سفید ہاتھی پر برسانے شروع کیے۔ ایک تیر انداز نے تاک کر ایسا تیر پھینکا کہ راجا کی عماری میں آگ لگ گئی اور ہاتھی گھبرا کر قریب کی ایک جھیل میں جا گھسا اور بیٹھ گیا۔ ہر چند فیل بان نے کوشش کی کہ ہاتھی جھیل سے باہر نکل آئے مگر وہ نہ نکلتا تھا۔

داہر کے حفاظتی دستوں نے یہ حال دیکھا تو بعض پانی میں کود پڑے اور بعض جھیل کے کنارے پر کھڑے رہے۔ پانی پینے کے بعد ہاتھی خود بخود کھڑا ہو گیا۔ داہر نے قلعے کی طرف جانا چاہا، لیکن مسلمانوں نے تیروں کی بارش شروع کر دی، راجا اور ہاتھی تیروں سے زخمی ہو گئے۔

داہر کا انجام

داہر نے دیکھا کہ لڑائی جاری ہے، اس کے بہت سے عزیز، رشتے دار اور ساتھی لڑائی میں مارے جا چکے۔ اس منظر کو دیکھ کر اس کے دل میں ایک جوش پیدا ہوا اور پاپیادہ بڑی بہادری سے میدان میں لڑتا رہا۔ سورج غروب ہو رہا تھا کہ ایک عرب نے اس کے سر پر زور سے تلوار ماری۔ وہ سر سے گردن تک اتر گئی۔

مدائنی کی روایت ہے کہ داہر کو قبیلہ بنی کلاب کے کسی شخص نے قتل کیا تھا۔ ابن کلبی کی روایت ہے کہ داہر کو قبیلہ طے کے قاسم بن ثعلبہ بن عبداللہ بن حصن نے قتل کیا تھا۔ داہر کے قتل کے بعد برہمنوں نے اس کی لاش کو کیچڑ میں چھپا دیا اور مسلمان قلعے میں فاتحانہ داخل ہو گئے، یہ فتح جمعرات

www.urdugam.com

کے دن ۱۰ رمضان ۹۳ھ (۷۱۲ء) کو حاصل ہوئی۔

رانی لاڈی کے متعلق مختلف روایتیں

راجا داہر کی رانی لاڈی کے متعلق ''چچ نامہ'' میں دو روایتیں ملتی ہیں۔ ایک روایت تو یہ ہے کہ راجا داہر کے قتل کے بعد اس کی رانی لاڈی برہمن آباد میں ہی مقیم ہو گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ آخر وقت تک مسلمانوں کا مقابلہ کرے گی اور اگر ناکامی ہوئی تو وہ آخر میں ستی ہو جائے گی۔ چنانچہ اس نے برہمن آباد کے قیام کے زمانے میں اپنے خرچ سے ایک چھوٹی سی فوج تیار کی تھی، جو قلعے کے ایک دروازے پر متعین تھی۔

جب مسلمان فوجیں اچانک قلعے میں داخل ہوئیں تو لاڈی کو خبر بھی نہ ہو پائی اور وہ دوسرے قیدیوں کی طرح گرفتار ہو کر محمد بن قاسم کے پاس پیش ہوئی۔ انھیں جب یہ معلوم ہوا کہ یہ داہر کی بیوی ہے تو انھوں نے حکم دیا کہ اس کو پردے میں نہایت عزت و احترام سے دوسرے قیدیوں سے الگ رکھا جائے۔

دوسری روایت ہے کہ برہمن آباد کے فتح ہونے کے بعد محمد بن قاسم نے حکم دیا کہ راجا داہر کے رشتے داروں کو تلاش کیا جائے، مگر ان کا کچھ پتا نہ چلا، وہ اسی فکر میں تھے کہ دوسرے دن برہمنوں کا ایک وفد جو ایک ہزار افراد پر مشتمل تھا، محمد بن قاسم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جب یہ وفد آیا تو انھوں نے اس کی ہیبت کو دیکھ کر پوچھا کہ تم لوگ کس فوج سے تعلق رکھتے ہو؟ ان لوگوں نے جواب دیا کہ اے امیر! ہمارا تعلق کسی فوج سے نہیں۔ ہم برہمن ہیں، ہم اس راجا کے ملازم تھے۔ اب وہ مارا گیا ہے اور یہ مملکت

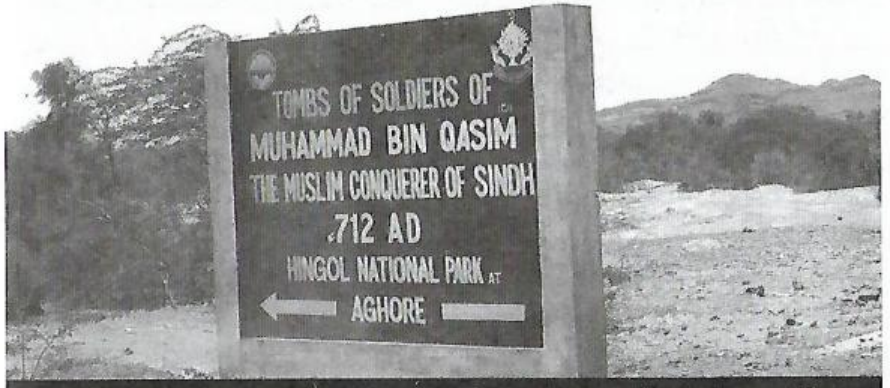

ہنگول نیشنل پارک (بلوچستان) میں محمد بن قاسم کے لشکریوں کی قبریں موجود ہیں

آپ کی تحویل میں آئی ہے۔ ہم میں سے بعض نے تو وفاداری کے طور پر اپنے کو ہلاک کر لیا اور ہم اس لیے حاضر ہوئے ہیں کہ اب آپ اس ملک کے حاکم ہوئے ہیں۔ آپ کو سلام کریں اور یہ بھی جاننا چاہتے ہیں کہ آپ کا ہمارے متعلق کیا فیصلہ ہے؟

محمد بن قاسم نے کہا، میں تم کو اس شرط پر امان دیتا ہوں کہ تم داہر کے رشتے داروں کو جہاں کہیں بھی وہ موجود ہوں، لا کر حاضر کرو۔ چنانچہ وعدہ معافی کے بعد ان برہمنوں نے داہر کی رانی لاڈی کو لا کر محمد بن قاسم کے سامنے حاضر کر

دیا۔ انھوں نے حجاج اور خلیفہ ولید بن عبدالملک کی اجازت کے بعد رانی لاڈی کو آزاد کر کے اس سے شادی کر لی۔ لیکن ہماری رائے میں شادی کی روایت ایک افسانے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی، کیونکہ عرب مورخین نے مطلقاً اس کا تذکرہ نہیں کیا، بلکہ تاریخ بلاذری میں بصراحت موجود ہے کہ محمد بن قاسم نے راوڑ بزور بازو فتح کیا۔ وہیں داہر کی بیوی موجود تھی۔ وہ گرفتاری کے خوف سے مع اپنی لونڈیوں اور سامان کے جل مری۔

محمد بن قاسم کی شادی

اب سوال یہ ہے کہ محمد بن قاسم نے کہاں شادی کی تھی، کیونکہ اس کے دو بیٹے، عمرو اور قاسم تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ عمرو سندھ کا گورنر اور مشہور شہر منصورہ کا بانی تھا۔ اس کا بھائی قاسم پورے پندرہ سال بصرے کا گورنر رہا، وہ بڑا قابل اور عام و خاص میں مقبول حاکم تھا۔ مشہور رجز گو شاعر روبہ بن الحجاج نے اس کی مدح میں قصیدے کہے۔ چند اشعار کا ترجمہ یہ ہے:

''میں اس گروہ میں سے ہوں کہ جو ہر مصیبت کے دن تیرے دشمنوں کے خلاف صف آرا اور تیرا معاون ہے اور وہ گروہ ''سعد بن زید'' کے قبیلے کے شیر مردوں کا ہے، جو تیرے خاندان کے ننھیالی عزیز اور اعلیٰ شان اور بلند مرتبے کے لوگ ہیں''۔

ان متذکرہ بالا اشعار سے دو باتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں، ایک تو یہ کہ اس شاعر نے سعد بن زید کے قبیلے کا ذکر کیا ہے، جس قبیلے کا وہ خود بھی ایک فرد ہے، کیونکہ روبہ بن الحجاج قبیلہ بنو تمیم کی ایک بڑی شاخ ''بنو سعد بن مالک بن سعد بن زید منات بن تمیم'' سے تھا۔ قبیلہ سعد بن زید منات اسی بڑی شاخ کی ایک شاخ تھا، جسے شاعر نے اختصار کے طور پر صرف ''سعد بن زید'' لکھا ہے۔

دوسری قابل غور بات یہ کہ اس قبیلے کے لوگ اس کے ممدوح قاسم کے خاندان کے ننھیالی عزیز ہیں، اس کے اصل الفاظ ''اخوال ابانک'' ہیں یعنی ''تیرے اجداد کے ننھالی'' جس کا مطلب یہ ہوا کہ قاسم کے باپ محمد بن قاسم اور اس کے آباؤ اجداد کے ننھیالی ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ محمد بن قاسم کے بزرگوں کی شادیاں بن تمیم کے اسی گھرانے یا خاندان میں ہوئی تھیں اور اسی رسم کے مطابق غالباً خود محمد بن قاسم کی شادی بھی اسی خاندان یا قبیلے میں ہوئی ہوگی۔

واقعہ بھی یہی ہے کیونکہ مشہور محقق اور ادیب خطیب تبریزی روبہ کے مذکورہ رجزیہ قصیدے کے ۱۹۵ اور ۱۹۶ نمبر کے مصرعوں کی تشریح کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ، ابو محمد نے کہا ہے کہ میں نے شاعر روبہ کے ''س'' کے قافیہ والے قصیدے کا ایک مصرع دیکھا ہے جس سے اس کی مراد یہ کہ محمد بن قاسم کی ننھیال بنی سعد بن تمیم سے ہے۔ ان تمام حوالوں اور وضاحت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ محمد بن قاسم کی ننھیال قبیلہ بنی تمیم کی ایک شاخ قبیلہ بن سعد سے تھی اور محمد بن قاسم نے بنو تمیم کے اسی خاندان میں شادی کی تھی۔

برہمن آباد کا انتظام

برہمن آباد فتح کے بعد محمد بن قاسم نے اعلان کیا کہ جو لوگ بخوشی مسلمان ہو گئے ہیں ان کے حقوق عرب مسلمانوں کے مساوی ہوں گے اور وہ غلامی اور جزیئے سے مستثنیٰ ہوں گے اور جو لوگ اپنے مذہب پر رہیں گے، ان پر مذہب کے معاملے میں کوئی زبردستی نہ کی جائے گی، لیکن ان کو جزیہ دینا پڑے گا، جس کی شرح یہ ہوگی:

[۱] امیر اور دولت مندوں سے فی کس ۴۸۰ درہم یعنی تقریباً تیرہ روپے سالانہ۔

[۲] درمیانی اور متوسط درجے کے لوگوں سے فی کس ۲۴ درہم یعنی چھ روپے سالانہ۔

www.urdudigest.com

۳ غریب لوگوں سے فی کس ۱۲ درہم یعنی تین روپے سالانہ۔

اس اعلان کے بعد کچھ لوگوں نے بخوشی ورضامندی اسلام قبول کرلیا اور کچھ لوگ اپنے آبائی مذہب پر قائم رہے، جو لوگ اپنے مذہب پر قائم رہے، ان کے ساتھ بھی نہایت اچھا سلوک کیا گیا اور ان کے مال واسباب میں سے کوئی چیز زبردستی نہیں لی گئی۔

ان کے ساتھ یہ بھی رعایت کی گئی کہ برہمنوں کو جو سابقہ حکومت کی طرف سے حقوق حاصل تھے۔ ان کو اسی طرح باقی رکھا گیا۔ مندروں کے لیے جو جائیدادیں چلی آتی تھیں ان میں بھی کوئی دخل نہیں دیا گیا۔ اس کے علاوہ سرکاری مال گزاری میں سے برہمنوں کے وظیفے مقرر کیے گئے۔

شہر کے ان تاجروں، کسانوں، پیشہ وروں اور شہریوں میں جن کا مال جنگ میں لٹ گیا تھا اور جن کی تعداد تقریباً دس ہزار تھی، ایک لاکھ بیس ہزار درہم تقسیم کیے گئے تاکہ وہ اپنی حالت درست کر کے اچھے شہریوں کی طرح اپنی زندگی بسر کرسکیں۔

راجہ چچ کے زمانے میں جو لوگ جن عہدوں پر تھے، ان کو برقرار رکھا گیا۔ برہمنوں کو بلا کر محمد بن قاسم نے کہا کہ داہر کے زمانے میں تم معقول عہدوں پر فائز تھے، اس لیے تم شہر کے ہر اچھے اور برے آدمی کو جانتے ہو، اگر کچھ شریف لوگ تمہاری نظر میں ایسے ہوں جو ہماری امداد کے مستحق ہوں تو ہمیں بتلاؤ تاکہ ان کی امداد کی جاسکے۔

قلعے کا انتظام یہ کیا کہ چاروں دروازوں پر جو فوجی دستے مقرر کیے گئے۔ ان میں ہر دستے کا فوجی افسر برہمن تھا۔ ان افسروں کو یہ عزت بخشی گئی کہ ایک گھوڑا اور خلعت ان کو دیا گیا اور سندھی رواج کے مطابق ان کے ہاتھوں اور پاؤں میں سونے کے کڑے پہنائے گئے اور ہر ایک کو دربار میں کرسی دی گئی۔

ہر عہدے دار کو محمد بن قاسم نے حکم دیا کہ تمہارا سب سے بڑا فرض یہ ہوگا کہ رعایا اور حکومت کے درمیان اچھے تعلقات پیدا کرو اور اگر یہ تعلقات خوشگوار بنانے میں کوئی حائل ہو تو حکومت ان مفسدین کے مقابلے میں تمہاری پوری مدد کرے گی۔

مال گزاری وصول کرنے پر جو برہمن مقرر کیے، انھیں نصیحت کی کہ مال گزاری وصول کرنے میں رعایا پر ظلم و زیادتی نہ کرنا۔ اتنا محصول، لگان یا جزیہ (ٹیکس) کسی پر نہ لگانا جو اس کی استطاعت سے باہر ہو، رعایا کی بھلائی کے لیے جو کچھ تم سوچو اس کی حکومت کو اطلاع دو تاکہ ان پر عمل کیا جاسکے۔

محمد بن قاسم کے اس سلوک اور برتاؤ سے سارے شہر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ہر ایک برہمن کی زبان پر اسلامی حکومت کی تعریف تھی۔ کل تک جو برہمن اسلامی حکومت کے دشمن تھے۔ وہ گاؤں گاؤں پہنچ کر لوگوں سے کہتے تھے:

”اے معزز اور مشہور لوگو! تم سب جانتے ہو کہ داہر مارا گیا ہے اور کافروں کا دور بالکل ختم ہو چکا، اب تمام ملک خواہ سندھ ہو یا ہند پورے طور پر عربوں کے ہاتھ میں ہے۔ ان کے نزدیک بڑا، چھوٹا، شہری اور دیہاتی سب برابر ہیں، اب جو کچھ بھی ہم کریں گے اسے بادشاہ کی طرف سے جاننا چاہیے۔ ہمیں تمہارے پاس بھیجا گیا ہے اور ہم سے شاندار وعدے کیے گئے ہیں۔ اگر ہم عربوں کی اطاعت نہ کریں گے تو ہم سخت نقصان میں رہیں گے۔

”ہم اپنی سابقہ پوزیشن اور عزت ان کی اطاعت ہی سے حاصل کرسکتے ہیں۔ اگر یہ جزیہ جو تم پر عائد کیا گیا ہے، اسے گراں باری سمجھتے ہو تو پھر ہندوستان کے کسی ایسے

علاقے میں چلے جاؤ، جہاں تمہارے دل کو اطمینان حاصل ہو، کیونکہ انسان کے لیے جان کی سلامتی سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں، جزیے کے ادا کرنے ہی سے ہمارا مال اور اہل و عیال محفوظ ہوں گے“۔

برہمنوں کی یہ باتیں سن کر لوگ دیہات سے برہمن آباد آتے اور ضروری باتیں معلوم کر کے جاتے۔ جو معزز لوگ اطراف واکناف سے محمد بن قاسم کے پاس آتے وہ ان کو اسلامی حکومت کی خوبیاں سمجھاتے اور ان سے کہتے کہ تم ہر طرح سے مطمئن رہو اور ہمارے متعلق کسی قسم کا برا خیال دل میں نہ لاؤ اور تمہاری بات سنی جائے گی اور تمہارا مشورہ قبول کیا جائے گا۔

برہمن آباد کا مندر

محمد بن قاسم کی رواداریوں کا اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ ایک روز برہمن آباد کے مندر کے پجاری ان کے پاس آئے اور کہا اے امیر! ہم مندر کے پجاری ہیں، ہم لوگوں کا گزارہ پوجا پاٹ پر ہے، لیکن جب سے شہر پر آپ کا قبضہ ہوا ہے، لوگ اس قدر خوف زدہ ہو گئے ہیں کہ انھوں نے ڈر وخوف سے مندر میں پوجا کے لیے آنا چھوڑ دیا ہے۔ اب ہم بھوکوں مر رہے ہیں، اب جب کہ ان لوگوں نے جزیہ دینا منظور کرلیا ہے تو انھیں مندر میں پوجا کی اجازت دی جائے۔

محمد بن قاسم برہمنوں کی بات سن کر خاموش ہو گئے، کیونکہ اسلام میں بتوں کی پرستش حرام ہے۔ انھوں نے یہ تمام معاملہ حجاج بن یوسف کو لکھ کر مشورہ طلب کیا۔ چند دن بعد حجاج کا حسب ذیل جواب آیا:

”تمہارا خط ملا، برہمن آباد کے پجاریوں نے جو تم سے مندر کے آباد کرنے اور مذہبی معاملات میں نرمی اختیار کرنے کی استدعا کی ہے، تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جب وہ لوگ اپنے مذہب پر قائم رہ کر جزیہ دیتے ہیں تو پھر ان کے مذہبی معاملات میں دخل نہ دینا چاہیے۔ تم انھیں اجازت دو کہ وہ اپنے طریقے پر اپنے مذہبی مراسم ادا کریں اور کسی کو اس کے طریقہ عبادت سے روکنے کی ضرورت نہیں۔ ان کی جان و مال کی حفاظت ہمارا فرض ہے۔ اس کا خیال رکھو کہ ان کی جان و مال کو کوئی نقصان نہ پہنچنے پائے، تاکہ وہ اپنے گھروں میں مطمئن اور خوش حال زندگی بسر کریں“۔

حجاج بن یوسف کا جب یہ خط محمد بن قاسم کو ملا، انھوں نے شہر کے معززین اور برہمنوں کو بلا کر کہا کہ تم اپنے مندر میں آزادی سے اپنے طریقے پر پوجا پاٹ کرسکتے ہو۔ حکومت کی طرف سے کسی کو اس کی عبادت سے نہیں روکا جاتا۔ تم لوگ جو اپنے مندر کی خدمت کرتے تھے اور پجاریوں کو نذر و نیاز دیتے تھے، حسب دستور اب بھی دیتے رہو۔ آپس میں میل ملاپ رکھو اور مسلمانوں کے ساتھ مل کر رہو۔ پھر ان عہدے داروں کو جو سرکاری محصول وصول کرنے پر مقرر تھے، حکم دیا کہ خراج میں سے تین فیصد الگ کر کے ان برہمنوں کو دیں جو امداد کے مستحق ہیں۔

افسروں اور سرداروں کے وظائف مقرر کیے۔ محمد بن قاسم نے یہ تمام انتظامات تمیم بن زید القینی اور حکم بن عوانہ کلبی کے ذریعے سے لوگوں کی خواہش کے مطابق کیے، یہ بھی طے کیا کہ برہمن آزادی سے لوگوں کے گھروں پر جا کر اپنی کشکول کے ساتھ خیرات مانگ سکتے ہیں اور اس اناج کو جو وہ اس طرح حاصل کریں، جس مصرف میں چاہیں خرچ کر سکتے ہیں۔

محمد بن قاسم کی معزولی

افسوس کہ محمد بن قاسم جیسے بہادر اور فاتح و منتظم نوجوان کو بنوامیہ کی گروہی عصبیت اور منتقم مزاجی نے بہت جلد ضائع کر دیا اور نہ صرف بنی امیہ بلکہ عالم اسلام ایک عظیم فاتح کی

www.urdudigest.com

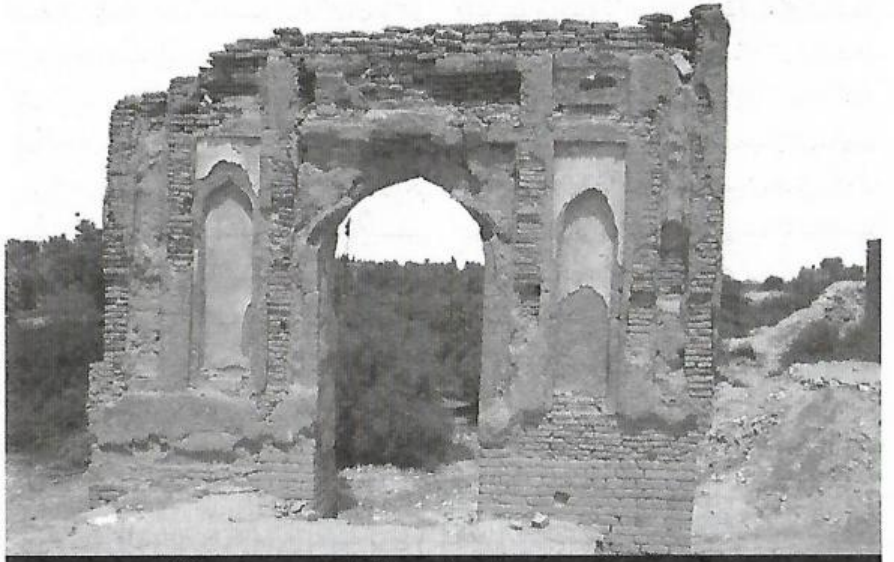

سندھ میں محمد بن قاسم کی بنائی ایک مسجد کے آثار

مزید فتوحات سے محروم ہو گیا۔ اس وقت کچھ ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے کہ قابل سے قابل افراد کو انتقام اور عداوت کی بھینٹ چڑھانا کوعین کامیابی سمجھا جاتا تھا۔

عہد محمد بن قاسم پر تبصرہ

محمد بن قاسم سترہ سال کی عمر میں سندھ آئے اور صرف ساڑھے تین سال سندھ میں رہے۔ اس مختصر سی مدت میں انھوں نے پورے سندھ کو فتح کر کے ایک ایسے عادلانہ نظام سلطنت کی بنیاد ڈالی، جس کے دوست و دشمن سب معترف تھے۔ ان کی دانائی، تدبر اور سلامت روی کا سکہ سارے ملک پر بیٹھا ہوا تھا۔ ان تین برسوں میں وہ نظام رائج کیا جس کی بنا پر مسلمان تین صدیوں تک یہاں حکومت کرتے رہے۔

محمد بن قاسم کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ انھوں نے ہر منزل و موقع پر اپنے مربی و محسن حجاج بن یوسف سے مشورہ لیا۔ حجاج اگرچہ تاریخ اسلام کی ایک بدنام شخصیت ہے لیکن سندھ کے معاملے میں اس کی ہدایت اور مشوروں کو پڑھ کر اس کے تدبر، ہوشمندی اور اس کے اعلیٰ سیاست داں ہونے کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ جب محمد بن قاسم نے دیبل کی فتح کی اطلاع اس کو دی تو اس نے ۲۰ رجب ۹۳ھ کو محمد بن قاسم کو لکھا:

''جب تم ملک فتح کر چکو تو قلعوں کی مضبوطی اور لشکر کی ضرورتوں کی تکمیل کے بعد، تمام مال اور خزانے کو رعایا اور رفاہی امور پر خرچ کرو اور خوب سمجھ لو کہ کاشتکاروں، صناعوں اور تاجروں کی خوشحالی سے ملک پُر رونق و آباد ہوتا ہے۔ اس کی کوشش کرو کہ رعایا مطمئن رہے اور وہاں کے باشندوں کے ساتھ رعایت کرو تاکہ وہ تمہاری طرف

محبت سے راغب ہوں''۔

جب محمد بن قاسم نیرون پہنچے تو حجاج نے ان کو خط لکھا:

''تم نیرون کے لوگوں کے ساتھ مہربانی سے پیش آؤ اور ہر طرح ان کی بھلائی کی کوشش کرو اور انھیں ہماری سرپرستی کی اُمید دلاؤ۔ جو کوئی تم سے امن چاہے، اس کو امن دو، جو معززین و اکابر تمہارے پاس آئیں، ان کو خلعت اور انعام و اکرام سے نوازو، ان کے مرتبے کے مطابق ان کی مدارات کرو۔ عقل اور دانائی کو اپنا راہبر بناؤ، جس سے جو وعدہ کرو اسے پورا کرو تاکہ اطراف و اکناف کے اکابر تمہارے وعدے پر اعتبار کریں''۔

محمد بن قاسم نے جو حکومت سندھ میں قائم کی تھی، وہ امن و رواداری کی بہترین نمونہ تھی۔ ان کی رواداری کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ انھوں نے جس طرح مسجدوں کے لیے اوقاف مقرر کیے ویسے ہی مندروں کے لیے جاگیریں مقرر کیں۔

محمد بن قاسم نے سندھ میں جو علاقے بھی فتح کیے، عام طور پر وہاں کے قدیم حاکموں سے اقرار لے کر انھی کو حکومت پر بحال رکھا۔ صرف عام انتظام کو بہتر بنانے اور انصاف کے لیے ان کے ساتھ مسلمان سرداروں کو بھی مقرر کر دیا جاتا تھا، مگر پولیس اور فوج میں زیادہ تر سندھ کے نو مسلم ہوتے تھے۔ انتظامی عہدوں پر بھی سندھ کے ہندوؤں کو رکھا گیا، اس کے علاوہ رواداری کی حد یہ تھی کہ سندھ میں ہندوؤں کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کر دی گئیں، اس طرح ملک کا تمام نظم و نسق فتح ہونے کے بعد بھی مقامی ہندوؤں کے ہاتھ میں رہا اور ان راجاؤں سے صرف خراج وصول کیا جاتا تھا۔ زر لگان اور خراج سے جو رقم وصول ہوتی تھی، اس کا بڑا حصہ ملک کی رفاہی ضرورتوں پر خرچ کیا جاتا۔

حکومت اس کا خاص خیال رکھتی تھی کہ ملک کے کسی طبقے اور جماعت کو تکلیف نہ پہنچے۔ محمد بن قاسم کی حکومت نے پست افراد کو ابھارا اور ترقی دی، لیکن بلند طریقے کو گرایا نہیں۔ البتہ پست طبقوں کی حالت کو بہتر بنانے اور ان کی فلاح و بہبود پر سب سے زیادہ توجہ دی۔ عدل و انصاف، مساوات پر اپنی حکومت کی بنیاد رکھی اور اس کا خصوصیت سے خیال رکھا کہ ملک کے کسی طبقے اور جماعت کو نقصان نہ پہنچے، چنانچہ مفتوحہ علاقوں میں تاجروں، پیشہ وروں، دستکاروں اور کاشتکاروں کو جنگ کی وجہ سے جو نقصان پہنچا تھا، محمد بن قاسم نے حکم دیا کہ ان لوگوں میں سے ہر ایک کو بارہ درہم وزن چاندی دی جائے اور جس کا اس سے زیادہ نقصان ہوا ہے، اسے تحقیق کے بعد اس سے زیادہ دیا جائے۔ برہمنوں کو جو زر لگان وصول کرنے پر متعین تھے، تاکید کی گئی تھی کہ کسانوں سے لگان اور محصول کے وصول کرنے میں کسی قسم کی سختی نہ کی جائے، کسانوں کو ہر طرح کی سہولتیں دی جائیں، جس کسان کے یہاں پیداوار کم ہو اس کو سرکاری لگان معاف کر دیا جائے۔

محمد بن قاسم کے اس طرز عمل نے سندھ کے لوگوں کو بے حد متاثر کیا، رعایا میں مسرت اور خوشی کی لہر دوڑ گئی اور ہر طرف اسلامی حکومت کی تعریف کے گن گائے جانے لگے، یہاں تک کہ برہمن خود گاؤں گاؤں پھر کر اسلامی حکومت کی تعریف کرتے اور لوگوں کو حکومت کی وفاداری کا سبق دیتے تھے۔

محمد بن قاسم جب سندھ سے رخصت ہونے لگے تو ان کے جانے پر اظہار افسوس کیا گیا۔ ان کی وفات پر شہر کیرج کے ہندوؤں اور بدھوں نے اپنے شہر میں ان کا مجسمہ بنا کر اپنی عقیدت کا اظہار کیا۔ ◆◆◆

www.urdudigest.com

کیپٹن ایس ایم، خلیل

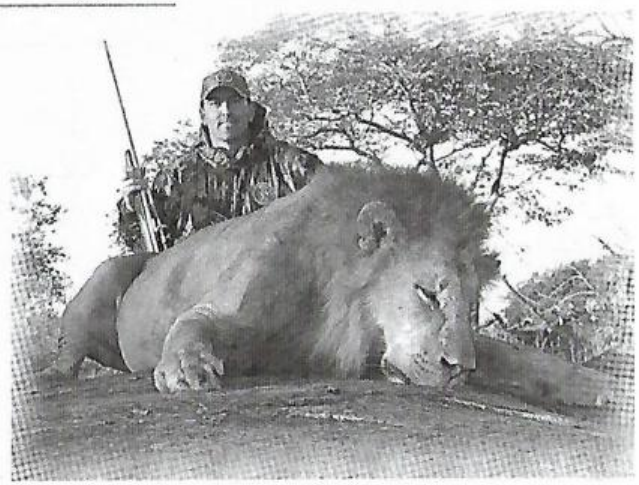

آدم خور کے پیچھے پیچھے

ایک چالاک درندے کو جب موت کی گرفت تک پہنچانا کٹھن مرحلہ بن گیا

۱۹۲۸ء کے آخری ہفتے کی دوپہر تھی۔ چند آدمی ایک بوڑھے آدمی کی لاش اور سولہ سال کی عمر کے ایک زخمی لڑکے کو ہسپتال لائے۔ میرا دفتر اسپتال سے ملحق تھا۔ معلوم ہوا کہ نجیب آباد اور کوٹ دوار کے درمیان چھوٹا سا ایک ہالٹ اسٹیشن ہے۔ اس سے میل بھر جنوب کی طرف گھنے جنگل میں چرواہے مویشی چرا رہے تھے۔

اچانک انھوں نے شور شرابا سنا تو بھاگ کر اس جگہ پہنچے۔ دیکھا بوڑھے کی لاش پڑی تھی اور ایک لڑکا شدید زخمی حالت میں بے ہوش تھا۔ ان کے قریب خون آلود کلہاڑی پڑی تھی اور شیر کے پاؤں کے نشان صاف نظر آرہے تھے۔ لڑکے کو اسپتال میں داخل کر لیا گیا اور اس کی ماں اور باپ کو اپنے دفتر کا ایک چھوٹا سا کمرا دے دیا کیونکہ اسپتال میں ان کے ٹھہرنے کے لیے جگہ تھی نہ اجازت۔

لڑکا ہوش میں آ گیا۔ ڈاکٹر نے اُسے سنبھال لیا تھا۔ ڈاکٹر میرا دوست تھا اور وہ جانتا تھا کہ میں شکاری ہوں اور مجھے یقیناً آدم خور شیر میں دلچسپی ہوگی۔ چنانچہ دوسرے روز ڈاکٹر نے مجھے بتایا کہ لڑکا اب خطرے سے باہر ہے اور اس کے ساتھ باتیں کی جاسکتی ہیں۔ میں فوراً اسپتال پہنچا۔ لڑکا دہشت زدہ تھا۔ ڈاکٹر اور میں نے اُسے تسلی دی تو وہ قدرے سنبھل گیا۔

اُس نے بتایا کہ جس بوڑھے کو شیر نے مار دیا وہ اس کا ماموں تھا۔ وہ دونوں جنگل میں ڈھور ڈنگر چرانے لے گئے تھے۔ دوپہر کے وقت مویشی پانی پینے قریب کے ایک جوہڑ پہ چلے گئے اور وہیں بیٹھ گئے۔ بوڑھا اور لڑکا درختوں تلے لیٹ گئے۔ اتنے میں قریب ہی ایک گھنی جھاڑی زور سے ہلی اور پیشتر اس کے کہ یہ دونوں سنبھلتے ایک شیر نمودار ہوا اور

پلک جھپکتے بوڑھے پہ جھپٹ کر اس کا سر منہ میں لے لیا اور اُسے بڑی زور زور سے جھنجھوڑنے لگا۔

لڑکے نے بھاگنے کے بجائے کلہاڑی سے شیر پر حملہ کر دیا۔ شیر نے اس کے ماموں کو دور پرے پھینک دیا اور لڑکے پر جھپٹ پڑا۔ لڑکے نے کلہاڑی کا دوسرا وار کیا جو اس کے ایک پنجے پہ پڑا لیکن شیر لڑکے کی گردن اور کندھے کو بُری طرح لہولہان کر چکا تھا۔ لڑکے کو اس کے بعد اسی قدر یاد تھا کہ اُس پر غشی طاری ہو رہی تھی اور شیر کلہاڑی کے دو بھرپور واروں کی تاب نہ لا کر بھاگا جا رہا تھا۔

لڑکا اس کے سوا مجھے کچھ اور نہ بتا سکا لیکن اس کے باپ (اللہ دتہ) نے جو میرے دفتر کے کمرے میں مقیم تھا، اس شیر اور جنگل کے متعلق بہت سی باتیں بتائیں۔ نجیب آباد اور کوٹ دوار کے علاقے میں پھیلا گھنے جنگلات کا یہ چار مربع میل کا ٹکڑا انتہائی خطرناک تھا اور دشوار گزار بھی۔ اس زمانے میں سلطانہ ڈاکو تمام علاقے کے لیے ہیبت بنا ہوا تھا لیکن کبھی پکڑا نہیں گیا تھا۔ وہ جنگل کے اسی گوشے میں چھپا کرتا تھا۔ پولیس کئی بار اس کی تلاش میں وہاں گئی لیکن سلطانہ ڈاکو کو خبر ہو جاتی تھی اور وہ نکل بھاگتا۔ پولیس جنگل سے ناواقف اور سلطانہ جنگل کا رازداں تھا۔

لڑکے کے باپ نے بتایا کہ وہ لوگ بھیم پورہ کے رہنے والے ہیں۔ بھیم پورہ پندرہ سولہ گھروں کا چھوٹا سا گاؤں ہوا کرتا تھا جس پر سلطانہ ڈاکو کی خاص نظرِ عنایت تھی کیونکہ اس گاؤں کے لوگ اُسے چھپنے اور بھاگ جانے میں مدد دیا کرتے تھے۔ پولیس کے آتے ہی اُسے خبردار کر دیتے اور پولیس کو گمراہ بھی کیا کرتے تھے۔ گاؤں والوں کی اس حرکت سے پولیس آگاہ نہیں تھی۔ سلطانہ ڈاکو گاؤں والوں کو روپیہ پیسہ اور کپڑے وغیرہ دیتا رہتا تھا۔

اللہ دتہ نے مجھے یہ بھی بتایا کہ جنگل دراصل اتنا دشوار گزار نہیں جتنا سمجھا جاتا ہے۔ اسے دشوار گزار ہم نے بنا رکھا ہے اور سلطانہ ڈاکو کی ہدایت کے مطابق کہیں درخت کاٹ کے ڈال دیے ہیں اور کہیں خاردار جھاڑیاں اُگا دی ہیں لیکن دو خفیہ راستے ہیں جن سے ہمارے سوا اور کوئی واقف نہیں۔ اس نے بتایا جنگل میں کبھی شیر نہیں آیا تھا۔ معلوم نہیں یہ آدم خور کدھر سے آنکلا۔ شیر کے لیے یہ کشش ضرور تھی کہ وہاں چھوٹا سا ایک جوہڑ تھا جو پانی سے لبریز رہتا اور گاؤں کے مویشی وہاں پانی پیتے تھے۔ پھر وہیں کنارے کے ٹھنڈے کیچڑ میں بیٹھ جایا کرتے۔

میں نے جنگل کے اسرار کے متعلق بہت سی معلومات معلوم کر لیں۔ آٹھویں روز لڑکے کے زخم ٹھیک ہونے لگے۔ اس کے ماں باپ ڈاکٹر کی تسلی پر گھر چلے گئے۔ وہ میرے اس قدر احسان مند تھے کہ وعدہ کر گئے کہ اگر میں شیر کے شکار کے لیے آجاؤں تو وہ میری ہر طرح سے مدد کریں گے اور مجھے خفیہ راستے بھی بتا دیں گے۔

ان کے جانے کے بعد دوسرے ہی روز ایک لڑکے کی ادھ کھائی لاش لائی گئی۔ اس لاش کے ساتھ دو تین آدمی بھی تھے جو زخمی لڑکے اور اس کے ماموں کی لاش لائے تھے۔ وہ تحصیلدار اور تھانیدار کے ہاں رپورٹ لکھوانے آئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ لڑکا بھینس پر سوار جوہڑ کی طرف جا رہا تھا کہ شیر جھاڑی سے نکلا اور لڑکے کی ٹانگ پکڑ کر اُسے گھسیٹ لے گیا۔ دوسرے چرواہے اس کی کوئی مدد نہ کر سکے۔ تھوڑی دیر بعد کچھ اور لوگ آئے جنھوں نے برچھیوں اور کلہاڑیوں سے شیر کی جھاڑی پر ہلّہ بول دیا لیکن وہاں وہ نہیں تھا۔ بس لڑکے کی ادھ کھائی لاش پڑی تھی۔

سارے علاقے میں دہشت پھیل گئی۔ تحصیلدار نے پولیس کے بارہ مسلح سپاہیوں کی ایک پارٹی شیر کو مارنے کے لیے بھیج دی۔ ایک سب انسپکٹر بھی ساتھ تھا۔ انھیں بجنور سے بھی بذریعہ تار حکم آ گیا تھا کہ اس آدم خور کو مارنے کا فوری انتظام کرو لیکن پولیس پارٹی دو روز کی ناکام کوششوں کے

www.urdugem.com

بعد واپس آ گئی۔ سپاہیوں کی حالت بہت بُری تھی۔ خاردار جھاڑیوں نے ان کی وردیاں اور جسم کی کھال بھی بری طرح چیر پھاڑ دی تھی۔ درختوں کی لٹکتی شاخوں نے ان کی آنکھیں اندھی کر دی تھیں۔ نجیب آباد کے ریلوے سٹاف نے اپنی حفاظت کے لیے مراد آباد سے مدد مانگی چنانچہ ریلوے پولیس کے آٹھ مسلح سپاہی پہنچ گئے۔

تین روز بعد ریلوے اسٹیشن سے ایک عورت سر پر ایک گٹھڑی اٹھائے نکلی۔ وہ ذرا ہی پرے گئی تو جانے کہاں سے شیر دھاڑتا نکلا اور عورت کو منہ میں دبوچ کر چلتا بنا۔ پولیس کے ایک سپاہی نے فائر کیا لیکن گولی شیر کو نہ لگی۔ پیشتر اس کے کہ اس پر ایک اور گولی چلائی جاتی شیر عورت کو منہ میں لیے جنگل میں غائب ہو چکا تھا۔ یہ واقعہ کئی لوگوں نے دیکھا لیکن کوئی بھی شیر کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ البتہ طرح طرح کی افواہیں پھیلنے لگیں جن میں یہ افواہ مصدقہ مانی جانے لگی کہ سلطانہ ڈاکو نے اپنی جون بدل لی ہے اور وہ اب شیر کے روپ میں اپنے خون کا بدلہ لینے آتا ہے۔ بہر حال ہر سُو دُور دُور تک، دہشت زدگی کا دَور دَورہ شروع ہو گیا۔ سرکاری طور پر مراد آباد، بجنور اور ہر طرف اطلاعیں بھیج دی گئیں۔

دوسرے ہی روز شیر کے پہلے زخمی لڑکے کا باپ اللہ دتہ اُسے اسپتال سے لینے آ گیا۔ میں نے اُسے کہا کہ میں اس جنگل کو دیکھنا چاہتا ہوں، تو اس نے کہا کہ آج شام کی گاڑی پہ آ جاؤ۔ چنانچہ میں اپنی بندوق اور ضروری سامان لے کے بھیم پورہ پہنچ گیا۔ گاؤں والوں نے خوب آؤ بھگت کی۔ رات وہاں گزری اور علی الصبح اللہ دتہ اور گاؤں کا نمبردار چند آدمیوں کو ساتھ لیے میرے ساتھ جنگل کے اس ہیبت ناک گوشے کی طرف چل پڑے۔

جنگل میں داخل ہوئے تو مجھے جمے ہوئے خون، گھوڑے کے پاؤں اور شیر کے پنجوں کے نشان نظر آئے۔ میں نے لوگوں کو بتایا کہ شیر کسی ٹٹو کو اٹھا لے گیا ہے۔ ہمارا قافلہ بھینسوں پر سوار تھا اور بھینسیں خود ہی جنگل میں راستہ بناتی چلی جا رہی تھیں لیکن بھینسیں اور انسان بھی خوفزدہ تھے۔ شیر اور خون کی بُو سے جنگل کی فضا بوجھل تھی۔ آگے جا کے دیکھا ایک گدھے کی اَدھ کھائی لاش پڑی تھی جس سے صاف پتا چلتا تھا کہ شیر ابھی اسے کھا ہی رہا تھا کہ ہمارے شور سے بھاگ گیا ہے۔

میں نے ہر طرف شیر کے پنجوں کے نشان دیکھے۔ خاص بات یہ دیکھی کہ شیر کا ایک پنجہ بیکار یا زخمی معلوم ہوتا تھا۔ یہ یقیناً اللہ دتہ کے بیٹے کی کلہاڑی سے زخمی ہوا تھا۔ میں نے شکاری نگاہوں سے شیر کو نشانہ بنانے کے لیے گردوپیش کا جائزہ لیا لیکن کام خاصا محال نظر آ رہا تھا۔ ہم جنگل سے نکل آئے۔ جھاڑیوں اور درختوں کی شاخوں نے ہمارے ہاتھوں اور چہروں کو زخمی کر دیا تھا۔ جنگل واقعی دشوار گزار تھا۔ میں اسی شام کوٹ دوار واپس آ گیا۔

اخباروں میں بھی شور اٹھا کہ اس آدم خور کو جلد ختم کیا جائے۔ بجنور سے ایک اینگلو انڈین سارجنٹ کی قیادت میں پولیس کے پچیس مسلح سپاہی بھیجے گئے جنہوں نے ریلوے اسٹیشن پر کیمپ کیا اور مسلسل تین ہفتے جنگل میں مارے مارے پھرے لیکن سوائے اپنی وردیاں پھاڑنے اور جنگلی جھاڑیوں سے زخمی ہونے کے کچھ بھی نہ کر سکے۔ ان میں سے کئی نجیب آباد اسپتال پہنچا دیے گئے تھے۔

اس دوران شیر ایک گائے اور ایک بھینس کے بچھڑے کو اٹھا لے گیا۔ وہ پہلے سے زیادہ ہوشیار ہو گیا تھا۔ اس کے بعد جو مویشی گاؤں سے ذرا باہر ہوا، وہ غائب ہو گیا۔ پھر ایک جواں سال گاڑی بان شیر کی نذر ہو گیا۔ اُسے روکا بھی گیا تھا کہ اس راستے پر گاڑی نہ لے جائے لیکن وہ ضرورت سے زیادہ دلیر تھا۔ اس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد نوجوان کے بیل خوفزدہ حالت میں اپنے پیچھے خالی گاڑی بھگاتے آ رہے تھے۔ بڑی مشکل سے انھیں روکا گیا۔ بیل تھر تھر کانپ رہے تھے،

گاڑی بان لاپتا تھا اور گاڑی میں اس کا خون پڑا تھا۔

بجنور کے کلکٹر نے جنگل کے اس ٹکڑے کو آگ لگا دینے کا حکم دیا لیکن محکمۂ جنگلات نے اس حکم کی تعمیل نہ ہونے دی۔ اب مشہور شکاریوں کو بھی بلایا گیا لیکن وہ آئے اور شام کو سر جھکائے واپس چلے گئے۔ پھر کلکٹر نے شیر مارنے کے لیے تین سو روپے کا عام اعلان کر دیا۔ کوٹ دوار کے تحصیلدار نے مجھے اکسایا لیکن میں نے انکار کر دیا۔ مراد آباد کے کمشنر نے لینسڈاؤن چھاؤنی سے فوجی مدد حاصل کر لی۔ گڑھوال رائفلز کی ایک پلاٹون یعنی تیس جوان اسلحہ بارود اور ساز و سامان سمیت آن پہنچے۔ ان کے ساتھ خچر گاڑیاں بھی تھیں۔ پہلی ہی رات ایک خچر کو شیر اٹھا لے گیا اور فوج منہ دیکھتی رہ گئی۔

گڑھوالیوں کی پلاٹون پورے جنگی اہتمام سے آئی تھی اور اب جنگل کو کاٹ کاٹ کر راستہ بنا رہی تھی۔ انگریز کپتان بڑے طمطراق سے شیر کو مارنے کی ترکیبیں کر رہے تھے۔ دن پہ دن گزرتے جا رہے تھے مگر شیر ہاتھ نہ آیا البتہ وہ چھ آدمیوں اور پانچ جانوروں کو ہڑپ کر گیا۔ فوجی سپاہی جنگل پھرتی سے جنگل میں راستہ بنا رہے تھے اور ایک ایک کر کے اسپتال پہنچ رہے تھے۔ بے رحم جنگل انھیں لہولہان کر رہا تھا۔ اس دوران صرف ایک بار دن کے وقت شیر نظر آیا۔ چھ سپاہیوں نے بیک وقت رائفلوں سے اس پر نشانہ باندھا، چھ گولیاں فائر ہوئیں لیکن شیر بڑے اطمینان سے ایک جھاڑی میں روپوش ہو گیا۔

دو ہفتوں بعد شیر رات کے اندھیرے میں گاؤں میں آیا اور ایک جواں سال لڑکی کو اٹھا لے گیا۔ اس لڑکی کے پیٹ میں درد تھا۔ ماں پڑوس میں اس کے لیے چُورن لینے چلی گئی تھی۔ واپس آئی تو لڑکی بستر سے غائب تھی۔ بستر خون سے لتھڑا ہوا تھا۔ فوجیوں نے جنگل سے لڑکی کے پھٹے ہوئے کپڑے، بازو کی ہڈیاں اور کھوپڑی برآمد کر لی۔ اب شیر صرف رات کے وقت اپنے شکار کے لیے نکلتا۔ اس کی پناہ گاہ کے گرداب رات کے وقت لالٹینیں جلتی رہتی تھیں اور جنگل میں فوج نے ہنگامہ بپا کر رکھا تھا۔ اس کے باوجود شیر جنگل کے اس حصے سے نکل جانے پہ آمادہ نظر نہیں آتا تھا۔

گڑھوال رائفلز کی پلاٹون کی آدھی نفری زخمی ہو کر اسپتال پہنچ چکی تھی اور شیر ابھی تک محفوظ تھا۔ اس دوران اس نے کتوں اور چوکیداروں کی موجودگی میں بکریوں کے ایک ریوڑ پر حملہ کیا اور ایک بکری زخمی کر کے دوسری کو اٹھا لے گیا۔ آخر فوج کو واپس چلے جانے کا حکم مل گیا اور یہ وہم ہر کسی کے دل میں گھر کر گیا کہ یہ شیر نہیں کوئی شریر جن یا بھوت ہے۔

اب لوگوں نے جب فوج کو واپس جاتے دیکھا تو وہ رونے چلّانے لگے۔ ان کا آخری سہارا بھی مایوس ہو کے واپس جا رہا تھا۔ لوگ سورج غروب ہونے سے پہلے گھروں میں قید ہو جاتے بلکہ دن کے وقت بھی گاؤں سے دور نہ خود جاتے تھے نہ بچوں کو جانے دیتے۔

ایک روز اللہ دتہ اور بھیم پورہ کا نمبردار میرے پاس آئے اور فریاد کرنے لگے کہ میں ان کے بچوں پہ رحم کروں اور شیر کو مارنے کے لیے ان کے ساتھ چلوں۔ اس دوران شیر مارنے کا انعام تین سَو سے پانچ سو روپے کر دیا گیا تھا۔ انعام کا لالچ بھی دل میں پیدا ہو گیا۔ اُدھر بھیم پورہ کا سارا گاؤں میری مدد کو تیار تھا لیکن جان کا خطرہ بھی تھا۔ یہ شیر معمولی نہیں تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا اور کچھ فیصلہ نہ کر سکا۔

فوج کے چلے جانے سے صورتِ حال اور زیادہ خطرناک ہو گئی تھی۔ چھ روز بعد ایک دن محکمۂ جنگلات کا ایک کارندہ فراغت کے لیے ریلوے اسٹیشن سے جنگل کو چل دیا۔ اس نے پولیس کے سپاہی کو کہا کہ تم رائفل تیار رکھنا۔ اگر شیر آ جائے تو فائر کر دینا۔ وہ آدمی تقریباً پچاس گز دُور حوائج ضروریہ سے فراغت کے لیے بیٹھ گیا۔ اچانک ریلوے اسٹیشن پر کھڑے سپاہی کو چیخ کی آواز سنائی دی۔ اس نے گھبرا کر فائر

www.urdugem.com

کر دیا لیکن شیر اس آدمی کو گھسیٹ کر جنگل میں روپوش ہو چکا تھا۔ یہ دسواں انسان تھا جو شیر کی نذر ہوا۔ اس کے بعد نجیب آباد، مراد آباد اور بجنور تک دہشت پھیل گئی۔

تیسرے روز تحصیلدار نے مجھے بلایا۔ میں گیا تو وہاں ضلع بجنور کا سپرنٹنڈنٹ پولیس اور نجیب آباد کا ایس۔ ڈی۔ او، محکمۂ جنگلات کا منیجر اور چند اور حکام بیٹھے تھے، وہ اعلیٰ سطح کی کانفرنس کر رہے تھے اور شیر کو مارنے کی تان مجھ پر ٹوٹ رہی تھی۔ وہ جنگل کو آگ لگا دینے پر بھی سنجیدگی سے غور کر چکے تھے لیکن ڈر تھا کہ آگ پھیل گئی تو قابو میں نہ آسکے گی۔ پھر جنگل کو کٹوا دینے پر غور ہوا لیکن یہ مہم قابل عمل نہیں تھی۔ معلوم ہوا کہ اس دَور کے مشہور و معروف انگریز شکاری کرنل جم کاربٹ کو بھی بلایا گیا تھا لیکن وہ نینی تال سے ڈیڑھ سَو میل دُور آدم خوروں کے ہی شکار کو گیا ہوا تھا اور تین چار مہینے سے پہلے پہلے اس کا آنا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ مجھے کہا گیا کہ اس مہم کو میں سر کروں۔

میں کچھ گھبرا گیا اور مشورہ دیا کہ کرنل جم کاربٹ کا انتظار کر لیا جائے لیکن سب نے خدشہ ظاہر کیا کہ اس کے آنے تک یہ شیر نہ جانے کتنی انسانی جانیں تلف کر چکا ہوگا۔ آخر میں نے سر تسلیم خم کر لیا اور دفتر سے سات روز کی چھٹی لے لی۔ میں نے کہہ دیا کہ اگر میں سات دنوں کے اندر اندر شیر کو نہ مار سکا تو پھر جم کاربٹ کے سوا اُسے کوئی نہ مار سکے گا۔

میں نے بھیم پورہ کے اللہ دتہ نمبردار کو اپنے آنے کی اطلاع دے دی اور رائفل، کارتوس، ایمرجنسی راشن، پانی وغیرہ لے کے وہاں جا پہنچا۔ وہاں میرے ساتھ چلنے کے لیے دس آدمی کلہاڑیوں سمیت موجود تھے۔ انھیں میں شور شرابا مچانے کے لیے ساتھ لیے جا رہا تھا۔ ہم بھینسوں پر سوار ہو کر جنگل کے انتہائی خطرناک حصے میں جوہڑ کنارے جا پہنچے۔ میں نے رائفل تیار رکھی ہوئی تھی۔ کوئی پتا نہ تھا شیر کہاں سے کس وقت نکل آئے۔ شیر کی جھاڑی قریب ہی تھی۔ میرے ساتھی خوب شور مچا رہے تھے لیکن شیر کہیں نظر نہ آیا۔

جوہڑ کے قریب درخت پر میرے لیے بڑا موزوں اور آرام دہ مچان بنا دیا گیا۔ گاؤں والوں نے دودھ کا لوٹا بھر کر میرے پاس رکھ دیا۔ میں نے انھیں واپس جانے کی ہدایت کرتے ہوئے کہا کہ جب وہ فائر کی آواز سنیں بے دھڑک یہاں آجائیں۔ وہ لوگ چلے گئے اور میں مچان پر چڑھ کے بیٹھ گیا۔

مسلسل دو دن اور دو راتیں مچان پر بیٹھا رہا لیکن شیر کا نظر آنا تو درکنار اس کی آواز بھی نہ آئی۔ وہ جوہڑ پر پانی پینے بھی نہ آیا۔ میرے اندر شکاریوں کی چھٹی حس بھی ہے جس نے مجھے بتایا کہ شیر میری موجودگی اور میرے ارادوں سے آگاہ ہو گیا ہے۔ وہ بھوکا پیاسا کہیں چھپا ہوا ہے اور اس انتظار میں بھی ہے کہ میں مچان سے نیچے اتروں اور مجھے ہڑپ کر لے۔ مجھے عیاں طور پر محسوس ہو رہا تھا کہ شیر میری ایک ایک حرکت دیکھ رہا ہے۔ اب یہ خطرہ تھا کہ میں یہاں سے اُتر کر اس جنگل سے باہر کس طرح نکلوں گا۔ شیر اچانک مجھے دبوچ سکتا تھا۔ مجھے رہ رہ کر اپنی بیوی اور معصوم بچوں کا خیال مضطرب کرنے لگا جنھوں نے مجھے اس آدم خور کے شکار پہ جانے سے روکا بھی تھا۔

رات کو میں اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو گیا اور گڑگڑا کر دعا کی کہ اے اللہ! میری دستگیری کر۔ اس کے بعد میری آنکھ لگ گئی۔ میں نے یوں محسوس کیا جیسے خواب میں ایک غیبی آواز مجھے کہہ رہی ہو..... "دو روز بعد تم اس شیر کو مار لو گے"۔ آنکھ کھلی تو طبیعت بشاش تھی اور اچانک ایک ترکیب میرے دماغ میں آگئی۔

میں نے صبح سویرے مچان پر نماز پڑھی اور پھر اللہ کے حضور مدد کی التجا کی۔ کھانے اور پانی کا ذخیرہ ختم ہو چکا تھا۔ گاؤں والے دو دن اور دو راتیں میرے فائر کا انتظار کرتے رہے تھے۔ وہ صبح ہی صبح شور وغل بپا کرتے میرے پاس آ

گئے۔ میں نے انھیں اپنی ناکامی کی خبر سنائی تو وہ بہت مایوس ہوئے لیکن میں نے یہ کہہ کر ان کی ڈھارس بندھائی کہ میں ایک اور ترکیب سے شیر مار ڈالوں گا۔

میں ان لوگوں کے ساتھ گاؤں واپس آ گیا۔ ان کے غل غپاڑے اور ہاؤ ہو سے شیر جہاں کہیں تھا وہیں دبکا رہا اور ہم سب ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے۔ میں اپنے گھر کے لیے روانہ ہوا۔ اب میں اپنی نئی ترکیب کو عملی جامہ پہنانے کی فکر میں تھا۔ اس سکیم کے تحت میں نے اپنے ماتحت، رام پرشاد، کو کہا کہ سٹور میں جو سفری تنور رکھا ہے، اسے نکال کر صاف کرو۔ میرے بیوی بچے پھر میرے پیچھے پڑ گئے کہ میں اس شکار سے باز آجاؤں لیکن میں آخری کوشش کرنے سے باز نہ آسکا۔ میرے سٹور میں ڈبل روٹیاں پکانے کے لیے لوہے (اینگل آئرن) کا ایک سفری تنور رکھا تھا۔ یہ گورا رجمنٹوں والے سفر کے وقت اپنے ساتھ رکھتے تھے۔

میں نے یہ سفری تنور گاڑی میں رکھوایا اور پھر بھیم پورہ جا پہنچا۔ گاؤں کے لوگ پھر میرے ساتھ ہو لیے اور شور وغل مچاتے جوہڑ تک پہنچ گئے۔ اتنے دن شیر بھوکا پیاسا رہا تھا۔ جگہ جگہ اس کے پنجوں کے نشان نظر آ رہے تھے۔ میں نے شیر کی جھاڑی کے قریب چھ انچ گہرا گڑھا کھدوا کر اس میں تنور رکھ دیا اور اسے مٹی وغیرہ سے مضبوط کر لیا تاکہ شیر اس پر حملہ کرے تو یہ گر نہ پڑے۔ میں نے اپنا راشن پانی تنور میں رکھ لیا اور رائفل لے کر اس میں بیٹھ گیا۔ تنور چار فٹ چوڑا تھا۔ گاؤں کے لوگ واپس چلے گئے۔ میں نے انھیں کہا کہ فائر کی آواز سنتے ہی آجائیں۔

رات گہری ہونے لگی اور چاندنی پھیلنے لگی لیکن شیر کی آواز نہ سنائی دی۔ میں نے سوچا کہ شیر کو اپنی طرف متوجہ کروں چنانچہ میں نے بلند آواز سے شعر پڑھنے شروع کر دیے۔ جب شعر ختم ہو گئے تو میں نے اپنی مخصوص بے ڈھب آواز میں بے سُرے گانے الاپنے شروع کر دیے۔ پھر میں پاگلوں کی طرح اونچی آواز سے بے تکی باتیں کرنے لگا۔

مجھے توقع تھی کہ شیر باہر نکلے گا تو میں چاندنی کی وجہ سے اُسے دیکھ سکوں گا اور بڑی آسانی سے اسے نشانہ بنا لوں گا لیکن مجھے آج تک معلوم نہیں کہ شیر جانے کہاں سے نکلا اور اُس نے گزوں کا فاصلہ کس طرح پلک جھپکتے طے کیا کہ مجھے پتا ہی نہ چل سکا۔

علم اس وقت ہوا جب شیر جست لگا کر تنور کے اوپر منہ پر آن پڑا۔ تنور کا راستہ اتنا فراخ نہ تھا کہ وہ اندر آسکتا۔ وہ پھلانگ کر تنور کے منہ پر پیٹ کے بل آپڑا تو میں نے یکے بعد دیگرے نیچے سے دو گولیاں چلا دیں۔

میرے تو اوسان خطا ہو گئے تھے۔ شیر کی جست سے جیسے زمین ہل گئی تھی لیکن میری دو گولیوں نے شیر کا پیٹ اس بُری طرح پھاڑ دیا کہ اس کا خون، پیٹ کی غلاظت اور انتڑیاں میرے اوپر گرنے لگیں اور تنور کے اندر میرے چھپنے کی جگہ ہی نہ تھی۔

شیر مر چکا تھا اور تنور کے منہ اور میرے سر کے اُوپر، پڑا مجھے خون اور غلاظت سے نہلا رہا تھا۔ مجھے ابکائیاں آنے لگیں اور میں نے زور زور سے آوازیں دینی شروع کر دیں۔ پھر میں نے رائفل سے شیر کے مردہ جسم کو آہستہ آہستہ تنور کے منہ سے ہٹانا شروع کیا لیکن کم بخت آدم خور بہت وزنی تھا۔

ریلوے اسٹیشن والوں نے میری گولیوں کی آواز سن لی تھی۔ انھوں نے گاؤں میں اطلاع دی۔ لوگ پہنچ گئے اور شیر کے مردہ جسم کو تنور سے گھسیٹ کر نیچے پھینکا اور مجھے خون اور غلاظت میں لت پت باہر نکالا۔

یہ جون اٹھائیس اور انتیس، ۱۹۲۸ کی درمیانی شب تھی جو مجھے تمام عمر یاد رہے گی۔ یہ چھٹا شیر تھا (اور دوسرا آدم خور) جو میں نے مارا۔

گھر پہنچتے ہی اپنی بیوی اور بچوں سے عہد کیا کہ آئندہ شیر کا شکار نہیں کروں گا۔ ◆◆◆

www.urdugem.com

رانا محمد شاہد

دُنیائے کرکٹ کے دلچسپ واقعات

کھیلوں کی دنیا میں جنم لینے والے دلچسپ واقعات

برطانیہ میں ساتواں کرکٹ ورلڈ کپ جاری تھا۔ ایک کے بعد ایک فتوحات سمیٹتی پاکستانی ٹیم کے کھلاڑی ڈریسنگ روم میں خوش گپیوں میں مشغول اور اپنی پُرلطف باتوں سے محفل کو کشتِ زعفران بنائے ہوئے تھے۔ ایسے میں اسپنر مشتاق احمد فٹ بال کے ساتھ مختلف کرتبوں کا مظاہرہ کرنے میں مصروف نظر آئے۔ وہ فٹ بال کو کبھی دائیں پاؤں کی انگلیوں کی مدد سے اُچھالتے اور کبھی بال لے کر تھوڑا آگے بڑھاتے۔

یونہی کھیلتے کھیلتے ان کے ذہن میں نجانے کیا بات آئی کہ انھوں نے ساتھی کھلاڑیوں کو متاثر کرنے کے لیے (کہ میں کرکٹ کے علاوہ فٹ بال بھی بہت اچھی طرح کھیل سکتا ہوں) فٹ بال کو کک لگا دی۔ بال ہوا میں بلند ہوئی اور زور دار دھماکے کے ساتھ شیشے سے جا ٹکرائی۔ چھن کی آواز آئی، شیشہ اور ٹیوب لائٹ کرچی کرچی ہو گئے۔ اب صورت یہ تھی کہ مشتاق احمد کو اپنی شوخیوں کا خمیازہ ساتھی کھلاڑیوں کے قہقہوں کی صورت میں بھگتنا پڑا۔

کھلاڑیوں کی پہچان میں پریشانی

۱۹۸۳ء کے ورلڈ کپ میں شامل پاکستانی کھلاڑی، شاہد محبوب اپنی یادیں تازہ کرتے ہوئے کہتے ہیں "ورلڈ کپ میں جو پاکستانی ٹیم حصہ لے رہی تھی۔ اس میں پانچ کھلاڑی ایسے تھے جن کی ڈاڑھی تھی۔ ان میں میرے علاوہ اعجاز فقیہ، وسیم راجا، طاہر نقاش اور راشد خان شامل تھے۔ انگلش کمنٹیٹرز کو پاکستانی کھلاڑیوں کو پہچاننے میں بڑی پریشانی کا سامنا تھا۔ ان کو معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ کون بالنگ کر رہا ہے اور کون کس جگہ فیلڈنگ کر رہا ہے۔

ہم پانچوں میں قدر مشترک یہ تھی کہ تمام ہی بالر تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ طاہر نقاش کے خلاف رنز بنتے تو کمنٹیٹرز شاہد محبوب کا نام لے رہے ہوتے۔ پورے ورلڈ کپ کے دوران انگلش کمنٹیٹرز کو یہی مشکلات پیش آئیں۔"

فیلڈ میں جمائیاں

مشہور آف اسپنر توصیف احمد ۱۹۸۷ء کے ورلڈ کپ کا ذکر کچھ یوں کرتے ہیں۔ "لاہور میں کھیلے جانے والے سیمی فائنل میں آسٹریلیا کے ہاتھوں پاکستانی ٹیم کی شکست کے بعد اس پر لاتعداد الزامات لگائے گئے، کیونکہ لاہور اور پاکستان کے لوگ اس غیر یقینی شکست کے لیے تیار نہ تھے۔ کسی نے کہا کھلاڑی ساری رات جاگتے رہے، صبح کیسے کھیل سکتے تھے؟ حالانکہ اس وقت تو ہمارے ملک میں رات کو گیارہ، بارہ بجے سونے کا رواج عام تھا۔ سیمی فائنل کے بعد لاہور میں میرا دوست جاوید آیا اور کہنے لگا کہ رات کو باہر چل کر نہاری کھاتے ہیں۔ میں نے اسے منع کیا کہ ہماری شکست کے واقعہ کو چند گھنٹے گزرے ہیں، لوگ باتیں کریں گے، اس لیے آج باہر نہیں جائیں گے۔

جاوید کہنے لگا لوگوں کا سامنا آج بھی کرنا ہے اور کل بھی، تو آج ہی کیوں نہ کر لوں۔ ہوٹل پہنچے تو وہاں چار لڑکے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ہمیں دیکھ کر کہنے لگے کہ جب ہمارے کھلاڑی ہی

راتوں کو اتنی دیر تک جاگیں گے تو میچ کس طرح جیتیں گے۔ یہ توصیف احمد بھی فیلڈ میں جمائیاں لے رہے تھے۔ مجھے ان کی بات سمجھ میں نہ آسکی۔ بعد میں، میں نے جاوید سے پوچھا کہ یہ لوگ کیا کہہ رہے تھے تو جاوید نے کہا کہ تمہاری جمائی کا ذکر کر رہے تھے۔ کیونکہ ایک بار جب تم کیمرے کے سامنے آئے تھے تو پورا منہ کھول کر جمائی لے رہے تھے، لہٰذا ان لوگوں کو باتیں کرنے کا موقع مل گیا، جبکہ جمائی لینے کی وجہ شب بیداری نہیں تھی بلکہ وہ دن ہی ہماری ٹیم کے لیے اچھا نہ تھا۔"

سر پر انڈے

ہاکی کے کھلاڑی محمد سرور اپنے بچپن کا ایک واقعہ سناتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ گھر والوں نے انھیں بازار سے انڈے لانے کے لیے بھیجا۔ وہ انڈے خرید کر واپس لوٹ رہے تھے کہ گلی میں کھیلتے دوستوں نے روک لیا۔ محمد سرور نے انھیں دھمکی دی کہ اگر جانے نہ دیا تو سارے انڈے تمہارے سر پر ماردوں گا۔ ایک لڑکا فوراً بولا: "ہمت ہے تو مارو"۔ محمد سرور نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، ایک ایک کر کے سارے انڈے لڑکے کے سر پر مار دیے۔ انڈے ٹوٹ چکے تو وہ لڑکا ہنستا ہوا اُٹھا اور بولا۔ "واہ بھئی آج تو سر پر خوب شیمپو لگا ہے۔ نہانے میں بہت مزا آئے گا اور بال بھی روشن و چمک دار ہو جائیں گے۔" یہ سُن کر محمد سرور کو احساس ہوا کہ وہ اپنا ہی نقصان کر بیٹھے ہیں۔

بستر میں کینگرو

آسٹریلیا کے مشہور کرکٹ کیپر ای این ہیلی کے مطابق "میں سوتے میں چلنے کا عادی رہا ہوں۔ ۱۹۹۳ء میں آسٹریلیا کی انڈر ۱۹ ٹیم کے ہمراہ انگلینڈ کے دورے پر تھا۔ میں رات کو سویا اور پھر سوتے میں اُٹھ کر چلنے لگا۔ میکڈرمٹ میرا روم میٹ تھا۔ اس نے مجھے چلتے دیکھا تو کافی پریشان ہو گیا کیونکہ میں سو رہا تھا۔ میکڈرمٹ نے مجھے جگانے کی کوشش کی تو مجھے ہوش آ گیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں بستر سے نکل کر سیر کیوں کر رہا تھا تو میں نے اسے بتایا کہ میں خواب دیکھ رہا تھا کہ میرے بستر میں ایک بڑا کینگرو گھس آیا ہے اور میں خوفزدہ ہو کر بستر سے نکل بھاگا۔"

جاوید میانداد کی چھلانگیں

بھارت کے خلاف عالمی کپ کے ایک میچ میں جاوید میانداد بلے بازی کرنے گئے۔ اس دن جاوید میانداد مکمل فٹ نہیں تھے۔ بھارتی وکٹ کیپر کرن مورے مخصوص انداز میں اُچھل اُچھل کر اپیل کرتا تھا۔ اس دن بھی وہ وکٹوں کے پیچھے خوب بول کر جاوید میانداد کو تنگ کرتا رہا۔ آخر تنگ آ کر جاوید میانداد نے اپنی خراب حالت کے باوجود تین مرتبہ اُچھل اُچھل کر اس کے اپیل کرنے کے انداز کی نقل کی تو پورا اسٹیڈیم قہقہوں سے گونج اُٹھا۔ مورے یہ دیکھ کر اپنا سامنہ لے کر رہ گیا۔ اسے دوبارہ جاوید میانداد کو تنگ کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اپنی خراب حالت کی وجہ سے جاوید میانداد کو اچھلنے سے تکلیف تو ہوئی لیکن انھوں نے مورے کو ایسا سبق سکھایا کہ پورا اسٹیڈیم اس پر ہنسنے لگا۔

مینڈک کھا گئے...

پاکستان کے مایہ ناز بالر سرفراز نواز نے ایک مرتبہ بیتے دنوں کے قصے چھیڑتے ہوئے کہا، "۱۹۷۷ء میں دورۂ ویسٹ انڈیز کے دوران ایک ایسا واقعہ پیش آیا جسے میں کبھی نہیں بھلا پایا۔ جمیکا میں رات کے کھانے میں فہرست طعام پیش کی گئی تو اس میں "Mountain chicken" کے نام سے بھی ایک ڈش تھی۔ میں اس ڈش کی حقیقت سے آگاہ تھا، مگر جونیئر کھلاڑی جاوید میانداد اور ہارون الرشید وغیرہ جو پہلی بار ویسٹ انڈیز کا دورہ کر رہے تھے۔ وہ سمجھے کہ ماؤنٹین چکن تو کوئی کافی بڑی ڈش ہو گی انھوں نے اس کا آرڈر دے دیا۔

جب وہ سیر ہو کر کھا چکے تو میں نے ان سے کہا کہ جانتے ہو کہ تم لوگوں نے کیا کھایا ہے؟ وہ حیرت سے مجھے تکنے لگے تو میں نے بتایا کہ ماؤنٹین چکن مینڈک ہوتا ہے اور یہ ادھر کی خاص ڈش ہے۔ اس پر وہ سمجھے کہ شاید میں مذاق کر رہا ہوں۔ اپنی تسلی کے لیے انھوں نے ویٹر کو بلایا تو اس نے میری بات کی تصدیق کی اور انھیں بتایا کہ ماؤنٹین چکن بہت بڑا مینڈک ہوتا ہے۔ یہ جان کر جاوید میانداد اور ہارون الرشید کی طبیعت خراب ہونا شروع ہو گئی اور وہ باتھ روم میں جا کر اُلٹیاں کرنے لگے۔

www.urdudigest.com

مترجم: سراج الدین احمد نظامی

شکستہ پر

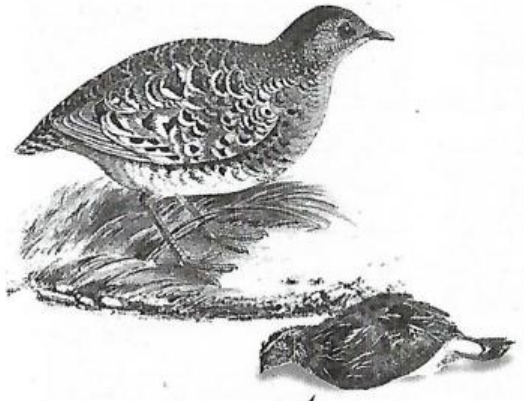

ایک ماں کی دردانگیز کہانی، اس کا لازوال مادرانہ جذبہ عجب امتحان میں گرفتار ہوگیا

موسم بہار میں ایک مادہ بٹیر جو افریقا سے آئی تھی، تھکان سے نیم مُردہ ہو کر پرواز چھوڑ ایک گھنی جھاڑی کے پاس سرسبز کھیت میں اُتری۔ کچھ دن آرام کرنے کے بعد اُس نے شاخیں، پتّے اور تنکے اکٹھے کر مٹی کے ایک تودے پر اپنے لیے گھونسلا بنایا تا کہ وہ بارش سے محفوظ رہ سکے، پھر سات یوم تک وہ متواتر ایک انڈا روز دیتی رہی۔ یہ انڈے چھوٹے چھوٹے اور نازک نازک تھے۔ اُس نے ان پر بیٹھ کر انھیں سینا شروع کیا۔

کیا آپ نے کبھی مرغی کو انڈوں پر بیٹھے دیکھا ہے؟ بالکل اُسی طرح بٹیر بیٹھی رہی۔ بارش ہوئی۔ آندھی چلی لیکن وہ اپنی جگہ سے بالکل نہ ہلی اور ایک قطرہ بھی انڈوں تک نہ پہنچ سکا۔ تین ہفتوں کے بعد اُن میں سے سات خوبصورت ننھے بچے نکلے جو چڑیا کے بچّوں کی مانند بالکل ننگ دھڑنگ نہیں، بلکہ ایک زرد سے روئیں میں لپٹے ہوئے چھوٹی چھوٹی سات ریشمی گیندوں سے مشابہ تھے۔ انھوں نے انڈوں سے نکلتے ہی دانے دُنکے کی تلاش شروع کر دی۔ بعض اوقات بٹیر ان کے لیے ایک چیونٹی یا ٹڈا پکڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی اور وہ اپنی ننھی ننھی چونچوں سے فوراً ہڑپ کر جاتے۔

وہ بہت خوبصورت، چالاک اور فرمانبردار تھے۔ ہمیشہ اپنی والدہ کے قریب رہتے اور جب وہ انھیں ''پٹ پٹ'' کہہ کر پکارتی وہ تیزی سے دوڑ کر اُس کے پاس پہنچ جاتے۔ ایک دن بیساکھ کے مہینے میں جب کسان کھیت کاٹنے آئے تو بڑا بچہ اپنی والدہ کی آواز پر جلدی واپس نہ آسکا اور ایک لڑکے نے دوڑ کر اسے پکڑ لیا۔ آہ اس خوف و ہراس کو صرف وہی بیان کر سکتا تھا جو اس نے لڑکے کی مٹھی میں محسوس کیا۔ اُس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ خوش قسمتی سے ایک بوڑھے کسان نے اُس لڑکے کی منت کی اور کہا ''بیٹا اسے چھوڑ دے، بچّہ ہے، بے چارہ مشکل سے چل پھر سکتا ہے۔''

اس مصیبت سے نجات پا کر وہ دوڑ کر اپنی ماں کے پاس گیا اور اسے سارا قصہ سنایا۔ وہ کہنے لگی ''دیکھا میری بات نہ ماننے کا نتیجہ؟ جب تم بڑے ہو جاؤ تو جو تمہارے جی میں آئے کرنا، لیکن جب تک تم چھوٹے ہو، تمہیں میری ہر بات ماننی چاہیے۔ نہیں تو کسی مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔''

اس طرح وہ خوشی اور اطمینان کی زندگی بسر کرنے لگے۔ کھیت کی کٹائی اور گٹھوں کے انبار سے بے شمار دانے زمین پر پھیل گئے جن سے انھیں کافی خوراک مل گئی۔ کھیت کے قریب پانی نہ تھا لیکن انھیں پیاس کی تکلیف نہیں ہوتی تھی۔ وہ گھاس پر سے شبنم کے قطرے پی کر گزارا کر لیتے تھے۔ دن کو جب گرمی زیادہ ہوتی وہ جھاڑی کے سائے میں چلے جاتے اور شام کو پھر کھیت میں واپس آجاتے۔

سرد راتوں میں وہ اپنی ماں کے پروں کے نیچے سمٹ کر بیٹھ جاتے۔ جب اُن کے پروں کا رُواں بتدریج پروں میں تبدیل ہو گیا تو انھوں نے اپنی ماں کی مدد سے اُڑنا شروع کیا۔ اُڑنے کا سبق صبح طلوع آفتاب سے قبل شروع ہوتا کیونکہ دن میں چیلوں کے حملے کا سخت خطرہ تھا جو کھیت پر منڈلاتی رہتی تھیں۔ ایک دن بٹیر نے اُن سے کہا۔ ''کیا تم تیار ہو؟''

انھوں نے جواب دیا۔ ''ہاں''

''ایک، دو، تین''۔

جوں ہی اُس نے تین کہا، پُھر پُھر پُھر سب اُڑنے لگے اور تھوڑی دُور جا کر واپس آ گئے۔ ان کی ماں نے انھیں بتایا ''تم یہ سب کچھ ایک لمبے سفر کے لیے سیکھ رہے ہو جو تمہیں موسم گرما کے اختتام پر کرنا ہے۔'' ''ہم کئی دن تک زمین سے بہت اونچا اُڑیں گے اور اپنے نیچے بڑے بڑے شہر، جنگل اور دریا دیکھیں گے۔''

بیساکھ کے اختتام پر سہ پہر کے وقت جب وہ اپنی ماں کے قریب ہی کھیل میں مشغول تھے، ایک گاڑی کھیت کے پاس ٹھہری۔ انھوں نے اپنی سیاہ آنکھیں اُٹھا کر دیکھا۔ انھیں ایک آواز سنائی دی جو کہہ رہی تھی ''موتی موتی''۔

بچے اس کا مطلب بالکل نہ سمجھے لیکن اُن کی والدہ جانتی تھی کہ یہ کوئی شکاری ہے۔ جو اپنے کتے کو بلا رہا ہے۔ وہ خوف سے بُت بن کر کھڑی ہو گئی۔ جھاڑی اُن کی جائے پناہ تھی لیکن عین اُسی سمت سے شکاری آ رہا تھا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اُس نے کہا ''تم سب زمین کے ساتھ لگ جاؤ۔ میں اُڑتی ہوں۔ تم بالکل نہ ہلنا۔ نہیں تو مارے جاؤ گے۔ سمجھے؟''

بچوں نے آنکھیں مچپچائیں گویا سمجھ گئے ہیں اور چپ چاپ بیٹھ گئے۔ وہ کتّے کی آواز کو بخوبی سن سکتے تھے جو کھیت میں اِدھر اُدھر پھر رہا تھا۔ وقتاً فوقتاً شکاری پکارتا تھا ''کہاں ہو؟ موتی موتی!''

آواز بالکل نزدیک آ گئی۔ کتے نے انھیں دیکھ لیا اور وہیں ٹھہر گیا۔ اُس کی آنکھیں اُن پر جمی تھیں۔ ''مت ہلو'' بٹیر نے کہا اور خود تیزی سے آگے دوڑی۔

کتے نے دوڑ کر اُس کا تعاقب شروع کیا۔ شکاری بھی جلدی جلدی چلنے لگا۔ آدمی کی ٹانگیں اس قدر نزدیک تھیں کہ بچّے اُس کے بوٹ پر ایک چیونٹی کو رینگتے دیکھ سکتے تھے۔ اُن کے دل تیزی سے دھڑکنے لگے۔ چند لمحوں بعد بٹیر اٹھی اور کتے کے آگے زمین کے ساتھ اُڑنے لگی۔ اُس نے پیچھے بھاگنا شروع کیا۔ شکاری بھی پیچھے ہی تھا لیکن وہ کتے کے زخمی ہونے کے خوف سے بندوق نہ چلا سکتا تھا۔

بٹیر نے بڑی ہوشیاری سے اپنے تئیں زخمی ظاہر کیا اور کتے نے اسے پکڑنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ جب اُسے یقین ہو گیا کہ وہ بندوق کی زد سے باہر ہے، تو تیزی سے اُڑ کر جھاڑی میں چھپ گئی۔

اسی اثنا میں بڑا بچّہ اپنے دوسرے بھائیوں کی مانند بے حس و حرکت رہنے کے بجائے اُڑ گیا۔ شکاری نے اُس کی آواز سن لی اور مُڑ کر بندوق چلا دی۔ وہ ذرا دُور تھا۔ صرف ایک پھرّہ اُس کے پروں میں لگا۔ وہ گرا نہیں بلکہ کوشش کر کے جھاڑی تک پہنچ گیا لیکن اس کے پروں کی حرکت سے اُس کا بازو ٹوٹ گیا اور وہ شکستہ پر ہو کر گر پڑا۔

شکاری نے یہ دیکھ کر جھاڑی بہت گھنی ہے اور

www.urdugem.com

دوسرے یہ کہ ایک چھوٹا سا بچّہ ہے، اسے تلاش کرنا مناسب نہ سمجھا اور دوسرے بچّے اپنی جگہ سے بالکل نہ ہلے بلکہ خاموشی سے انتظار کرتے رہے۔ کبھی کبھی انھیں بندوق کی آواز آتی تھی۔ اب شام ہوگئی تھی اور جھینگروں کی آواز کے سوا کچھ سنائی نہ دیتا تھا لیکن جب رات ہوئی اور چاند نکلا تو انھوں نے اپنی ماں کی آواز سنی جو کھیت کے سرے سے انھیں بلا رہی تھی۔

''پٹ پٹ! پٹ پلیک!''

وہ تیزی سے اُڑ کر ماں کے پاس پہنچا گئے۔ ماں نے انھیں شمار کیا۔ ایک غائب تھا۔ اُس نے پوچھا۔ ''بڑا کہاں ہے؟''

''ہمیں معلوم نہیں، وہ اُڑ گیا تھا۔''

بے چاری بٹیر نے زور زور سے پکارا۔ ایک کمزور آواز جھاڑی میں سے آئی۔ ''پیسو! پیسو!''

جب ماں نے اسے تلاش کر کے بیٹے کا شکستہ پر دیکھا تو دل پر ایک کاری ضرب لگی۔ اسے معلوم ہوگیا کہ اس کی قسمت میں کیا لکھا ہے اور اس کا مستقبل کیا ہے لیکن ماں نے اپنا غم ظاہر نہیں کیا تاکہ وہ بددل نہ ہوجائے۔

اب اُس غریب بچّے کی زندگی سخت اجیرن ہوگئی۔ وہ بڑی مشکل سے حرکت کرسکتا تھا۔ وہ اپنے بھائیوں کو اُڑنے کی تعلیم لیتے دیکھتا تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے۔ رات کے وقت جب دوسرے بچّے اپنی والدہ کے گرم پروں کے نیچے محوِ خواب ہوتے وہ بے قراری سے پوچھتا ''اماں کیا میں اچھا ہوجاؤں گا؟ یا نہیں؟''

وہ اپنے آنسو ضبط کر کے جواب دیتی ''ہاں۔ ہوجاؤ گے؟''

موسم گرما ختم ہوگیا۔ کسان ہل لے کر کھیت میں آ گئے۔ بٹیر اور اُس کے بچے قریب ہی مکئی کے کھیت میں چلے گئے۔ کچھ عرصہ بعد کسان مکئی کاٹنے چلے آئے۔ اب بٹیر اور اُس کے بچے لمبی لمبی گھاس میں آ گئے۔

لمبے اور خوشگوار دن چھوٹے اور اُداس دنوں میں تبدیل ہوئے تو جھاڑی کے پتّے بھی زرد ہونے لگے۔ شام کو ابابیلیں اُڑتی دکھائی دیتیں۔ بعض دفعہ پرندوں کے گروہ گزرتے دکھائی دیتے اور سرد راتوں کے سکوت میں سارسوں کے چیخنے کی آواز آتی۔ وہ سب ایک ہی سمت جنوب کی طرف دیس چھوڑ کر پردیس جا رہے تھے۔

غریب بٹیر کے دل کی عجیب حالت ہوگئی۔ اپنے بچے کے شکستہ پر کا خیال کر کے اُس کی آنکھیں پُرنم ہوجاتیں اور وہ غم سے نڈھال ہوجاتی۔ وہ بڑی خوش قسمت ہوتی اگر وہ اپنے تئیں دو ٹکڑے کرسکتی تاکہ اس کا آدھا جسم اُن مضبوط اور توانا بچوں کے ساتھ جاتا جو سردی سے تکلیف میں مبتلا تھے... آدھا جسم اُس زخمی بچے کے ساتھ رہتا جو اسے اتنا پیارا تھا۔

بڑی سوچ بچار کے بعد ایک دن بٹیر نے فیصلہ کرلیا کہ سب بچوں کی موت سے بہتر ہے کہ ایک بچہ مرجائے۔ پیچھے مُڑ کر دیکھے بغیر تاکہ اُس کا استقلال جواب نہ دے جائے، وہ تندرست بچوں کو ساتھ لے کر اُڑ گئی۔ زخمی بچّہ رو کر کہنے لگا

''امی مجھے نہ چھوڑو! امّی مجھے اکیلا نہ چھوڑو!''

اُس نے اُن کے پیچھے اُڑنے کی کوشش کی لیکن وہ ناکام رہا۔ اسی جگہ بیٹھا آنسو بھری آنکھوں سے ان کا تعاقب کرتا رہا یہاں تک کہ وہ اُفق پر اُس کی نظروں سے غائب ہو گئے۔ تین دن بعد تمام خطّے میں سردی کا دور دورہ ہوگیا۔ سخت برف باری ہوئی۔ سرد ہوائیں چلنے لگیں جس سے سردی اور بھی ناقابلِ برداشت ہوگئی۔

جھاڑی کے قریب وہ شکستہ پر بچّہ سردی سے اکڑا ہوا تھا۔ غم نصیب بڑی تکلیف میں نیم غشی کی حالت میں مبتلا تھا۔ اُس کے دماغ میں گزشتہ ایام کی یاد بجلی کے مانند کوند رہی تھی۔ کھیت، شکاری کا ہوٹ، اُس پر رینگتی ہوئی چیونٹی، اپنے بھائیوں کے ساتھ کھیلنا اور والدہ کے گرم پر یکے بعد دیگرے اُس کے سامنے آ گئے۔ وہ درد و کرب سے تڑپنے اور زمین پر لوٹنے لگا اور اپنے دونوں پنجے جوڑ کر لیٹ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ہاتھ جوڑ کر دعا میں مشغول ہے۔ ◆◆◆

رشید اختر ندوی

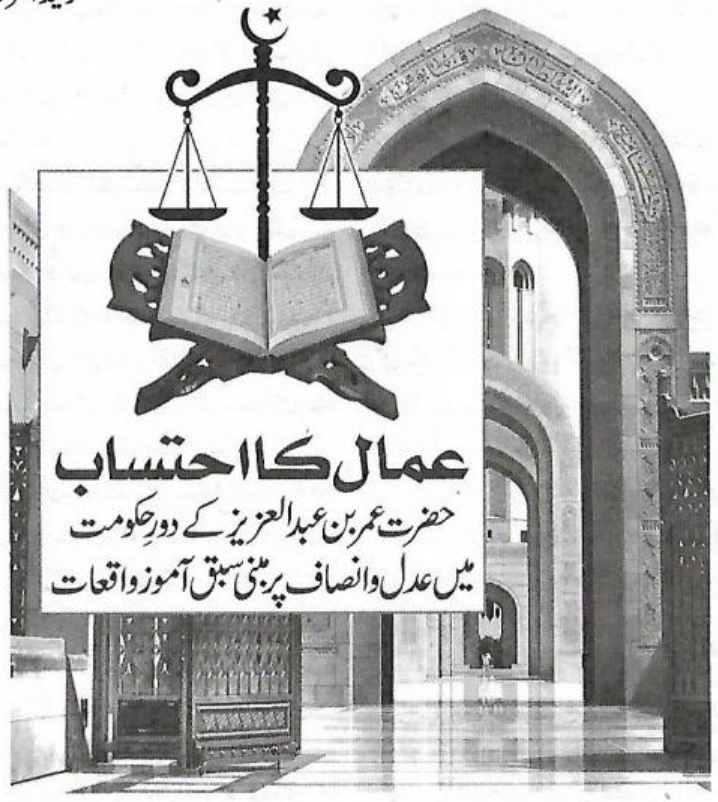

عمال کا احتساب

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے دورِ حکومت میں عدل و انصاف پر مبنی سبق آموز واقعات

اس دور میں یہ بات کچھ ناممکن سی نظر آئے گی لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ اموی خلیفہ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز جب تک برسرِ اقتدار رہے ان کی پُوری قلمرو میں جو دس پاکستانوں سے کہیں زیادہ وسیع تھی، شاذ و نادر ہی کبھی ایسا ہوتا جب ان کا کوئی افسر شریعت کے منشا سے دُور ہٹتا۔ ان کا احتساب بڑا سخت تھا اور وہ ایک لمحہ کے لیے بھی برداشت نہیں کرسکتے تھے کہ ان کا کوئی افسر عدل و انصاف اور اسلامی ضابطۂ حیات کی خلاف ورزی کرے۔ اگر کوئی ایسا کرتا، تو وہ اُسے یا تو معزول کردیتے یا سخت سزا دیتے۔ عجیب بات یہ ہے کہ وہ ساتھ ساتھ سرکاری افسر کو بھی غیر شرعی سزا کا مستحق نہ سمجھتے۔

ابن الجوزی کا بیان ہے کہ مدینہ کے والی، ابن حزم نے جو خود بھی بڑے فقیہ تھے، ردِ مظالم کا کام شروع کیا۔ تب کئی ملازم ایسے تھے جنھوں نے عوام کے مال میں خیانت کی

www.urdudigest.com

تھی، لیکن غصب شدہ مال رقوم واپس نہیں کر رہے تھے۔ یہ صورت حال ابن حزم نے حضرت عمر کو لکھی اور ان سے اجازت چاہی کہ جو عمال غصب شدہ رقوم واپس نہ کریں انھیں سزا دے سکیں۔ حضرت عمر نے یہ خط پایا تو ابن حزم کو خاصا سخت خط لکھا:

''یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ تم مجھ سے بندوں کو سزا دینے کے باب میں اجازت چاہتے اور سمجھتے ہو کہ اگر میں نے اجازت دے دی تو تمہیں یہ اللہ کے غصے سے بچا لے گی۔ دیکھو! جس کے خلاف مضبوط شہادتیں مل جائیں، اس سے تو شہادتوں کے مطابق وصول کر لو یا جو خود اقرار کر لے، اس سے اس کے اقرار کے مطابق لے لو لیکن جو انکار کرے، اُس سے قسم لو۔ اگر وہ قسم کھائے تو اس کا راستہ چھوڑ دو۔''

اس قسم کا خط اُن کے ایک دوسرے عامل عدی بن اوطاۃ نے بھی انھیں لکھا، اُسے بھی اُنھوں نے ڈانٹا، اُدھر سے جواب آیا: ''اس طرح تو بیت المال خالی ہو جائے گا۔'' حضرت عمر نے اُنھیں لکھا: ''تو اس میں گھاس بھر دو۔''

جرح بن عبداللہ حضرت عمر کی طرف سے خراسان کے نائب السلطنت تھے۔ اُنھوں نے ایک اموی شہزادے، عبداللہ بن الاہتم کو اپنے ماتحت ایک بڑا منصب دے دیا۔ وہ آدمی نااہل تھا۔ اس نے عوامی حقوق کا احترام نہیں کیا تو حضرت عمر بن عبدالعزیز نے جراح بن عبداللہ کو ایک سخت خط لکھا:

''اللہ عبداللہ بن الاہتم کے کسی کام میں کبھی برکت نہیں دے گا۔ اُسے معزول کر دو حالانکہ وہ امیر المومنین کا رشتے دار ہے۔ مجھے یہ بھی خبر ملی ہے کہ تم نے عمارہ کو کوئی منصب سونپا ہے۔ مجھے نہ کسی عمارہ کی ضرورت ہے اور نہ اس کے ظلم کو پسند کرتا ہوں۔ مجھے ایسے آدمی کی قطعاً ضرورت نہیں جو مسلمانوں کے خون سے ہاتھ رنگے۔ اُسے معزول کر دو۔

حضرت عمر کسی قسم کی ناجائز آمدنی کو وصول کرنے کے حامی نہ تھے۔ ایک بار اُنھیں خبر ملی کہ فلسطین میں عام سے چنگی لی جاتی ہے۔ انھوں نے اپنے عامل عبداللہ بن عرف کو حکم دیا:

''چنگی خانہ پر جاؤ۔ اُسے منہدم کر دو اور اس کی باقیات دریا میں بہا دو، تاکہ اس کا نام و نشان تک مٹ جائے۔

ان کے ایک عام کچھ سُست رو تھے۔ حضرت عمر کو خبر ملی تو انھوں نے اُسے لکھا:

''کوئی بات نہیں، تمہاری سست روی برداشت کی جا سکتی ہے۔ بشرطیکہ تم اپنے ہاتھ مسلمانوں کے خون سے پاک رکھو۔ اپنے پیٹ میں ان کے مال سے کچھ نہ بھرو۔ اور اپنی زبان کو تنگ کرنے میں استعمال نہ کرو۔''

حضرت عمر کی طرف سے نیک اور اچھے کاموں میں عمال کو پوری آزادی حاصل تھی۔ اگر کبھی کوئی افسر نیک کاموں میں بار بار مشورہ لے لے کر وقت خراب کرتا تو وہ اُسے سختی سے ڈانٹتے۔ مثلاً اُنھوں نے یمن کے گورنر کو لکھا:

میں نے تجھے لکھا کہ مسلمانوں کے مظالم اُنھیں لوٹا دو۔ اور تو مجھ سے بار بار استفسار کرتا ہے۔ حالانکہ تو اس مسافت و دُوری سے آگاہ ہے جو مجھ میں اور تجھ میں ہے۔ تو ایسا کرتے وقت موت کے شکنجے کو بھول گیا۔ میں نے جب تجھے لکھا، مسلمانوں پر جو مظالم ہوئے ہیں، ان کا ازالہ کرو، تو تُو مجھ سے اُس کی رنگت اور قسم کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔ خیال رکھ، تیرا کام مسلمانوں پر کیے گئے مظالم کی تلافی ہے۔ مجھ سے بار بار کچھ نہیں پوچھو اور اپنا فریضہ انجام دو۔''

مگر حضرت عمر کی طرف سے عمال کو اس بات کی قطعاً آزادی نہ تھی کہ وہ جسے چاہیں، سزا دیں اور جتنی چاہیں۔ اُنھیں صرف اس امر کا حق تھا کہ وہ گنہگاروں کو ان کے

قصوروں کے مطابق سزا دیں۔ ابن الجوزی نے اس باب میں ان کا ایک مکتب نقل کیا۔ جو تمام عمال کے نام لکھا گیا تھا:

''لوگوں کو اُن کے گناہوں کے حساب سے سزا دو، خواہ یہ ایک کوڑا کیوں نہ ہو اور اللہ کی مقرر کردہ حدُود سے تجاوز سے احترام کرو۔''

البتہ جو لوگ مجرم تھے یا جن کی ذہنیت جرائم پیشہ تھی۔ ان کے احتساب سے اُنھوں نے اپنے عمال کو کبھی نہیں روکا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز افسروں کو ماتحت کارکنوں پر غیر ضروری سختی کرنے اور بے کار جستجو سے بھی روکتے رہے۔ اُنھوں نے جزیرہ کے والی کو اس باب میں مکمل ہدایات دیں اور حکم دیا:

''اللہ نے تمہیں جن لوگوں کا والی بنایا ہے، ان کے قصوروں اور عیوب میں انہیں نصیحت کرو۔ ان کی کمزوریوں پر حتی الوسع پردہ ڈالو، سوائے ایسے عیوب کی جن کی پردہ پوشی اللہ کے نزدیک جائز نہیں۔ جب تمہیں ان کی کسی بات پر غصہ آئے تو خود پر قابو رکھو۔ اگر ان سے راضی ہو، تو بھی اپنے آپ میں رہو۔ دونوں باتوں میں تمہیں اُن کے اور اپنے مابین ایک عمدہ اور اچھا مسلک اختیار کرنا چاہیے۔ ان پر عنایات، حقوق کے لحاظ اور ان کی محرومی میں احتیاط و اعتدال سے کام لو۔ جو دن بھی گزر جائے اور اس میں تم آدمیوں کے حقوق پُورے کر سکے، اسے غنیمت سمجھو۔''

گو حضرت عمر بات بات پر افسروں کا حساب کرتے تھے۔ ان کی خبر گیری فرماتے، اور وقتاً فوقتاً اپنے آدمی ان کے اعمال کے لیے بھیجتے رہتے اس کے باوجود وہ مجرم افسروں کے خون سے ہاتھ نہ رنگتے۔ جو اُن کے معیار پر پورے اُترتے، ان کو برقرار رکھتے، جو نااہل ہوتے، انہیں معزول کر دیتے۔ اور ایسی سزا دیتے جس سے وہ ظالم نہ ٹھہرائے جاتے۔ تاریخ شہادت دیتی ہے کہ اُنھوں نے اپنے کسی عامل یا عہدے دار کے خون سے ہاتھ نہیں رنگے۔ وہ خود فرمایا کرتے:

''وُہ اللہ کے پاس اپنی خیانتوں کے بوجھ سے لدے جائیں، یہ مجھے زیادہ پسند ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ اُن کے خون سے ہاتھ رنگے ہوئے اللہ کے حضور حاضری دُوں۔''

مدینہ کے والی، ابوبکر بن محمد بن حزم عالم اور بہت ہی ذہین فقیہ تھے۔ حضرت عمر نے اُن سے بہت کام لیے۔ حضرت عمر بڑی باقاعدگی کے ساتھ انھیں خطوط لکھتے اور ہر ضروری امر پر ان کو احکام دیتے۔ حضرت عمر کے شروع دور میں ابن حزم کے نام ان کے جو مکتوب آئے ان میں یہ اہم مکتوب بھی تھا:

''گھر میں بیٹھ رہنے سے اجتناب کرو۔ لوگوں سے ملو جلو، ان کے پاس بیٹھو۔ انھیں اپنے پاس بلاؤ۔ جب وہ تمہارے پاس آئیں تو اپنی مجلس میں انھیں ایک جیسی نشستیں دو۔ اُن پر ایک طرح کی نگاہ ڈالو۔ ان میں کوئی آدمی خواہ وہ کوئی بھی ہو، تمہارے نزدیک زیادہ معزز محترم نہیں ہونا چاہیے۔ لوگ یہ کہیں کہ امیر المومنین کے جو عزیز و اقارب ہیں، آج کے دن یہ سب عوام کے ہم پلہ ہیں۔ بلکہ میرے نزدیک اگر کبھی ان میں اور عوام میں کوئی جھگڑا پیدا ہو تو عوام کو ان پر ترجیح دی جائے۔ اگر تمہیں کسی فیصلہ میں دشواری محسُوس ہو تو ہمیں لکھو۔''

کوفہ و ملحقات کے گورنر عبدالحمید بن عبدالرحمن بن زید بن الخطاب حضرت عمر کے پسندیدہ گورنر تھے۔ یہ اسلامی مملکت کا سب سے بڑا صُوبہ تھا۔ وہاں اکھڑ قسم کے لوگ آباد تھے۔ خصوصیت سے کوفہ کے لوگ تو بہت ہی ظالم تھے۔ وہ کسی صلح جُو اور امن پسند حاکم کی پروا نہیں کرتے تھے۔ انھیں تو عبیداللہ بن زیاد اور حجاج بن یوسف قسم کے حاکم سیدھا

www.urdugam.com

کر سکتے تھے۔ لیکن عمر بن عبدالعزیز کو اس قسم کے حاکم پسند نہ تھے۔

ان کے نزدیک حجاج سب سے بُرا حاکم تھا۔ اور اس کی روش اللہ کے دشمنوں کی روش تھی۔ یہی سبب تھا اُنھوں نے کوفہ اور اس کے ملحقات کی حکومت عبدالحمید کے سپرد کی، جو حضرت عمر فاروقؓ کے بھائی، زید کے پوتے تھے۔ وہ اپنے وقت کے بہت بڑے عالم اور اور بہت بڑے سیاست دان تھے۔ عبدالحمید کی عادتیں بہت سلجھی ہوئی تھیں۔

ابن سعد فرماتے ہیں، عبدالحمید دمشق سے چل کر اور پروانہ امارت لے کر کوفہ آئے، تو اُنھیں حضرت عمر کا جو پہلا مکتوب موصول ہوا۔ اس کی صرف ایک سطر تھی اور چند سیہ الفاظ تھے:

"لوگ شیطان کی کارفرمائی اور ظالم بادشاہ کے ظلم کے سبب تباہ ہو جاتے ہیں۔ میرا خط جب تمہارے پاس آئے، اسی لمحے ہر حق دار کو اُس کا حق دے دو۔ حقدار کی حق رسی ہی اچھے نظام کی بنیاد ہے۔ یہی سنت خداوندی ہے اور یہی طریق اسلام ہے۔"

مصر حضرت عمر بن عبدالعزیز کو بہت پسند تھا کہ وہاں انھوں نے والد کے ساتھ بہت وقت گزارا تھا۔ انھوں نے ایک قابل عالم، حیان بن شریح کو مصر کا حاکم مقرر کیا۔ شریح نے مصر میں اللہ کی حدُود کی پابندی کی۔ لوگوں کے ساتھ انصاف و عدل برتا۔ کسی پر زیادتی نہ کی۔ ہر ایک کے حقوق پُورے کیے۔ مسلمانوں ہی کو خوش نہیں رکھا۔ غیر مسلم رعایا کے دل بھی جیت لیے تب غیر مسلم رعایا بڑی کثرت سے مسلمان ہوئی۔ حیان نے حضرت عمر کو لکھا:

"ذمی بہت کثرت سے اسلام لا رہے ہیں اور جزیہ بہت کم ہو گیا ہے۔" حضرت عمر نے اُنھیں لکھا:

اللہ نے حضورِ اکرم ﷺ کو داعی بنا کر بھیجا تھا۔ اُنھیں جزیہ وصول کرنے یا انسانوں پر جرمانے لگانے والا نہیں بنایا تھا۔"

حضرت عمر بن عبدالعزیز کو یہ فخر حاصل ہے کہ ان کے ساتھیوں میں حضرت حسن بصری، حضرت ہران اور حضرت شعبی بھی تھے۔ حضرت حسن بصری بصرہ کے قاضی القضاۃ تھے۔ پھر اُنھوں نے استعفیٰ دے دیا۔ اس کے باوجود بصرہ کے گورنر کو حکم تھا کہ اُن سے پوچھے بغیر کوئی اہم فیصلہ نہ کرے۔

حضرت ہران حضرت عمر کے بہت گہرے دوستوں اور بڑے مشیروں میں سے تھے۔ ابن سعد کی روایت رو سے حضرت ہران کے علاوہ رجاء بن حیوٰۃ، عمرو بن قیس، عون بن عبداللہ اور محمد بن زبیر بھی ان کے مشیر تھے۔

ہران کو حضرت عمر نے جزیرہ کی حکومت سونپی تھی۔ کام ذرا سخت تھا۔ اُنھوں نے کئی بار استعفیٰ دیا مگر حضرت عمر نے اُن کا استعفیٰ قبول نہیں کیا۔ جب بھی اُنھوں نے کام کی زیادتی کی شکایت کی۔ اُنھیں تسلی و تشفی دی اور لکھا:

"تم نے لکھا ہے کہ حکومت اور خراج کی وصولی کا کام بہت مشکل ہے۔ تمہیں زیادہ تکلیف دینا نہیں چاہتا۔ تمہارے پاس جو مال آئے، اس میں سے حق کے ساتھ حلال مال قبول کر لو اور جو مسائل پیش آئیں، ان میں صداقت کو ملحوظ رکھ فیصلہ کر دو۔ اگر کوئی بات اُلجھ جائے تو مجھ سے مدد لو اور مجھے لکھو۔"

ہران کے علاوہ دوسرے عمال کے نام بھی ان کی ہدایات اسی قسم کی تھیں۔ حضرت عمرؒ اپنے عمال پر جس طرح نظر رکھتے، یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ عمال رعایا پر زیادتی نہ کر پاتے۔ ان کے دورِ حکومت میں پوری کی پوری رعایا یوں سمجھنے لگی تھی جیسے مہربان اور فرض شناس ماں باپ کے سائے تلے جی رہی ہے۔

عافیہ مقبول جہانگیر

سچا بندھن

ایک نادان لڑکی کی کہانی جو ازدواجی پیار کو فضول بدیسی رسموں سے مشروط کر بیٹھی تھی

آج صبح ہی سے اُس کا موڈ بُری طرح خراب تھا۔ باورچی خانے میں کام کرتے، ناشتا بناتے، وہ بات بے بات ملازموں کے ساتھ اُلجھتی رہی۔ بچوں کو اسکول بھیجتے وقت بھی اُس کے چہرے پر عجیب تناؤ سا محسوس ہو رہا تھا۔ بچے ماں کا یہ روپ دیکھ کر سہم گئے تھے اور آج کسی نے بھی ناشتے کی میز پر نہ تو ضد کی نہ ہی شرارتیں، جو ہر روز کا معمول تھا۔ عمر اُس کی ایک ایک حرکت محسوس کر رہا تھا لیکن اُس نے فی الحال خاموش رہنے ہی میں عافیت جانی۔ وہ ایک سلجھے ہوئے مزاج کا انسان تھا۔ ہر مسئلے کی تہ تک پہنچ کر ٹھنڈے دل سے اور نرم گفتگو سے اپنی بات سمجھانے کا عادی تھا۔ لہٰذا اُس نے ثانیہ کو اپنی من مانی کرنے دی۔ اس وقت اُسے کچھ بھی سمجھانا بے کار تھا۔

اُن کی شادی ہوئے پانچ سال گزر چکے تھے

www.urdugam.com

اور دو پیارے پیارے بچے بھی اُن کی زندگی کا اٹوٹ حصہ بن چکے تھے۔ اُن کی مثالی زندگی پورے خاندان میں مشہور تھی۔ ثانیہ ایک محبت کرنے والی بیوی اور دن رات ایک کر دینے والی ماں ثابت ہوئی تھی۔ اپنے گھر بار کو سجانے، سنوارنے اور نت نئے کھانے بنانا، بچوں کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ تمام دوسرے امور بھی بخوشی نہایت کامیابی کے ساتھ انجام دیتی آئی تھی اور کبھی اُن کے مابین کسی بڑی بات کو لے کر نہ تو جھگڑا ہوا نہ ہی وہ اُن میں سے تھی جو بے جا فرمائشیں کر کے شوہروں کا ناک میں دم کیے رکھتی ہیں۔ دوسری طرف عمر بھی ایک پڑھا لکھا، سلجھا ہوا اور دھیمے مزاج کا انسان اور ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں اچھے عہدے پر فائز تھا۔ یوں زندگی پھولوں کی طرح مہکتی مسکراتی گزر رہی تھی۔

کچھ ہی ماہ پہلے ایک شاپنگ مال میں اچانک ثانیہ کی ملاقات اپنی پرانی سہیلی سے ہوگئی۔ دونوں دیر تک گزرے دنوں کی باتیں کرتی اور کالج کے سنہرے دور کو یاد کرتی رہیں۔ بہترین لباس میں ملبوس ثانیہ کے سامنے اُس کی دوست عام سے حلیے میں متوسط طبقے کی نمائندگی کر رہی تھی۔ ثانیہ طبقاتی فرق وغیرہ پر یقین نہیں رکھتی تھی۔ وہ ایک خوش اخلاق اور محبت کرنے والی لڑکی تھی جس کے لیے دولت مند ہونا نہ ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ وہ تو بس چھوٹی چھوٹی باتوں اور چیزوں میں ہی محبت تلاش کر کے خوش ہو جانے والوں میں سے تھی۔ لیکن نازلی کی باتوں سے نجانے کیوں ثانیہ کو لگا کہ وہ اُس سے زیادہ خوش ہے۔ اُس کی باتوں اور انداز میں ایک جوش اور کھنک جیسے عنصر نمایاں تھے جبکہ ثانیہ عمر کی سنگت میں رہ کر خود بھی دھیمے مزاج میں ڈھل چکی تھی۔

ثانیہ اُسے اپنے ساتھ گھر لے آئی اور یوں وہ اچانک ہونے والی ملاقات اب ہر دوسرے دن ہونے لگی۔ کبھی نازلی اور اُس کا شوہر ثانیہ کی طرف مدعو ہوتے تو کبھی ثانیہ اور عمر بچوں کے ساتھ اُن کے گھر چلے جاتے۔ سب کچھ بہت ٹھیک چل رہا تھا کہ اچانک ثانیہ کے انداز و اطوار میں تبدیلی آنے لگی۔ وہ جیسے ہر وقت شاکی رہنے لگی۔ کبھی اُسے سرپرائز گفٹ کی کمی محسوس ہونے لگتی تو کبھی اچانک سے کوئی تقریب منعقد کر لینے کا خیال آجاتا۔ شروع میں عمر نے کوئی خاص نوٹس نہیں لیا مگر جب دن بہ دن ثانیہ کے معمولات میں نمایاں تبدیلی آنے لگی تو عمر اُسے ٹوکے بنا نہیں رہ سکا۔

''دیکھو ثانیہ، تمہیں شاید احساس ہی نہیں کہ آئے روز کی ان تقریبات اور دعوتوں سے گھر کا کتنا ہرج ہونے لگا ہے۔ بچے بھی نظر انداز ہو رہے ہیں۔ تم نہ وقت پر سوتی ہو نہ جاگتی ہو۔ تمام دن ادھر اُدھر کی بے کار گفتگو، تحفے تحائف لینے دینے کا سلسلہ، بے مقصد شاپنگ، ہر تیسرے دن باہر سے کھانا منگوانا یا ہوٹلنگ کرنا۔ یہ سب بُری بات نہیں مگر ان میں اعتدال نہ ہو تو زندگی ڈگمگا جاتی ہے''۔ عمر نے رسان سے اُسے سمجھایا۔ اُسے پوری اُمید تھی کہ ثانیہ نہ صرف اُس کی بات سمجھے گی بلکہ احساس بھی کرے گی کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ لیکن ثانیہ تو جیسے ہتھے سے ہی اکھڑ گئی۔

''پانچ سال ہو چکے عمر ہمیں ساتھ رہتے ہوئے۔ کبھی میں نے تم سے بے جا ضد نہیں کی۔ نہ ہی تم سے کچھ مانگا۔ لیکن پھر بھی دل میں ایک اُمید ہوتی تھی کہ کبھی تم مجھے اچانک سرپرائز گفٹ دو۔ کبھی تو میری تعریف کرو۔ ایک ہی طرح کے معمولات نبھاتے نبھاتے میں بور ہو چکی ہوں۔ روز جاگنا، تمہیں اور بچوں کو تیار کر کے بھیجنا، کھانے پکانا، گھر کا خیال رکھنا۔ بس یہی سب کچھ رہ گیا ہے جیسے میری زندگی میں۔ تم سے کبھی اتنا نہ ہو سکا کہ میری تعریف میں دو لفظ بول

دو۔ صبح دفتر جاتے یا آنے کے بعد مجھے اتنا ہی کہہ دو کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے اور تمہیں میری فکر ہے۔ نہ کبھی تم نے مجھے کبھی کوئی محبت بھرا میسج بھیجا نہ ہی دفتر سے مجھے کبھی فون کر کے یہ کہا کہ تم مجھے مِس کرتے ہو۔ تم نہیں جانتے عمر، ان سب کے بغیر زندگی کتنی بے رونق اور پھیکی ہو جاتی ہے۔ جانتے ہو؟ نازلی کا شوہر ہر صبح اُسے آئی لو یو کہتا ہے۔ اُسے وقتاً فوقتاً کارڈز دیتا رہتا ہے۔ کبھی اچانک اُس کے لیے تحفہ لے آتا ہے''۔

''اوہ! تو یہ بات ہے۔'' عمر نے مسکراتی ہوئی نظروں سے اُسے دیکھا۔ وہ اس نظر پر فدا ہونے کی بجائے اندر تک سلگ اُٹھی اور بولی۔

''اب جب تمہارے پاس کوئی جواب نہیں تو تم یوں ڈھیٹوں کی طرح مسکرا رہے ہو جیسے میں نے اب تک بالکل بے کار باتیں کی ہوں''۔ ثانیہ کا پارہ ساتویں آسمان پر تھا۔

''اچھا دیکھو ثانیہ۔ یہاں بیٹھو میرے پاس اور آرام سے میری ایک بات کا جواب دو۔ ''نازلی کا شوہر کام کیا کرتا ہے؟ جہاں تک مجھے علم ہے اُس کی ایک چھوٹی سی دکان ہے اور بقول اُس کے وہ کبھی دکان پر جاتا ہے تو کبھی نہیں۔ میں اب تک جتنی بار بھی اُس سے ملا مجھے یہی تاثر ملا کہ وہ اپنے اور بیوی بچوں کے مستقبل کو لے کر ذرا بھی فکر مند نہیں نہ ہی اُسے زیادہ محنت کرنا پسند ہے۔ ایک بار میں نے اُس سے پوچھا بھی تھا کہ مہنگائی کے اس دور میں آخر گھر کا خرچہ اور تمام ضروریات وہ کس طرح پوری کرتا ہے۔ ایک مرد کو گھر پر بیٹھ کر صرف باتیں کرنا اور عمل میں صفر ہونا زیب نہیں دیتا۔ جانتی ہو میرے اس سوال پر اُس نے کیا کہا؟ اُس کا کہنا تھا کہ اُسے فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ جب بھی پیسوں کی ضرورت ہو یا کوئی خرچہ کرنا ہو تو نازلی میکے جا کر باپ یا بھائیوں سے لے آتی ہے۔ تم ہی بتاؤ کیا یہ صحیح ہے؟

''مجھے حیرت ہوتی ہے تمہاری دوست پر جو مانگے ہوئے پیسے پہلے تو شوہر کے ہاتھ پر رکھتی ہے پھر جب وہ ان ہی پیسوں سے نازلی کا دل خوش رکھنے کے لیے کوئی چیز لے آتا ہے تو تمہاری دوست اِسے شوہر کی عظیم و لازوال محبت کا تحفہ سمجھتی ہے اور اپنی سہیلیوں میں بڑھ چڑھ کر بتاتی ہے۔''

''جو بھی ہو۔ بہر حال اُسے خوشی تو مل جاتی ہے نا۔ اُس کی زندگی بور تو نہیں ہے نا میری طرح۔'' ثانیہ اب بھی کسی صورت قائل نہیں ہوئی تھی۔ ''اور پتا ہے عمر؟ اس دفعہ تو بھائی صاحب نے نازلی کو ویلنٹائن ڈے پر بھی ایک خوبصورت سا تحفہ دیا۔ خاص طور پر اُسے وش بھی کیا اور پھر وہ دونوں سیر و تفریح کے لیے بھی گئے۔ بہت مزا کیا اُن دونوں نے۔ اتنا ہنس ہنس کر وہ مجھے بتا رہی تھی کہ جب وہ گھومنے گئے تو کتنے لوگوں نے انھیں رشک سے مڑ مڑ کر دیکھا اور کئی ایک نے تو اُن کی تصویریں بھی اُتاریں۔ کتنا اچھا لگا ہوگا نا انھیں یہ سب کرتے ہوئے۔ ہائے! بھرپور زندگی کا مزا۔'' ثانیہ نے حسرت سے کہا۔ عمر اُس کی اس واہیات آہ پر اور ایسی ''حسرت'' پر ہکا بکا رہ گیا۔ اُسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ اپنی اس نادان جذباتی بیوی کو کیسے سمجھائے کہ وہ لوگ جو مُڑ مُڑ کر انھیں دیکھ رہے تھے وہ کسی رشک و حسد کی وجہ سے نہیں بلکہ تفریحاً اور استہزائیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

''ثانیہ، تمہیں اندازہ بھی ہے؟ کہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ میاں بیوی کی پاکیزہ محبت کا یوں سرِ عام چھچھوروں کی طرح نمائش کرنا تمہیں محبت کا اظہار لگتا ہے؟''

www.urdugem.com

''اچھا بس اب آپ مجھے ہی غلط کہیں گے۔'' ثانیہ غصے میں کمرے ہی سے نکل گئی۔ عمر نے اُسے سمجھانے کا ارادہ موقوف کرتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اُسے صبح بہت ضروری میٹنگ کے لیے جلد دفتر جانا تھا۔ صبح ویسی ہی تھی جیسا اُس نے سوچا تھا۔ ثانیہ الجھتی کام نمٹاتی پھر رہی تھی اور وہ پُرسکون انداز میں بیٹھا ناشتے کے ساتھ اخبار کی سرخیوں پر نظر دوڑاتا رہا۔

دفتر میں تمام دن ایک بھرپور مصروفیت کے ساتھ گزرا۔ ادھر گھر پر ثانیہ نازلی کے ساتھ بڑی حسرت سے بیٹھی اُس کی باتیں سنتی اور بے دلی سے ہنستی رہی۔ اُس کا دل بھر بھر آرہا تھا۔ اُس کے پاس نازلی کو بتانے اور اترانے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں۔ اس کے نزدیک نازلی دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی تھی۔ بھلے ہی اس کا شوہر دن رات اپنی بیوی کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتا اور مختلف حیلے بہانوں سے پیسے بٹورتا ہو ''محبت'' تو کرتا تھا نا۔

شام کو عمر اپنے مخصوص وقت پر گھر کے دروازے پر موجود تھا مگر ثانیہ روٹھے موڈ کے ساتھ دروازہ کھول کر چپ چاپ واپس پلٹ گئی۔

ہونہہ! رات کو اتنی مغز ماری کی پھر بھی جناب اتنے ڈھیٹ ہیں مجال ہے کہ آج تو کم سے کم میرے شکوؤں کا اثر لیا ہوتا اور ایک آئی لو یو ہی کہہ دیا ہوتا۔ یہ کیا، کہ بس اسلام علیکم کہا اور بس۔ نازلی کے شوہر کو دیکھو۔ دروازے پر ہی ہیلو جان، ہائے ڈارلنگ، میں نے تمہیں بہت مس کیا، جیسے جملے بولتے ہوئے گھر کے اندر داخل ہوتا ہے۔ یہ ہوتی ہے زندگی۔ ثانیہ دل ہی دل میں جلتی کلستی بڑبڑاتی رہی اور چائے کے لوازمات تیار کرتی رہی۔

چائے کے برتن لے کر میز پر آئی تو عمر نے پوچھا:

''بچے کہاں ہیں؟''

''وہ ساتھ والی باجی کے گھر کھیلنے گئے ہیں۔'' ثانیہ نے بے پروائی سے جواب دیا۔

''تمہیں کتنی بار سمجھایا ہے ثانیہ کہ بچوں کو کسی کے گھر مت بھیجا کرو۔ ہم نہیں جانتے کہ کسی کے گھر کا ماحول اندر سے کیسا ہے؟ کون آتا اور جاتا ہے؟ وہاں کس قسم کی گفتگو ہوتی ہے۔ یہ سب ہمیں نہیں پتا ہوتا۔ تم سمجھتی ہی نہیں۔ بچوں کو عادت ڈالو کہ وہ ہمارے ساتھ ہی جائیں اور ساتھ ہی واپس آئیں۔ جاؤ انھیں بلالاؤ''۔

''اُف عمر! اب بچے ہیں تو کس کے ساتھ کھیلیں آخر۔ آپ نے تو اُن کی زندگیاں بھی بور اور ڈل بنادی ہیں''۔

ثانیہ کا موڈ پھر سے خراب ہونے لگا۔

''اچھا اچھا تم غصہ مت کرو اور یہاں آؤ میرے پاس بیٹھو۔ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔'' عمر نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے اُس کے لیے صوفے پر بیٹھنے کی جگہ بناتے ہوئے کہا۔

''جی کہیں جناب! آج کون سی نصیحت سنائیں گے''؟ ثانیہ کی بے زاری اور بدگمانی عروج پر تھی۔

''ثانیہ کیا تم جانتی ہو یہ ویلنٹائن ڈے کیا ہے؟ اسے کیوں منایا جاتا ہے؟''

''ظاہر ہے، محبت کرنے اور چاہنے والوں کو اپنی محبت کا یقین دلانے کے لیے''۔ ثانیہ نے جیسے جتاتے ہوئے کہا۔

''نہیں پگلی، یہ ایک دن کیا اظہار کروائے گا اور کیا منوائے گا۔ سچی اور پاکیزہ محبت صرف ایک دن کی محتاج نہیں ہوتی۔ یہ تو اُن لوگوں کا کھلونا ہے جو محبت جیسے لازوال جذبے کو بس چند لمحوں یا گھنٹوں میں تسخیر کر

لینے کے لیے دوسروں کو دیتے ہیں۔ وہ لوگ جو محنت، کردار اور سیدھے راستے پر چل کر محبت جیسے اعلیٰ و ارفع جذبے کی قدر کرتے ہوئے اسے پانا نہیں چاہتے بلکہ دللہ اسلام کی حدود و قیود کا کھلے عام مذاق اُڑاتے ہیں۔ اُن کے نزدیک نکاح جیسا مقدس بندھن کوئی اہمیت نہیں رکھتا اور وہ بس وقتی تفریح کے لیے ان تین لفظوں ''آئی لو یو'' کا سہارا لے کر خود کو عارضی خوشی پہنچاتے ہیں۔ اب جہاں تک بات ہے شادی شدہ جوڑوں کی کہ وہ آخر اس دن اظہارِ محبت کردیں گے تو کون سا گناہ ہوجائے گا۔

''اس کا جواب بھی بہت آسان ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ میاں بیوی کی محبت صرف ایک دن پر انحصار نہیں کرتی۔ یہ تو پوری زندگی کا ساتھ ہے۔ تمہیں لگتا ہے کہ میں تمہیں اس دن آئی لو یو نہیں کہتا یا ہر روز اظہار نہیں کرتا تو کیا میں تم سے محبت نہیں کرتا؟ یا تمہاری عزت و قدر نہیں کرتا؟ کرتا ہوں، اسی لیے تو اپنی خالص محبت کو یوں عام نہیں کرتا نا ہی بے مول کرتا ہوں۔ میری محبت کو کانوں سے نہیں دل سے محسوس کرو۔

''میں تمہیں روز صبح مسکرا کر دیکھتا ہوں، یہ میری محبت ہے۔ میں تمہاری تعریفوں کے پُل نہیں باندھتا مگر جب تم میرے لیے میرے بچوں کے لیے تمام دن اتنی گرمی و سردی میں کھانے پکاتی ہو، راتوں کو جاگ کر ہمارے آرام و سکون کا خیال رکھتی ہو۔ تو کیا میری آنکھوں میں اپنے لیے تشکر نہیں دیکھتیں؟ میں جب تم سے مسکرا کر نرم لہجے میں بات کرتا ہوں اور تم ہنستی ہو، تو نہ جانے کتنے فرشتے ہمارے لیے دعائیں کرتے ہیں۔

''میں تمہیں گھر آتے ہی دروازے پر ہائے ہیلو کہنے کی بجائے اسلام و علیکم کہتا ہوں کیوں کہ میں اپنی شریک حیات کو دعا دیتا ہوں اس پر سلامتی بھیجتا ہوں۔ گھر سے جاتے ہوئے میں بائے ڈارلنگ نہیں کہتا، مگر تمہیں اللہ حافظ کہتے ہوئے اللہ کی پناہ میں سونپتا ہوں۔ دفتر میں یہاں وہاں کی ہانکنے اور فضول وقت گزارنے کے بجائے میں جی جان سے محنت کرتا ہوں تاکہ اپنے بیوی بچوں کو بہترین رزقِ حلال کما کر ان کی ہر ضرورت کو پورا کرسکوں۔ میری بیوی کو کسی کے سامنے اپنی ضرورت کا رونا رو کر پیسے نا مانگنے پڑیں اور اس کا وقار اور عزت ہمیشہ قائم رہے۔ میں فضول خرچی یا بلاوجہ یہاں وہاں پھر کر پیسے ضائع نہیں کرتا۔ ہاں میں اپنے بچوں اور بیوی کا صدقہ ادا کرتا ہوں تاکہ ہمارا گھر کسی بُری آفت اور ناگہانی پریشانیوں سے محفوظ رہے۔

''مانتا ہوں کہ میں کوئی فلمی قسم کا رومانوی انسان نہیں، لیکن ثانیہ میں عملی محبت پر یقین رکھتا ہوں۔ میں کسی حد تک تمہارا یہ شکوہ قبول کرتا ہوں کہ مجھے کبھی کبھی اظہار کرنا چاہیے، مگر بس زبانی اظہار ہی ہو اور عمل نہ ہو تو کیا تم خوش رہوگی؟ باتیں کروں میں چاند تاروں کی اور عملی طور پر کچھ نہ کروں تو پھر بھی تم خوش رہوگی؟

''سب سے اہم بات کہ اگر تمہیں اس دن کی حقیقت معلوم ہوتی تو تم کبھی نہ چاہتیں کہ میں تمہیں اس دن کے حوالے سے کوئی وش کروں یا محبت بھرا پیغام دوں۔ کیونکہ اس دن کا پاکیزہ اور خالص محبت سے کوئی تعلق ہی نہیں''۔

ثانیہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ وہ حرف بہ حرف سچ کہہ رہا تھا۔ نہ جانے کیوں وہ ہی ناشکرا پن کر بیٹھی تھی۔ سچ ہے ہمیں نعمتوں کا احساس ہی نہیں ہوتا اور ہم دنیا کی فضول رسموں، دکھاوے کو ہی محبت سمجھ بیٹھتے ہیں۔ اصل محبت وہ تھی، جو عمر کرتا تھا۔ خالص اور سچی۔ ◆◆◆

www.urdugem.com

مقصود احمد چغتائی

منکہ ایک بوائے اسکاؤٹ

دنیا بھر میں سیر و سیاحت کرنے والے سیاح کی دلچسپ یادیں

میں زمانہ طالب علمی سے بوائے سکاؤٹ چلا آرہا ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ میں اس وقت پانچویں جماعت کا طالب علم تھا جب ہمارے رنگ محل مشن ہائی سکول کے استاد محمد نواز جو کہ فزیکل ایجوکیشن کے ڈائریکٹر تھے، ہماری جماعت میں آئے اور ہمیں سکاؤٹنگ کے بارے میں بتایا۔

پڑھائی جاری رکھنے کے ساتھ ساتھ پوری دنیا گھومنے کی خواہش شروع سے ہی میرے دل میں چھپی بیٹھی تھی لیکن اس کے لیے موزوں وقت، پیسے اور دیگر لوازمات پورے کرنا ہمیشہ مشکل نظر آتا۔ جب مجھے سکاؤٹس کی عالمی تنظیم کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل ہوئیں تو مجھے اپنی مراد پوری ہوتی نظر آئی۔ اسکاؤٹنگ کے دو اہم اصول ہیں: مہم جوئی اور کفایت شعاری۔ چنانچہ میں نے اپنے لیے یہ ٹارگٹ متعین کیا کہ پوری دنیا گھومنے کی مہم کو سر کرنے کی خاطر مجھے کفایت شعاری سے کام لینا ہوگا تاکہ زیادہ سے زیادہ استفادہ کرسکوں۔

آخر ۱۲/اگست ۱۹۹۳ء کو یورپی ممالک کی سیر و سیاحت کرنے نکل کھڑا ہوا۔ میں دو ماہ اکیس دن پاکستان سے باہر رہا جس کے دوران پانچ سو گھنٹے بسوں اور ٹرینوں وغیرہ پر سفر کرتا رہا۔ قبل ازیں ۱۹۸۹ء میں چین کا بذریعہ سڑک سفر کیا جو آٹھ روز کے دوران چار دن مسلسل سفر پر محیط ہے۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ طویل سفر کے دوران تندرستی برقرار رہی اور کبھی دوران سفر ہنگامی ضرورت پیش نہیں آئی۔ بین الاقوامی سفر کے دوران دن رات بارہ تا چوبیس گھنٹے تک مسلسل سفر کیا۔ جہاں کہیں بس زیادہ دیر رکتی تو ہلکی پھلکی ورزش ضرور کرلیا کرتا۔ اس سے اعصاب قابو میں رہتے اور سفر کی تکان میں کافی کمی محسوس ہوتی۔ نیز اگلے سفر کو جاری رکھنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا۔

انگلستان میں دو مشہور شہروں، لندن اور مانچسٹر کے علاوہ بے شمار چھوٹے بڑے قصبے اور دیہات دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ لندن میں جہاں میں قیام پزیر تھا وہاں سے تقریباً دو اڑھائی کلو میٹر کے فاصلے پر دریائے ٹیمز پر واقع ٹاور برج دیکھنے ہم اکثر پیدل چلے جاتے۔ ٹاور برج کے قریب ہی لندن میوزیم واقع ہے جہاں کوہ نور ہیرے سمیت دیگر قیمتی ہیرے جواہرات اور نوادارات برائے نمائش رکھے گئے ہیں۔

لندن کا دو سو سال پرانا ریلوے سسٹم نہایت عمدہ اور متاثر کن ہے۔ اتنے بڑے شہر میں سفر، کار پارکنگ، ٹریفک کا ہجوم اور دیگر مسائل کی وجہ سے بہت زیادہ وقت لگتا ہے جبکہ زیر زمین ٹرین کے ذریعے یہی فاصلہ کم وقت میں طے ہوجاتا ہے۔ مصروف ترین علاقوں میں زیادہ ٹرینیں رکھی گئی ہیں جو چند منٹوں کے وقفوں سے چلتی ہیں۔

میں سوئٹزرلینڈ کے تجارتی شہر زیورچ بھی گیا۔ اس شہر کے متعلق مشہور ہے کہ زیورچ کے بینکوں میں لاکر سونے سے بھرے ہیں۔ یورپین ممالک کی اہم ترین تجارتی منڈی ہے اور وہاں زرکا لین دین کروڑوں نہیں اربوں کھربوں میں ہوتا ہے۔ یہاں کے بینک اپنے کسٹمرز سے سروس چارجز تک وصول نہیں کرتے۔ دراصل لوگ بینک میں زیادہ سے زیادہ ڈپازٹ لاتے ہیں۔ ان سے بینک خوب منافع کماتے ہیں۔ کئی ممالک میں بیک وقت جرمن، فرنچ اور اٹالین سرکاری زبانیں رائج ہیں جبکہ انگلش بھی بولی جاتی ہے۔

سوئٹزرلینڈ کا شہر باسل اپنے محل وقوع کی وجہ سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس شہر کی ایک سمت تو جرمنی ہے تو دوسری جانب فرانس۔ یہ سوئٹزرلینڈ کا ایک چھوٹا سا شہر ہے جس کی آبادی بیس بائیس ہزار سے زیادہ نہیں۔ نہایت صاف ستھرا اور گندگی سے پاک اس شہر کا ریلوے اسٹیشن بھی بہت خوبصورت ہے۔ اس شہر کے کاروباری مراکز میں ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ ہے جس کا نام ''حسن برگ'' ہے۔ جب میں نے اس کا نام پہلی مرتبہ سنا تو بہت خوش ہوا کہ ضرور یہاں مسلمان ہوں گے کیونکہ برگ فارسی کا لفظ ہے اور حسن مسلمانوں کا نام ہوتا ہے۔ یہ بھی سوچا کہ ممکن ہے اس ریسٹورنٹ کو پاکستانی چلا رہے ہوں۔ وہاں میرے دوست مارک فشر نے ملاقات کے لیے مجھے سات بجے شام بلایا تھا۔ اس وقت دوپہر کے ڈھائی بجے تھے۔ میں نے سوچا کہ ابھی جاکر ریسٹورنٹ دیکھ کر آتا ہوں۔ جب ریسٹورنٹ میں داخل ہوا تو دیکھا کہ وہاں تمام مقامی لوگ تھے اور یہ بار کی شکل اختیار کیے ہوئے تھا۔ پاکستانیوں والے نام سے کوئی مناسبت نہیں تھی۔ مجھے تھوڑی سی مایوسی اور حیرت ہوئی۔

شام سات بجے میرا دوست ریسٹورنٹ میں ملا۔ آخر کار مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے ریسٹورنٹ کے نام کے معنی پوچھے تو اس نے دلچسپ جواب دیا اور بتایا کہ مقامی زبان میں حسن کو Rabit اور برگ کو Castle کہتے ہیں۔ چنانچہ حسن برگ سے مراد Rabits Castle کے ہیں۔ جب میں نے اردو الفاظ کے معنی بتائے تو وہ خوشگوار طور پر حیرت زدہ ہوگیا۔ ایک اور دلچسپ بات جو اس نے بتائی وہ یہ تھی کہ سوئٹزرلینڈ میں بیک وقت چار قومی زبانیں ہیں یعنی جرمنی، فرنچ، اطالوی اور رومن۔ اگر آپ ایک سگریٹ کا پیکٹ یا اور کوئی معمولی چیز بھی خریدیں تو اس پر تفصیل ان چار زبانوں میں تحریر ہوگی۔

ذاتی طور پر مجھے سوئٹزرلینڈ بہت زیادہ پسند آیا۔ وہاں ہر چیز آنکھوں کو بھلی لگتی ہے۔ میں یہ سوچتا رہا کہ یہاں کی ہر چیز خوبصورت ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟ مجھے فوری طور پر جواب نہ مل سکا۔ تاہم بغور جائزہ لینے پر مجھے احساس ہوا کہ سوئٹزرلینڈ کی خوبصورتی وہاں کی صفائی اور قرینہ میں پوشیدہ ہے۔ تاہم قدرتی خوبصورتی دلکشی میں مزید اضافہ کرتی ہے۔

یہ دعویٰ کہ سوئٹزرلینڈ اس لیے خوبصورت ہے کہ یہاں قدرتی مناظر ہیں کسی حد تک تو صحیح ہے مگر اس سے زیادہ قدرتی خوبصورتی اور دلکشی ترکی میں ہے۔ چونکہ ترکی مسلمان ملک ہے اس لیے مغربی اسے کسی طرح بھی سوئٹزرلینڈ سے زیادہ خوبصورت ماننے پر تیار نہیں۔ حالانکہ جتنی قدرتی دلکشی اور رعنائی ترکی میں ہے شاید ہی یورپ کے کسی ملک میں ہوگی۔

عموماً ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ جو لوگ روانی سے انگریزی بولتے ہیں وہ آسانی سے اپنی بات سمجھا سکتے ہیں۔ یہ ایک غلط فہمی ہے۔ صحیح معنوں میں صرف انگلینڈ اور امریکہ ایسے دو

www.urdudigest.com

ممالک ہیں جہاں انگلش بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ انگلینڈ کے قریب ترین ملک فرانس، جرمنی، ہالینڈ، بیلجیم وغیرہ میں بھی انگلش کو دوسرا یا تیسرا درجہ حاصل ہے جبکہ مقامی زبانوں کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ اگر ہم جرمنی میں پہلے دو سوال انگلش میں پوچھیں تو جرمن ہمیں جواب دے دیں گے مگر تیسرے سوال پر وہ معذرت کریں گے کہ انگلش نہیں جانتے۔ خواہ وہ جانتے ہی کیوں نہ ہوں۔

میرے دوست رب نواز ہمبرگ جرمنی میں کئی سال سے مقیم ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ جرمن بوڑھے انگلش میں پوچھے گئے سوال کا بہت برا مناتے ہیں۔ تاہم نوجوان نسل عظیم یورپ پر زیادہ یقین رکھتی ہے اور انگریزی زبان سے زیادہ متعصب نہیں۔ زبان کی طرح غیر ملکی کرنسی اس سے بھی زیادہ مسئلہ بن جاتی ہے۔ کسی بھی ملک میں قدم رکھتے ہی اس ملک کی کرنسی استعمال کرنی ہوتی ہے۔

ایک اجنبی شہر میں پہنچ کر لوکل ٹرین، ٹرام یا بس کا روٹ اور نقشہ حاصل کرنا بہت سُودمند ہے۔ یورپ میں عموماً ریلوے اسٹیشنوں پر سامان رکھنے کے لیے لاکرز کی سہولت موجود ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ بھاری سامان ریلوے اسٹیشن پر رکھ لیں اور اپنے پاس صرف ضروری کاغذات، پتے، کیمرا اور خورونوش کی اشیاء رکھیں۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ آپ بھاری اشیاء اٹھانے کی زحمت سے بچ کر پیدل چلتے سیاحت کر سکیں گے۔ دوسرا اہم فائدہ ٹیکسی کے بھاری کرایے سے بچنا ہے جس کا براہ راست تعلق آپ کی جیب سے ہے۔ اس کے علاوہ پبلک ٹرانسپورٹ استعمال کر کے بھاری اخراجات سے بھی بچ سکتے ہیں۔

میں نے اب تک اٹھارہ ہزار کلومیٹر سے زیادہ ہائیکنگ کی ہے جس کی تفصیل کچھ یوں ہے: پیرس فرانس میں ۲۲ کلومیٹر، باسل سوئٹزرلینڈ ۱۷ کلومیٹر، کوپن ہیگن ڈنمارک میں ۲۷، برسل بلجیم میں ۱۲، انگلستان لندن میں ۱۳، ہیمبرج جرمنی میں ۱۸ اور اندرون ملک ۱۴۸ کلومیٹر۔

دورانِ سفر مجھے بے شمار لوگوں سے ملنے اور ان سے تبادلۂ خیال کا موقع ملا۔ چونکہ میں بنیادی طور پر بین الاقوامی سکاؤٹ ہوں اس لیے میرے سفر کا مقصد انسانوں کے درمیان بھائی چارہ، محبت، اخوت اور امن کے مشن کو پھیلانا ہوتا ہے۔

بلغاریہ کے شہر صوفیہ میں ناروے کی پریشان حال دو لڑکیوں سے اسٹیشن پر ملاقات ہوئی جو لمبے سفر کے بعد واپس جا رہی تھیں مگر ان کے پاس پیسے ختم ہو چکے تھے۔ انہیں پولینڈ کے ایک سیاح نے ایک سو پچاس ڈالر ادھار دیے جبکہ میں نے انہیں صوفیہ میں قیام کے دوران میزبانی کی دعوت دی جو انہوں نے بخوشی قبول کر لی۔ یوتھ ہوسٹل اور ٹیکسی وغیرہ پر میرے تقریباً پانچ سو روپے خرچ ہوئے۔ انھوں نے رقم واپس لوٹانے کے لیے میرا پتا مانگا مگر میں نے منع کر دیا۔

اسی شہر میں ناروے کی ایک خوبصورت لڑکی نے مجھے قسمت کا پتھر دیا۔ بعد ازآں بلغاریہ میں رونگٹے کھڑے کرنے والے اور دل لرزا دینے والے واقعات رونما ہوئے جس میں چند ڈاکوؤں نے میرا تمام قیمتی سامان چھین لیا، مجھ سے میری رقم ہتھیا لی اور مجھے مار مار کر ادھ موا کر دیا۔ اس ڈکیتی کی واردات میں یوکرائن کے ظالم، سفاک اور جابر ڈاکو اپنی طرف سے مجھے جان سے مار کر بلغاریہ کے دور دراز اوڑ ناوٹزا نامی علاقے کے جنگلات میں پھینک کر چلے گئے تھے۔ انھوں نے میرے دونوں ہاتھ اور پاؤں اس طرح سے باندھے کہ میں آزادانہ طور پر چلنے سے قاصر تھا۔ طویل اور تکلیف دہ انداز میں رینگ کر میں ان جنگلات سے باہر نکلا اور قسمت کے پتھر کی بدولت میں افسانوی شہزادے کی طرح نہ صرف اپنی جان بچا سکا بلکہ بعد میں ملنے والے میرے سامان میں سے پانچ سو ڈالر کے ٹریولرز چیک بھی مل گئے جس سے میں اپنا سفر دوبارہ شروع کر سکا۔ ◆◆◆

اے میری ماں!

منفرد شاعر، سید ضمیر جعفری کی جسم و دل شادکام کر دینے والی دلنشیں شاعری

والدہ مرحومہ کی یاد میں

اے پیکرِ مہر و وفا　　اے مخزنِ صدق و صفا
تیرا طریق بے ریا　　تیرا دل درد آشنا
ہر سانس میں نامِ خدا　　ہر گام پر صلِ علیٰ
وہ صبح گاہی کی دعا　　اشکوں میں بھیگی مامتا
وہ آنسوؤں کا قافلہ　　وہ دھڑکنوں کا سلسلہ
میرے چراغ رہ نُما
میں جو بھی ہوں　　جو کچھ بھی تھا
تو ابتدا تو انتہا　　میری متاع دو جہاں
اے میری ماں
تجھ سے مرے آبا کا گھر
اک حجلہ مسرور تھا　　اک قریہ پُرنور تھا
اک آسمانی چاندنی　　اک مطمئن آسودگی

سید ضمیر جعفری

اک خوبصورت سادگی　　اک بے کدُورت زندگی
پھولوں سے بڑھ کر تازگی　　کرنوں سے خوش تر زندگی
جیسے بھرے ساون سمے　　برکھا کی برسی شام کو
ست رنگ پاکیزہ دھنک　　اپنے چراغوں کو لیے
میداں سے اُٹھ کر دور تک　　اُونچے پہاڑوں پر جلے
اور وقت ستانے لگے　　برگد کی محرابوں تلے
یہ نعمتیں یہ راحتیں
یہ عزّتیں یہ شہرتیں
دنیا میں جو کچھ بھی ملا　　تیری دعاؤں سے ملا
تو چاہتوں کا آستاں　　تو برکتوں کی کہکشاں
تسکینِ دل، تنویرِ جاں　　میری متاع دو جہاں
اے میری ماں!

...☆...☆...

نقش و عکس

زندگی!
ثمر بھی ہے بہار بھی
شعلہ و شرار بھی
ابر و باد و آب بھی
رُوپ بھی رباب بھی
زندگی!
راحتوں کا رقص بھی
ولولوں کا نقش بھی
حسرتوں کا عکس بھی
زمزموں کی بھیڑ میں
اک اداس شخص بھی

...☆...☆...

www.urdugem.com

بازگشت

دور بستی سے گھنے پیڑوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں
اپنی اپنی ریشمی بھیڑوں کو لے جاتے تھے ہم

مسکراتی تھی حسین ماحول کی دوشیزگی
گاتے گاتے جب کسی پتھر پہ سو جاتے تھے ہم

ذہن میں وہ کانپتے سیّال خوابوں کا ہجوم
دل میں اک مدھم لرزتی روشنی پاتے تھے ہم

گونجتی تھیں جن سے میدانوں کی نیلی وسعتیں
میٹھے میٹھے گیت سادی پریت کے گاتے تھے ہم

عاشقی کی سب پرانی داستانیں چھیڑ کر
اپنی سچی دوستی پر ناز فرماتے تھے ہم

چھوٹی چھوٹی رنجشوں کا ذکر کر لینے کے بعد
چھوٹی چھوٹی رنجشوں کو بھولتے جاتے تھے ہم

…☆…☆…

جال

سادہ سے اک دھاگے سے
دنیا بن لیتی ہے جال
ہر آسان جواب میں ہیں
کتنے کانٹے دار سوال

…☆…☆…

دل کا اُفق

دنیا میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں
میں جن کو پسند نہیں کرتا
پر اُن سے محبت کرتا ہوں

…☆…☆…

لیلیٰ خالد

(تحریکِ آزادیٔ فلسطین کی نامور مجاہدہ)

تیری آزادی کے نغمے گائے گی
تیرے آنچل کی ہوا
تیرے خیموں پر گُہر برسائے گی
تیرے ماتھے کی ضیا
تیرے پھولوں میں لہو دوڑائے گی
تیرے ہاتھوں کی حنا
تیرے صحراؤں میں دریا لائے گی
تیری زلفوں کی گھٹا
تیری عظمت کا علم لہرائے گی
تیری آنکھوں کی حیا
ہر اُفق، ہر دور، ہر تہذیب کی
روشنی بن جائے گی
موت پر تیرے جھپٹنے کی ادا

…☆…☆…

جو سو کر رات گزارے گا
وہ لشکر آخر ہارے گا

پہلے میوے پر نام اُس کا
جو پہلا پتھر مارے گا

میزانِ وفا میں کون تھا کم
یہ قصہ کون ''نتارے'' گا

کشتی کے بجائے شاید اب
دریا ہی پار اُتارے گا

اُس دل کو کیا غم ہر دم
ترے نام کی پینگ ''الارے'' گا

مہربانوں سے ملیں، نامہربانوں سے ملیں
زندگی کی برکتیں کن کن بہانوں سے ملیں

آج کے ایوان یا کل کی پُرانی بُرجیاں
ان گنت چڑیوں کی لاشیں ان مچانوں سے ملیں

میری تصویریں جو اس دُنیا کے البم میں نہیں
مجھ کو اپنے گاؤں کے کچے مکانوں سے ملیں

ماں کی شب بیداری جھولی، باپ کے قدموں کی خاک
مجھ کو ساری عزتیں ان دو ٹھکانوں سے ملیں

قبر کی تختی کے لائق بھی کوئی اعزاز لا
کُرسیاں تو ہم نے مانا حکمرانوں سے ملیں

…☆…☆…

جگ کو جگمگ کرنے والی ہر ندی ہرجائی ہوگی
جس پانی سے نہر نہ نکلے، اُس پانی پر کائی ہوگی

پتھر تو سر کائے گا وہ جس نے ٹھوکر کھائی ہوگی
مقروضوں کے شہر میں آخر سیٹھوں کی رسوائی ہوگی

رشتے باہم بڑھتے ہیں کم چلنے والی گلیوں میں
شہر میں جتنی بھیڑ بھرو گے اتنی تنہائی ہوگی

ایک کلس تو ساری کالی گلیوں کو چمکا نہیں سکتا
اپنا سورج دیکھنے والو رات کہیں تو آئی ہوگی

آج اچانک دل ویرانے میں خوشبو باراتیں کیسی
کوئی آنچل لپکا ہوگا، زلف کوئی لہرائی ہوگی

اک بُلبل چہکے تو جانو پھولوں کی رُت جاگ اٹھی ہے
اک بندوق ڈھلے تو سمجھو اب لشکر آرائی ہوگی

زعمِ خرد میں احمق لوگو دیوانوں پر ہنستے ہو تم
اتنے کُھلے خسارے میں آخر کوئی دانائی ہوگی

بھوکے لوگوں سے تم رزق کی آخری کھیل جھپٹ لائے ہو
گھر دیکھو، گودام تو دیکھو کتنی اور کمائی ہوگی

صحن میں باندھے ہرن کے بچے سے بے شک گھر سج گیا تیرا
یہ نہیں سوچا دشت میں ''ماں ہرنی'' کتنی گھبرائی ہوگی

یار ضمیرؔ سنبھال کے پگڑی، پَرنے کُرتے چلنا کیسا
پیار میں شرطیں، شرطیں کیسی، پیار میں تو رسوائی ہوگی

…☆…☆…

اُفق کی روشنی تا رہ گزر دیکھی نہیں ہم نے
سحر پھوٹی تو تھی لیکن سحر دیکھی نہیں ہم نے

سکوں مطلوب ہے تو آپ اپنے دل پہ دستک دے
یہ وہ شے ہے کہ جو بیرونِ در دیکھی نہیں ہم نے

خدا معلوم بادل کن جزیروں پر برستے ہیں
جہاں ہم ہیں کوئی بدلی اِدھر دیکھی نہیں ہم نے

یہی ڈوبا ہوا تارا تو شمعِ زندگانی ہے
جو صورت دل میں ہے وہ عمر بھر دیکھی نہیں ہم نے

ضمیرؔ اس تیز رفتاری سے گزری زندگی اپنی
کہ جیسے کوئی شے بارِ دِگر دیکھی نہیں ہم نے

www.urdugem.com

اپنے جدامجد سلطان العارفین پیر سید محمد شاہ کی نذر

در در ٹھوکر کھا کر، درویشوں کی بات یہ مانو گے
انسانوں کو جانو گے تو ربّ کو بھی پہچانو گے

اپنے دل کی سن لو گے تو میری بات بھی مانو گے
اپنے ساتھ نہ سچ بولا تو دوجے کی کیا جانو گے

گلیاں، کُوچے، پتھر، ہر شے ایک صحیفہ ہے
ان پتروں کو بُوجھے بن، کیا سمجھو گے، کیا جانو گے؟

دل ہی دھرم دوارا ہے، اس کی آہٹ پر کان رہیں
سچ کیسے پہچانو گے، تم کس کس کو ربّ مانو گے

سچ لفظوں کی قید سے اُس دن چھوٹے گا جب تم لوگو
دَھن کو مٹی مانو گے اور مٹی کو دھن جانو گے

...☆...☆...

وقت ہمیشہ کٹھن اکیلا، تُو ہی خوش گزرانی کر
رستہ بیچ پہاڑاں گزرے، ہر پتھر کو پانی کر

کوئی جنگل بانجھ نہیں ہے، کوئی کور کٹھور نہیں
دودھ درختوں سے مل جائے، کوشش تو امکانی کر

جسم کی خواہش سے کالی کوٹھی، کوئی زنجیر نہیں
تاج سے کاج نہ رکھنا پیارے گدڑی میں سلطانی کر

جو کچھ ہے تیرے اندر ہے باہر کوئی چیز نہیں
اپنی آنکھ گلابی کرکے، ساری رُت مستانی کر

اقوال حضرت سلطان باھوؒ

☆ جہالت یہ ہے کہ عمل اور اطاعت خوف الٰہی سے خالی ہو اور اس کا خانہ جہالت معصیت سے پر ہو۔
☆ یاد رکھیں کہ عالم کی نظر حروف وسطور پر ہوتی ہے جبکہ فقیر کی نظر معرفت وحضور پر۔

اک اک ساعت خوش چہروں کو نذرِ نیاز جوانی دے
اک ہی رات ملی ہے تجھ کو ساری رات سہانی کر

مدت کے ہنستے مُسکاتے پھول سبو سے نکلیں گے
یار ضمیر اُداسی کیسی، مے پی اور من مانی کر

روز و شب کی روشنیوں کا کچھ صدقہ روزانہ کر
دُکھ کے شکوے کرنے والے نعت کا شکرانہ کر

جس کی متی دیکھ کہیں اک زندہ قبر نہ بن جائے
سانس کو ایک فسانہ کر، ذرّے کو ایک زمانہ کر

بوجھ زیادہ لے کر چلنے سے رہرو تھک جاتے ہیں
ہر شے کو دیکھا نہ کر، ہر ساتھی کو پرکھا نہ کر

جو منظر بھی ملتا ہے اُس کو بازو پھیلا کر مل
جو لمحہ بھی آتا ہے تو آگے اُسے روانہ کر

قصر اُونچی دیواروں میں ہے چوڑے دروازوں کا نام
سر پر تاج رکھا ہے تو برتاؤ بھی شاہانہ کر

دل چاہے دریا کی صورت چکھنا نئی زمینوں کو
عقل کہے کہ ستّر برس کے بعد تو کہیں ٹھکانہ کر

فکرمند تھے۔ انھوں نے مجھے کہا کہ میں اسلام آباد جانے کے لیے تیار ہوں تاکہ کہیں بڑے دشمن (بھارت) کا مقابلہ کرنے کے سلسلے میں ایوب خان کو تجاویز ومشورے دے سکوں۔ لیکن پھر امریکا کی ناراضی کے خوف سے ایوب خان نے چینی وزیراعظم کا دورہ مؤخر کروادیا۔''

اصغر خان کتاب میں انکشاف کرتے ہیں کہ صدر ایوب خان کے ناروا و عجیب رویے کے باوجود چین نے انڈونیشیا کے راستے پاکستان کو اسلحہ فراہم کردیا۔ مزید برآں چین نے بھارت کی شمالی سرحدوں پر اپنی فوج تعینات کردی۔ اسی دوران جنگ بندی معاہدہ ہوگیا۔ چناں چہ چینیوں کو کہنا پڑا کہ وہ کسی قسم کا جارحانہ ارادہ نہیں رکھتے بلکہ ان مویشیوں کی تلاش میں آئے ہیں جو بھارتیوں نے تبت سے چوری کرلیے تھے۔''

یہ واقعات بتا کر اصغر خان لکھتے ہیں: ''ان سے عیاں ہے کہ حکومت نے پھوہڑپن سے جنگ کا آغاز کیا اور دورانِ جنگ بھی غیر سنجیدہ رویہ اپنایا۔ یہی وجہ ہے، تاشقند میں مجبوراً ہمیں جنگ بندی معاہدہ قبول کرنا پڑا۔''

بھٹو نے نومبر ۱۹۶۷ء میں پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی اور ایوب خان حکومت کے خلاف تحریک چلانے لگے۔ حکومت نے انھیں نظر بند کردیا۔ اصغر خان نے اس نظر بندی کے خلاف آواز اٹھائی اور اسے غیر قانونی قرار دیا۔ نومبر ۱۹۶۸ء میں اصغر خان چیئرمین پی آئی اے کے عہدے سے مستعفی ہوگئے۔

اصغر خان کے اس استعفیٰ کو بھی ان کے مخالفین نے متنازع بنادیا۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اصغر خان وزیر دفاع بننا چاہتے تھے مگر جب ایوب خان نے وائس ایڈمرل اے آر خان کو وزیر دفاع بنادیا، تو وہ ناراض ہوگئے۔ اسی ناراضی کے باعث انھوں نے استعفیٰ دے دیا۔ تاہم یہ مخالفین اس ضمن میں کوئی ٹھوس ثبوت پیش نہیں کرپاتے۔

اب اصغر خان بھی ایوب خان حکومت کے خلاف چلنے والی عوامی تحریک کا حصہ بن گئے۔ وہ بھٹو کو رہا کروانے کے لیے نکالے گئے جلسوں میں شریک ہوئے اور بھوک ہڑتالیوں کے ساتھ بھی بیٹھے۔ وہ بھٹو کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن ملک میں جمہوریت کو طاقتور بنانے کی خاطر انھوں نے بھٹو کے حمایتی مظاہروں میں حصہ لیا۔ جب بھٹو رہا ہوئے، تو وہ ایبٹ آباد جاکر اصغر خان سے ملے۔ بھٹو چاہتے تھے کہ اصغر خان پی پی پی میں شامل ہوجائیں مگر انھوں نے انکار کردیا۔

اس وقت تک اصغر خان کو احساس ہوچکا تھا کہ پاکستان کا اصل مسئلہ کرپٹ طرزِ حکمرانی ہے۔ نئے وطن کو انگریز آقا سے جو نظام حکومت ملا تھا، ابھی تک وہی چلا آرہا تھا۔ یہ نظام دورِ غلامی کی یادگار ہونے کے باعث کئی سقم رکھتا تھا۔ سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ اس نے وسائل کو حکمران طبقے کے ہاتھوں میں مرکوز کردیا تھا جبکہ عوام بے دست وپا تھے۔ اصغر خان نے فیصلہ کیا کہ یہ فرسودہ نظام تبدیل کرنے کی خاطر میدانِ سیاست میں اترا جائے تاکہ وہ قانونی طریقے سے اقتدار پاسکیں۔ ۱۹۶۹ء کے اوائل میں انھوں نے ''جسٹس پارٹی'' کے قیام کا اعلان کردیا۔ مدیرِ اعلیٰ اُردو ڈائجسٹ، جناب الطاف حسن قریشی راوی ہیں کہ یہ نام انھوں نے تجویز کیا تھا۔

پاکستانی عوام میں اصغر خان ایک ایماندار اور باصلاحیت فوجی افسر کی حیثیت سے مشہور تھے۔ اب وہ سیاسی میدان میں داخل ہوئے تو مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان، دونوں حصوں میں ان کی سیاسی جماعت کو پزیرائی ملی۔ یہ دیکھ کر بھٹو انھیں اپنے لیے خطرہ سمجھنے لگے۔ مارچ ۱۹۶۹ء میں پاک فوج کے سربراہ جنرل یحییٰ خان نے اقتدار سنبھال لیا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ اگلے سال الیکشن کروادے گا۔

الیکشن کی تیاری کرتے ہوئے اصغر خان نے نوابزادہ نصراللہ خان کے ساتھ مل کر پاکستان ڈیموکریٹک پارٹی

www.urdugam.com

کے نام سے نئی سیاسی جماعت کی بنیاد رکھی مگر ہم آہنگی نہ ہونے کے باعث وہ کامیاب ثابت نہ ہو سکی۔ جلد ہی انھوں نے تحریک استقلال کے نام سے نئی غیر سیاسی جماعت کی بنیاد ڈال دی۔ اسی لیے اصغر خان نے الیکشن ۱۹۷۰ء میں راولپنڈی کی نشست سے بطور آزاد اُمیدوار حصہ لیا۔ پی پی پی کے اُمیدوار نے انھیں شکست دے دی۔ اس ہار کو انھوں نے کھلے دل سے تسلیم کیا کہ وہ الیکشن خاصی حد تک منصفانہ تھا۔

اس دوران چالاک و ہوشیار بھٹو نے جنرل یحییٰ خان سے تعلقات بڑھا لیے تھے۔ چونکہ دونوں شراب و شباب کے رسیا تھے لہٰذا یہ ہم آہنگی بھی انھیں قریب لے آئی۔ الیکشن ۱۹۷۰ء شیخ مجیب الرحمن کی عوامی لیگ نے جیت لیے کہ اسی نے سب سے زیادہ نشستیں حاصل کیں۔ اب اصولاً جنرل یحییٰ خان کو اقتدار عوامی لیگ کے سپرد کر دینا چاہیے تھا مگر بعض رکاوٹیں آڑے آ گئیں۔

ایک اہم رکاوٹ یہ تھی کہ جنرل یحییٰ خان جمہوری حکومت میں بھی صدر بننے کا خواہش مند تھا مگر شیخ مجیب الرحمن نے اسے بہ حیثیت صدر قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے اعلان کیا کہ وہ برسر اقتدار آ کر اصغر خان کو صدر کا عہدہ سونپیں گے۔ اس اعلان نے جنرل یحییٰ خان کو ناراض کر دیا۔ وہ سیدھا لاڑکانہ جا کر بھٹو سے ملا۔ بھٹو نے اُسے یقین دلایا کہ پیپلز پارٹی اقتدار سنبھال کر اُسے صدر کے عہدے پر فائز رکھے گی۔ اسی ساز باز سے پاکستان دولخت کرنے کی سازش کا آغاز ہو گیا۔

الیکشن کے فوراً بعد ائیر مارشل اصغر خان نے مطالبہ کیا کہ حکومت عوامی لیگ کے سپرد کر دی جائے۔ انھوں نے فوج کو خبردار کیا کہ اقتدار عوامی لیگ کو نہ ملنے کی صورت میں ملک ٹوٹ سکتا ہے۔ اوائل ۱۹۷۱ء میں اصغر خان نے پنجاب کا دورہ کیا تاکہ عوام کو حقائق سے باخبر رکھ سکیں مگر پی پی پی کے کارکنوں نے ہر جگہ ان کے خلاف ''غدار'' اور ''بنگالیوں کا ایجنٹ'' ہونے کے نعرے لگائے۔ ایک جگہ ان کے منہ پر تھوک بھی دیا گیا مگر اصغر خان یہ ذلت برداشت کر کے ملک بچانے کی کوششوں میں لگے رہے۔ تاہم بھٹو اور یحییٰ خان کی ملی بھگت کے باعث آخر کار سقوط ڈھاکا معرض وجود میں آ گیا۔

قومی اتحاد سے وابستگی

۱۹۴۰ء کی پاک بھارت جنگ میں شکست کے بعد جنرل یحییٰ خان کو بے نیل مرام گھر جانا پڑا اور وہ اپنے کرتوتوں کی وجہ سے صدر نہ بن سکا۔ اس کی جگہ بھٹو صاحب چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور پھر وزیر اعظم پاکستان بن گئے۔ اس وقت ملک بھر میں ان کا طوطی بول رہا تھا۔ عوام ''روٹی کپڑا اور مکان'' کے نعرے سے مسحور تھے۔ اس ماحول نے بھٹو صاحب کو غیر معمولی طور پر مغرور بنا دیا۔ ہر مغرور آمر کی طرح اب وہ بھی خود کو عقل کل سمجھنے لگے۔

اصغر خان مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے اُن چند لیڈروں میں شامل تھے جنھوں نے مشرقی پاکستان میں فوجی الیکشن کی مخالفت کی تھی۔ تاہم ان کی صدا پر کسی نے توجہ نہ دی۔ اب وہ بھٹو کے خلاف توانا لیڈر بن کر سامنے آئے۔ وہ بے خوف و خطر بھٹو حکومت کی غلط کاریوں پر تنقید کرنے لگے۔ وہ بھٹو صاحب کے دبدبے سے بالکل مرعوب نہ ہوئے اور ڈٹ کر ان کے خلاف تقریریں کرنے لگے۔ انھوں نے اپنی تحریکِ استقلال کو بھی سیاسی جماعت بنا دیا۔

رفتہ رفتہ نئی جماعت میں حزبِ اختلاف کے نئے پُرانے راہنما شامل ہونے لگے۔ یوں وہ بھٹو حکومت کی مخالف سب سے طاقتور اپوزیشن پارٹی بن گئی۔ اسی پارٹی میں شامل کئی سیاست دان بعد ازاں قومی افق پر نمایاں ہوئے جن میں میاں نواز شریف، جاوید ہاشمی، اعتزاز احسن، خورشید محمود قصوری، عابدہ حسین، فخر امام، مشاہد حسین وغیرہ شامل ہیں۔ بھٹو صاحب اصغر خان کی مقبولیت سے اتنے بوکھلا گئے کہ انھیں تضحیک آمیز انداز میں ''آلو خان'' کہہ کر

پکارنے لگے۔ اس خطاب سے اصغر خان کا تو کچھ نہیں بگڑا البتہ بھٹو صاحب اپنے مقام و مرتبے سے ضرور گر گئے۔

حکومت اصغر خان کو خوفزدہ کرنے کی خاطر ان پر حملے بھی کرواتی رہی مگر وہ قطعاً خوفزدہ نہ ہوئے۔ ایک حملے میں ان کا گھر بھی تباہ کر دیا گیا تھا۔

۱۹۷۷ء میں نئے الیکشن آن پہنچے۔ تب تک عوام مسائل حل نہ ہونے کی وجہ سے بے چین ہو چکے تھے۔ مزید برآں سیکولر بھٹو حکومت کے دور میں فحاشی بھی بڑھ چکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب مولانا شاہ احمد نورانی نے کراچی کے ایک جلسے میں ''نظام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم'' ملک میں رائج کرنے کی بات کی تو جلد ہی اس کے بطن سے ایک زبردست احتجاج تحریک نے جنم لے لیا۔

اصغر خان کے مخالفین کا دعویٰ ہے کہ ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۷ء تک وہ کسی سیاسی اتحاد میں شامل نہیں ہوئے۔ اصغر خان کو خطرہ تھا کہ اس طرح ان کی حیثیت ثانوی ہو جائے گی۔ بہر حال ۱۹۷۷ء میں جب تحریک نظام مصطفیٰ ﷺ چلانے کی خاطر نو جماعتوں نے ''قومی اتحاد'' تشکیل دیا تو اس میں تحریک استقلال بھی شامل تھی۔ نو جماعتوں کے سربراہوں کو ''نو ستاروں'' سے تشبیہہ دی گئی۔ ان ستاروں میں سب سے نمایاں اصغر خان ہی تھے کیونکہ وہ عالمی سطح پر بھی شہرت و اہمیت رکھتے تھے۔ ان کی دیانت و حب الوطنی بھی مسلم تھی۔

اصغر خان کی دیگر سیاست دانوں کے ساتھ سیاسی اتحاد بنانے سے گریز کرنے کی ایک وجہ غالباً یہ ہو سکتی ہے کہ بیشتر پاکستانی سیاست دانوں کی منزل صرف اقتدار کا حصول تھا۔ جبکہ اصغر خان نظام کو تبدیل کرنے کی خاطر سیاست میں آئے تھے۔ نظریاتی بُعد کے باعث ہی وہ بیشتر سیاست دانوں سے ہم آہنگ نہیں ہو پائے۔

اصغر خان نے ایبٹ آباد کے علاوہ کراچی سے بھی الیکشن لڑا۔ جب وہ انتخابی مہم چلانے کراچی پہنچے، تو وہاں جم غفیر نے ان کا استقبال کیا۔ استقبالی جلوس میں اتنے زیادہ لوگ شامل تھے کہ وہ نو گھنٹے میں ہوائی اڈے سے بزنس روڈ پہنچ سکے جہاں جلسہ ہونا تھا۔ ان کی مقبولیت کا یہ عالم دیکھ کر بھٹو حکومت قومی اتحاد سے شدید خوفزدہ ہو گئی۔ چناں چہ اس نے الیکشن جیتنے کی خاطر دھاندلی کا وتیرہ اپنا لیا۔ اس کے باوجود اصغر خان دونوں نشستوں سے جیت گئے۔

قومی اتحاد صرف ۳۷ نشستیں جیت سکا۔ اس نے بھٹو حکومت پر دھاندلی کروانے کا الزام لگایا اور شہروں میں احتجاجی جلسے جلوس منعقد کرنے لگا۔ حکومت نے لاہور کراچی سمیت چار شہروں میں جزوی مارشل لا لگا دیا۔ حتیٰ کہ فوج کو مظاہرین پر گولی چلانے کا حکم دے دیا گیا۔ اس موقع پر اصغر خان نے پاک فوج کے نام خط لکھ کر مطالبہ کیا کہ وہ بھٹو حکومت کے غیر قانونی احکامات کی تعمیل نہ کرے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ فوج مظاہرین پر گولی چلانے سے انکار کر دے۔

اصغر خان کے مخالف دانشوروں کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے اس خط کے ذریعے فوج کو اقتدار سنبھالنے کی دعوت دی تھی۔ مدعا یہ تھا کہ فوج حکومت سنبھال کر نئے الیکشن کروائے اور اُسے جیت کر وہ وزیر اعظم بن جائیں۔ معروف کالم نگار، حامد میر نے اپنے ایک کالم میں دعویٰ کیا ہے۔:

''۲ جولائی ۱۹۷۷ء کو بھٹو نے حزبِ اختلاف کے تمام مطالبات تسلیم کر لیے۔ (ان میں دوبارہ الیکشن کروانے کا مطالبہ بھی شامل تھا) مگر اصغر خان مذاکرات ناکام بنانے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہے۔ انھوں نے مولانا مفتی محمود سے کہا کہ بھٹو حکومت کے ساتھ مذاکرات مت کریں۔ میں ضمانت دیتا ہوں کہ فوج حکومت سنبھال کر ۹۰ دن کے اندر الیکشن کروا دے گی۔ مولانا مفتی محمود نے یہ بات نہیں مانی مگر واشنگٹن میں بھٹو حکومت گرانے کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ سی آئی اے نے جنرل ضیاالحق کے ساتھ مل کر بھٹو کا خاتمہ کر دیا۔''

www.urdugem.com

یہ بہرحال حقیقت ہے کہ اصغر خان بھٹو حکومت سے مذاکرات کرنے کے حق میں نہیں تھے، مگر اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ وہ ذوالفقار علی بھٹو کو جھوٹا اور مکار سمجھتے تھے۔ انھیں یقین تھا کہ بھٹو کبھی اپنے وعدے پورے نہیں کرے گا۔ اسی لیے بھٹو حکومت سے چھٹکارا پانے کی خاطر انھوں نے عارضی فوجی حکمرانی کو ترجیح دی۔ وہ بھٹو حکومت کے خاتمے کو پاکستان کے حق میں بہتر سمجھتے تھے۔ یہ بھی سچ ہے کہ بھٹو حکومت ختم ہونے پر لاکھوں پاکستانیوں نے اظہار خوشی کیا تھا، مٹھائیاں بانٹیں اور حلوے پکائے تھے۔

نومبر ۱۹۷۷ء میں اصغر خان نے قومی اتحاد سے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ کچھ عرصے بعد جمعیت علمائے اسلام بھی اس سے علیحدہ ہوگئی۔ یوں نو ستاروں کا اتحاد ٹوٹ گیا۔ حزب اختلاف کے منتشر ہونے کا سب سے زیادہ فائدہ جنرل ضیاالحق کو پہنچا اور وہ اپنے اقتدار کو طول سے طول تر بنانے کے خواب دیکھنے لگے۔

بعض دانشوروں کا خیال ہے کہ اصغر خان کے قریبی ساتھیوں نے انھیں یقین دلا رکھا تھا کہ جنرل ضیاالحق انھیں صدر مملکت بنا دیں گے۔ اسی لیے وہ قومی اتحاد سے الگ ہو گئے تاکہ اپنی انفرادی شناخت برقرار رکھ سکیں، مگر فوجی افسروں کے ساتھ ان کی شراکت کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ملتا۔

یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ اصغر خان بھٹو حکومت سے مذاکرات کرتے ہوئے جرنیلوں سے مشاورت کرنے کے خلاف تھے۔ ایک بار دوران مذاکرات بھٹو صاحب نے جنرل ضیاالحق کو بھی بلوا لیا تھا۔ اصغر خان نے بات چیت شروع کرنے سے انکار کر دیا۔ جب جنرل صاحب رخصت ہوئے تب ہی گفتگو کا آغاز ہوا۔

مزید برآں مارشل لا لگانے کے بعد جنرل ضیاالحق نے پانچ بار اصغر خان کو حکومت میں شامل ہونے کی دعوت دی مگر ہر بار انھوں نے انکار کر دیا۔ جنرل صاحب حیلے بہانوں سے

پاکستان قومی اتحاد کے نو (۹) نمایاں ستارے..... اصغر خان، پروفیسر غفور احمد، مولانا مفتی محمود، شیر باز مزاری، نسیم ولی خان، نصر اللہ خان، پیر پگارا، مولانا شاہ احمد نورانی اور عبدالقیوم خان.....
ایک یادگار تصویر

الیکشن کروانے کے وعدے کو طول دیتے گئے۔ آخر اوائل اکتوبر ۱۹۷۹ء میں اصغر خان چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر سے ملے اور انھیں دھمکی دی کہ اگر الیکشن نہ کروائے گئے، تو وہ ان کے خلاف سپریم کورٹ میں بغاوت کا مقدمہ دائر کر دیں گے۔

چند ہی دن بعد جنرل ضیاالحق نے اصغر خان کو ان کے گھر نظر بند کر دیا۔ نیز ملک بھر میں سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگائی اور پریس پر سنسر شپ لگا دی۔ یوں یہ آشکارا ہو گیا کہ جنرل صاحب اقتدار کی کیلی ہاتھ آنے کے بعد اُسے چھوڑنے کو تیار نہیں۔ اگر الیکشن جیت کر اصغر خان وزیراعظم بننے کا خواب دیکھ رہے تھے، تو وہ بھی آئینے کی طرح چکنا چور ہو گیا۔

اصغر خان ۱۶/۱۷ اکتوبر ۱۹۷۹ء سے لے کر ۲/۱ اکتوبر ۱۹۸۴ء تک... پورے پانچ سال اپنے گھر میں نظر بند رہے۔ جنرل ضیاالحق کو خطرہ تھا کہ اگر انھیں رہا کیا، تو وہ حکومت کے خلاف زبردست عوامی تحریک کا آغاز کر دیں گے۔ حزب اختلاف میں صرف وہی ایسے قدآور راہنما تھے جو

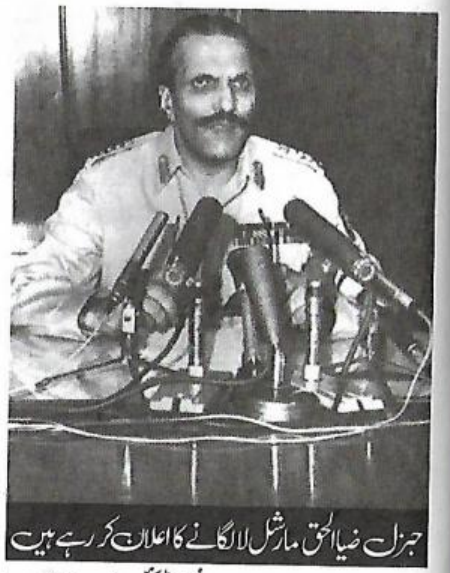

جنرل ضیاالحق مارشل لا لگانے کا اعلان کر رہے ہیں

ان کی حکومت کے لیے خطرہ بن سکتے تھے۔ اس دوران اصغر خان کی جماعت، تحریک استقلال ایم آر ڈی کا حصہ بن گئی۔ یہ سیاسی اتحاد ضیاء حکومت کے خلاف بنایا گیا تھا اور سندھ میں زیادہ سرگرم رہا۔ اس کی قیادت بھٹو صاحب کی دختر، بے نظیر بھٹو کر رہی تھیں۔

آمر کے سامنے نہیں جُھکا

۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی الیکشن میں اصغر خان نے حصہ نہیں لیا۔ الیکشن ۱۹۸۸ء میں انھوں نے پی پی پی سے انتخابی اتحاد کر لیا۔ تاہم تحریک استقلال کے کئی راہنما اس پر ناراض ہو کر مسلم لیگ میں جا شامل ہوئے جبکہ پی پی پی میں بھی اصغر خان کو پزیرائی نہیں ملی۔ انھیں بھٹو کا قاتل کہا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اصغر خان سمیت تحریک استقلال کا کوئی بھی امیدوار الیکشن نہ جیت سکا۔

اصغر خان نے الیکشن ۱۹۹۰ء میں بھی حصہ لیا مگر اس بار بھی کامیاب نہ ہو سکے۔ انھوں نے دوبارہ پی پی پی سے اتحاد کر لیا تھا۔ ۱۹۹۰ء کے بعد اصغر خان کی سیاسی اہمیت کم ہوتی گئی اور ان کا بیشتر وقت اپنے گھر میں گزرنے لگا۔ آخر کار ۲۰۱۱ء میں انھوں نے اپنی تحریک استقلال کو عمران خان کی جماعت، تحریک انصاف میں ضم کر دیا اور بڑھاپے کے باعث سیاست سے کنارہ کش ہو گئے۔

اصغر خان صاحب مطالعہ شخصیت تھے اور قلم کاری بھی کرتے رہے۔ انھوں نے انگریزی میں پانچ اور اردو میں چار کتب تحریر کیں۔ حکومت پاکستان نے ملک و قوم کے لیے شاندار خدمات انجام دینے پر انھیں ہلال پاکستان اور ہلال قائداعظمؒ کے تمغے عطا کیے تھے مگر سیاسی جدوجہد کے دوران اصغر خان نے بطور احتجاج انھیں واپس کر دیا تھا۔

۱۹۹۴ء میں اس وقت کے وزیر داخلہ، جنرل نصیر اللہ بابر نے انکشاف کیا تھا کہ بعض جرنیلوں نے ۱۹۹۰ء میں کروڑوں روپے خرچ کر کے سیاسی اتحاد، آئی جے آئی بنوایا تھا تاکہ پی پی پی کو شکست دی جا سکے۔ اس معاملے کو اصغر

www.urdudigest.com

خان سپریم کورٹ میں لے گئے تاکہ عدالتی تفتیش ہو سکے۔ یہ مقدمہ ''اصغر خان کیس'' اور ''مہران گیٹ اسکینڈل'' کے ناموں سے مشہور ہوا۔ دوران مقدمہ کئی بااثر شخصیات کے نام سامنے آئے۔

درج بالا داستانِ حیات سے عیاں ہے کہ اصغر خان نے بھرپور اور نہایت متحرک زندگی گزاری۔ شاہراہ زندگی پہ گامزن ہوتے ہوئے بشری تقاضے کے باعث ان سے غلطیاں بھی سرزد ہوئیں۔ انھیں ''تنہا پرواز کا شوقین لیڈر'' اور ''نرگسیت زدہ'' بھی کہا گیا، مگر یہ حقیقت ہے کہ مرحوم نے کبھی ملک وقوم کے خلاف ایک قدم نہ اُٹھایا نیز ان کے اجلے دامن پر کرپشن کا معمولی سا دھبا بھی نہیں لگ سکا۔ اصغر خان جس بات کو سچ سمجھتے، اس کو ببانگ دہل کہنے کی جرأت رکھتے تھے چاہے وہ حکمران طبقے کے مفادات کو ضرب لگادے۔

اصغر خان کی کتب سے آشکارا ہے کہ وہ اپنی حیات میں جن سیاست دانوں سے ملے، ان کی اکثریت اقتدار کا ہما اپنے سر پر بٹھانے کے لیے گدھے کو بھی باپ بنانے پر تیار تھی۔ اصغر خان نے ایسے رویے کو ذلت کا بدترین مقام قرار دیا۔ آج بھی اقتدار کی جنگ عجیب تماشے دکھلاتی ہے۔ حتیٰ کہ ماضی کے جانی دشمن اقتدار کی خاطر دوست بن جاتے ہیں۔

میدان سیاست میں اصغر خان کو اس لیے کامیابی نہ مل سکی کہ پاکستانی عوام کی اکثریت خاندانی، قبائلی اور نسلی بنیاد پر ووٹ ڈالتی ہے۔ وہ کرپٹ اور صاف ستھرے امیدوار کے مابین تمیز نہیں کر پاتی۔ اسی لیے اصغر خان اپنی ناکامی کا ذمہ دار سول سوسائٹی کو قرار دیتے تھے۔ پھر انھیں اپنے غیر لچکدار رویے کی وجہ سے بھی نقصان اُٹھانا پڑا۔ اصغر خان نے اپنے اصول کسی صورت ترک نہ کیے۔ یہی وجہ ہے، ایک عشرے تک مقبول عوامی لیڈر رہنے کے باوجود وہ حکومتی ایوانوں تک نہ پہنچ سکے۔

ممتاز ماہر معاشیات، قیصر بنگالی نوجوانی میں اصغر خان کے قابل فرزند، عمر اصغر خان مرحوم کے قریبی ساتھی تھے۔ وہ راوی ہیں کہ الیکشن ۱۹۹۰ء کے موقع پر ضلع ایبٹ آباد کا مشہور سیاست داں اصغر خان کے گھر آیا۔ اس نے انھیں تجویز دی کہ وہ قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلی کی ضلعی نشستوں پر آپس میں اتحاد کر لیتے ہیں۔ اصغر خان صبر وسکون سے اس کی باتیں سنتے رہے اور روایتی انداز میں مہمان کی تواضع بھی کی۔

جب سیاسی راہنما چلا گیا، تو اصغر خان اس کمرے میں چلے آئے جہاں عمر اور قیصر بنگالی بیٹھے تھے۔ انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں ملاقات کی داستان سنائی اور اعلان کیا کہ وہ اس کے ساتھ انتخابی اتحاد نہیں کر سکتے۔ بیٹے عمر نے وجہ پوچھی تو وہ کہنے لگے: ''یہ درست ہے کہ دیہی علاقے میں وہ، اور شہری علاقوں میں، مَیں اچھے خاصے ووٹ لے سکتا ہوں۔ گویا ہمارے انتخابی اتحاد کی جیت یقینی ہے مگر یہ آدمی جنگلات کی غیر قانونی کٹائی میں ملوث ہے اور میں ٹمبر مافیا کے ساتھ کبھی ناتا نہیں جوڑ سکتا۔''

الیکشن ۱۹۹۰ء میں اصغر کان اپنے ہی علاقے سے ہار گئے اور وہ سیاسی راہنما بھی نہ جیت سکا۔ اگر دونوں انتخابی اتحاد کر لیتے، تو ان کی فتح یقینی تھی۔ مگر اصغر خان الیکشن میں جیت کی خاطر ''کوئی بھی قدم'' اُٹھانے والوں میں سے نہیں تھے۔ انھوں نے شکست کھانا قبول کر لیا مگر اپنے اصولوں پر ثابت قدم رہے۔

ایک بار کسی صحافی نے اصغر خان سے سوال کیا ''آپ کیا اپنی سیاسی زندگی کو ناکام قرار دیتے ہیں؟''

وہ مسکراتے ہوئے بولے ''کیا آپ صدر یا وزیر اعظم بننے کو کامیابی تصور کرتے ہیں؟ میں ایک کامیاب سیاست دان ہوں۔ میں نے تاعمر اصولوں کی سیاست کی ہے۔ کسی آمر کے سامنے نہیں جھکا اور نہ کبھی اپنی سیاست کا سودا کیا۔''

میدانِ سیاست میں مرحوم کا یہ صاف ستھرا کردار خصوصاً نوجوان سیاسی راہنماؤں کے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

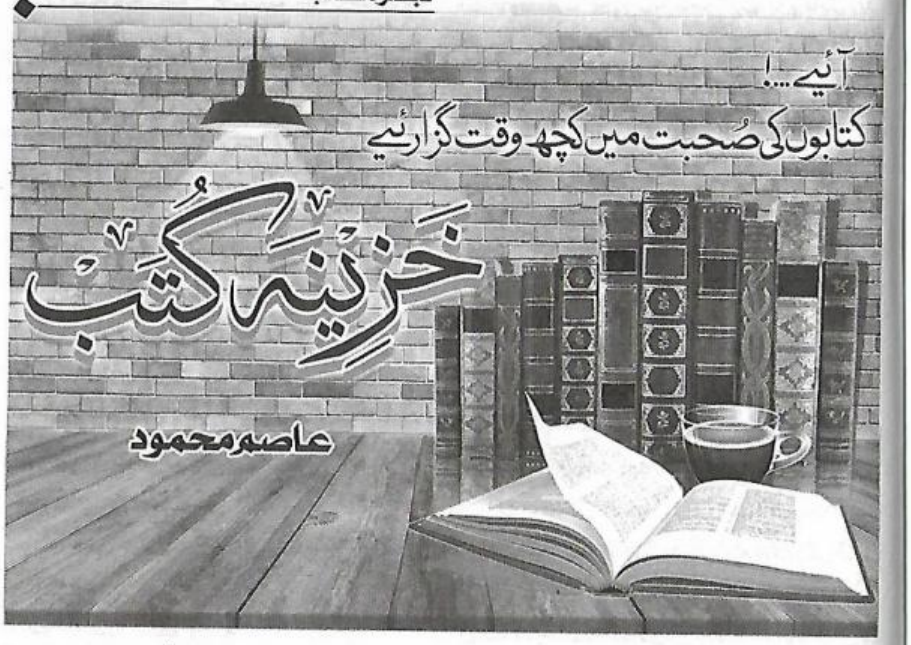

نام کتاب: نامور ادیبوں کی آپ بیتیاں۔ مرتب: محمد حامد سراج۔ ناشر: بک کارنر، جہلم۔ قیمت: ۱۵۰۰ روپے۔
فون نمبر: ۰۳۲۱۵۴۴۰۸۸۲

آپ بیتی ایسی منفرد صنف ادب ہے جو کئی شعبوں مثلاً تاریخ، خاکہ، عمرانیات، نفسیات وغیرہ کا احاطہ کرتی ہے۔ خاص طور پر عظیم آدمیوں کی آپ بیتیاں ایسی بیش قیمت دستاویز ہیں جنھیں پڑھ کر انسان بہت سے سبق اور تجربات حاصل کر سکتا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب بھی ایسی ہی مفید وکارآمد آپ بیتیوں کا تذکرہ ہے۔

اردو کے نامور شعرا و ادبا مثلاً میر تقی میر، غالب، داغ دہلوی، حالی، حسرت موہانی، پریم چند، جگر مرادآبادی، فیض، منٹو، بیدی، مختار مسعود وغیرہ نے مختلف رسائل وجرائد کے لیے آپ بیتیاں رقم کی تھیں یا پھر کسی ادیب نے کمال مہارت سے ان کی جگ بیتی لکھ ڈالی۔ مرتب نے انھی چیدہ چیدہ آپ بیتیوں اور جگ بیتیوں کو زیر تبصرہ کتاب میں شامل کر دیا ہے۔

یہ سوانح حیات نامور ادیبوں کی زندگیوں کے ڈھکے چھپے گوشے، دلچسپ واقعات اور تلخ وشیریں تجربات سے معمور ہیں۔ قاری انھیں پڑھتے ہوئے نہ صرف لطف محسوس کرتا ہے بلکہ فکر کے نئے در بھی وا ہوتے ہیں۔ صاحب طرز ادبا کی تحریر مطالعے کا مزہ دوبالا کر دیتی ہے۔

یہ کتاب عمدہ کاغذ پر معیاری انداز میں طبع ہوئی ہے۔

www.urdugem.com

آپ بیتیاں پڑھنے والے صاحبانِ ذوق اسے بہت مرغوب پائیں گے۔ مرتب نے عرق ریزی سے جامع آپ بیتیوں و جگ بیتیوں کا انتخاب کیا ہے۔

☆...☆...☆

نام کتاب: خطبات نورانی نمبر۔ چیف ایڈیٹر: ملک محبوب الرسول قادری۔ ناشر: زاویہ قادریہ، سیدنا غوث اعظم سٹریٹ، نزد چونگی نمبر ۱، سرگودھا روڈ، جوہر آباد۔ فون: ۰۳۲۱۰۳۰۰۳۱۳، قیمت: درج نہیں

مولانا شاہ احمد نورانی مرحوم کا شمار برِ صغیر پاک و ہند کے نامور علمائے دین، خطبا اور سیاسی راہنماؤں میں ہوتا ہے۔ آپ ممتاز مبلغ مولانا شاہ عبدالعلیم صدیقیؒ کے صاحب زادے تھے جنہوں نے ہزار ہا غیر مسلموں کو مشرف بہ اسلام کیا تھا۔ انھوں نے اپنے والد گرامی کا مشن تا عمر جاری رکھا۔

زیرِ تبصرہ کتاب پہلے پہل سہ ماہی انوار رضا، جوہر آباد کے نمبر کی حیثیت سے شائع ہوئی تھی۔ اب اِسے کتاب کے روپ میں سامنے لایا گیا۔ اس میں مولانا نورانی کے اٹھارہ خطبات شامل ہیں جو انھوں نے وقتاً فوقتاً دیے۔ یہ خطبے علمی، فکری اور سیاسی نکات کا خزینہ ہیں۔ خاص طور پر علمِ دین اور سیاست کے موضوعات پر قاری کی راہنمائی کرتے اور اُسے راہِ حق دکھاتے ہیں۔

مولانا نورانی کے چاہنے والے اور علوم اسلامی سے شغف رکھنے والے اس کتاب کو من پسند پائیں گے۔ کتاب عمدہ کاغذ پر خوبصورتی سے شائع ہوئی ہے۔

☆...☆...☆

نام کتاب: شرح کلام جامی۔ ترجمہ و تشریح: راجا طارق محمود نعمانی / پروفیسر سید امیر کھوکھر۔ ناشر: بک کارنر، جہلم۔ قیمت: ۱۲۰۰ روپے۔ فون نمبر: ۰۵۴۴۶۱۴۹۷۷

مولانا جامی افغان صوبے، غور کے قصبے جام میں پیدا ہوئے۔ اسی لیے جامی کہلائے۔ آپ فارسی کے ممتاز صوفی شاعر ہیں۔ آپ ۱۴۱۴ء میں پیدا ہوئے اور ۱۴۹۲ء میں وفات پائی۔ کئی مجموعہ کلام ترکے میں چھوڑے جن کی شرح زیرِ تبصرہ کتاب میں موجود ہے۔

اس کتاب میں مولانا جامی کی حمد، نعت، قصیدہ بردہ، غزلیات، مقطعات، رباعیات کی شرح عمدہ انداز میں پیش ہوئی ہے۔ مولانا نے تمام اصناف شاعری میں طبع آزمائی کی ہے اور ایک صنف میں کثیر یادگار سرمایہ چھوڑا۔ ان کا کلام علم و عرفان، عنایت، فصاحت، واقعات گوئی حسن ترکیب اور سلاست کے باعث منفرد و ممتاز ہے۔

یہ کتاب عمدہ کاغذ پر خوبصورت انداز میں شائع ہوئی ہے۔ فارسی شاعری سے دلچسپی رکھنے والے خواتین و حضرات اس کتاب کو دل پسند و مرغوب پائیں گے۔

☆...☆...☆

نام کتاب: خطبات قادسیہ۔ مصنف: پروفیسر حافظ محمد سعید۔ ناشر: دارالاندلس، ۴۔ لیک روڈ، لاہور۔ قیمت: درج نہیں۔ فون نمبر: ۰۹۲۴۲۳۷۲۳۰۵۴۹

تاریخ اسلام شاہد ہے کہ مفاد پرست لوگ اس دین حق کا لبادہ اوڑھ کر دنیا میں قتل و غارت کرتے رہے ہیں۔ کبھی ایسے فسادی خوارجیوں کی صف میں شامل ہو گئے، کبھی قرامطیوں سے جا ملے۔ ان کی مفسدانہ سرگرمیوں کے باعث

نہ صرف مسلمانوں کو بہت پریشانیاں اٹھانا پڑیں بلکہ اسلام بھی بدنام ہوا۔

پچھلی نصف صدی سے فتنہ پردازوں نے پھر عالم اسلام میں دنگا فساد مچا رکھا ہے۔ پاکستان کے علاوہ کئی اسلامی ممالک خودکش حملوں اور بم دھماکوں کے ذریعے بے گناہ اور معصوم شہریوں کو نشانہ بنا رہے ہیں۔ اس ناگفتہ صورت حال میں علمائے حق کی ذمے داری ہے کہ وہ میدان عمل میں اتر کر مسلمانوں خصوصاً غیر مسلموں کے سامنے اسلام کی سچی تصویر پیش کریں۔

اسی سوچ کے تحت امیر جماعۃ الدعوۃ نے لاہور کے علاقے، چوبرجی میں واقع جامع مسجد القادسیہ میں مسلسل بارہ خطبات جمعہ دیے۔ ان میں ''فتنہ تکفیر اور فتنہ خوارج'' کی حقیقت، اسباب، نقصانات اور بچاؤ کے طریقے عام فہم انداز میں بیان کیے گئے۔ زیرِ تبصرہ سفید کاغذ پر نفیس و دلکش لحاظ سے شائع کیا گیا ہے۔ عقائد و اعمال کی درستی کے لیے ان کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

☆...☆...☆

نام کتاب: دُرِ عقیدت۔ مصنف: پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید۔ ناشر: نظریہ پاکستان اکادمی، ۲-۳۱۹، علامہ اقبال کالونی، سرگودھا۔ فون: ۰۴۸۳۷۱۱۷۱۷ قیمت: ۵۰۰ روپے۔

سرگودھا میں مقیم ڈاکٹر ہارون الرشید معروف ماہر تعلیم اور لکھاری ہیں۔ اب تک ایک سو سے زائد ادبی، علمی اور نصابی کتب تحریر کر چکے۔ ۲۰۰۰ء میں آپ کو عمرے کی سعادت نصیب ہوئی۔ مکہ و مدینہ میں جو جاوداں لمحات گزرے، وہ بعد ازاں ایمان افروز نعتوں کی صورت جلوہ افروز ہوئے۔ یہ انھی نعتوں کا دل افروز مجموعہ ہے۔

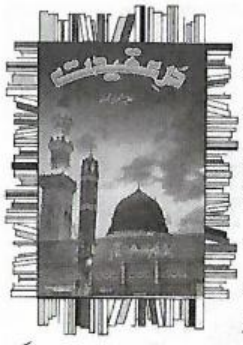

شعرا حضرات روز اول سے حمد و نعت کے ذریعے اللہ تعالیٰ اور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح سرائی کر رہے ہیں۔ اب اس عظیم الشان فہرست میں ہمارے ممدوح بھی شامل ہو چکے۔ ڈاکٹر ہارون کی نعتوں میں جذب و یقین اور سرشاری کی قوس قزح اپنے سبھی رنگوں میں دکھائی دیتی ہے۔ ہر نعتیہ شعر شاعر کی قلبی و روحانی واردات کا ترجمان ہے۔ نعتیہ کلام سے عقیدت و احترام میں ڈوبی اشعاتِ قلم ملاحظہ فرمائیے:

نہ اس دنیا کی رعنائی نہ جنت کی فضا دیکھے
ترا در دیکھ کے آقاؐ، یہ عاصی اور کیا دیکھے

بلاوا جب بھی آتا ہے مجھے سرکارؐ کے در سے
سمجھ لیتا ہے دل کہ یہ بھی بخشش کا اشارہ ہے

بفیضِ حق یہ ان کی زندگی سے ہم نے سیکھا ہے
مصائب جھیلنا، ہنسنا، ہمیشہ سرخرو رہنا

تبسم راستے کی مشکلیں سب دور ہوتی ہیں
جب عشقِ مصطفیٰ کو راہبر اپنا بناتا ہوں

توجہ فرمائیے

ماہنامہ اُردو ڈائجسٹ میں طبع ہونے والی تحریروں پرنٹ یا ڈیجیٹل، دونوں کے حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی کتاب یا رسالے میں اُردو ڈائجسٹ کی کوئی تحریر شائع کرنے سے قبل ادارے سے اجازت لینا ضروری ہے۔

www.urdu.com

ففتھ جنریشن وار

شمارہ جنوری میں ''جنگ کے بغیر ایک ملک فتح کرنا'' کے نام سے فکر انگیز تحریر پڑھنے کا موقع ملا۔ جس میں فن براندازی کے ماہر ایک رُوسی کا ذکر تھا کہ کس طرح اُس نے اپنی منفی مہارتوں کو بُروئے کار لاتے ہوئے بغیر گولہ و بارود ضائع کیے اور اپنے ملک کے فوجیوں کی جانیں ضائع کیے، مشرقی پاکستان کے سقوط میں اہم کردار ادا کیا۔ اگر دیکھا جائے تو جدید دور میں دُنیا کی بڑی طاقتیں کافی حد تک چھوٹے اور کمزور ملک کو زیر نگیں کرنے کے لیے فن براندازی پر کافی حد تک بھروسا کر چکی ہیں۔ اسے جدید اصطلاح میں ''ففتھ جنریشن وار'' (Fifth Generation War) کہا جاتا ہے۔ ایک معاشی اور سیاسی لحاظ سے طاقتور ملک پیسے اور میڈیا کے بل بوتے پر بغیر اسلحہ و بارود ضائع کیے اور اپنی فوج کھپائے، ایک دوسرے نسبتاً سیاسی و معاشی محاظ سے کمزور ملک میں انتشار پھیلا کر اپنے عتاب میں کر لیتا ہے۔

تحریر کا آخری حصّہ زیادہ فکر انگیز اور قابل غور تھا جس میں وطن عزیز کے ان مسائل اور عوامل کا ذکر کیا گیا جو فن براندازی کے مرتکب ممالک کی خواہشوں کے مطابق ٹارگٹ ملک میں پیدا کیے جاتے ہیں۔

پاکستان میں بہترین فنی و جوہری مہارتوں سے لیس بہادر اور جرّی فوج موجود ہے۔ اس کو شکست دیے بغیر دشمن مملکت دراندازی اور جنگ کے ذریعے اپنے ناپاک عزائم میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا اب وہ وطن عزیز پر کبھی دریاؤں کا پانی روک کر، کبھی معیشت پر پابندیاں لگوا کر، کبھی عالمی سطح پر تنہائی کی دھمکیاں دے کر اور کبھی بلوچستان میں پراکسی وار کا مرتکب ہو کر ففتھ جنریشن وار جیسے ہتھکنڈے

آؤ کہ سر اُٹھا کے چلیں

تمام اندرونی و بیرونی قرضہ جات اور دیگر تمام دکھوں یعنی ظلم و نا انصافی، ڈکیتی و چوری، رشوت و کرپشن، سُود و مالی بد دیانتی، بخل و حرص، انتشار و پراگندگی، بھتہ خوری و قتل، فتنہ و فساد، اغوا و جنسی بے راہ روی، غرض ہر قسم کی معاشرتی بیماریوں سے مکمل نجات کا ایک ہی حل اور وہ ہے:

پاکستان کا آئین قُرآنِ حکیم اور اُس پر عمل (سورۃ ص 26:38)

★ مسلمانو! تم مُردہ ہو چکے ہو، زندگی چاہتے ہو تو اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے نظام زندگی پر پیغمبر اعظم و آخر ﷺ کی طرح عمل کرو، تم زندہ ہو جاؤ گے اور قوموں کی برادری میں سر اُٹھا کر چلنے لگو گے (سورۃ الانفال 24:8)۔

☆ یہ اللہ کا وعدہ ہے اور اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا (سورۃ الزمر 20:39)

☆ لوگ قُرآن پر غور کیوں نہیں کرتے، کیا اُن کے دل و دماغ پر قفل پڑے ہوئے ہیں؟ (سورۃ محمد 24:47)

زمانہ بھر کے دکھوں کو ہے دعوتِ آزار ایک ہی جام سب کا جواب ہے ساقی

کتابچے ''قرآنی نظام کی مکمل تفصیل اور اُس کا نفاذ'' رابطہ یا SMS کر کے مفت حاصل کریں۔

پیامِ رحمت
E-155/A-1، غزنی لین، نیو سُپر ٹاؤن، لاہور چھاؤنی فون: 042-36621120-21 موبائیل: 0323-4011616
ای میل: tehreek-e-rehmat@hotmail.com ویب سائیٹ: www.tahreekrehmat.com

www.urdu.com

استعمال کررہے ہیں۔ اَب تو دُنیا بھی جان چکی کہ بلوچستان اور سرحدی علاقوں میں بدامنی اور دراندازی کے پیچھے بھارت کے ناپاک عزائم ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ حکومت وقت پاکستانی میڈیا کے بے لگام گھوڑے کو قابو میں لائے۔ اِس ضمن میں پیمرا کا ایک قابل اعتماد اِدارہ بھی موجود ہے جو غیر اخلاقی وغیر تہذیبی مواد کو نشر کرنے سے روکنے کے لیے بنایا گیا ہے۔ پس پیمرا صرف ایسا مواد نشر کرنے دے جو خصوصاً نئی نسل کی مذہبی، تہذیبی اور اِخلاقی لحاظ سے آبیاری کرے نا کہ اُن کی اِخلاقی پستی کا باعث بنے۔ اِس ضمن میں حکومت پاکستان کو چاہیے کہ ہر نشر ہونے والے چینل خصوصاً نیوز چینل کا سختی سے آڈٹ کرے مبادا اِن کو کہیں دشمن ملک عناصر سے فنڈنگ تو نہیں ہو رہی۔ مزید برآں اِسلام اور پاکستان مخالف مواد اور نظریات کا سوشل میڈیا میں موجودگی کا سختی سے نوٹس لے۔

اللہ تعالیٰ وطن عزیز کو رہتی دُنیا تک قائم رکھے آمین

(آصف مقبول۔ جوہر ٹاؤن، لاہور)

مرد آہن کوئی نہیں

میں کوئی ادیب یا لکھاری نہیں لیکن مُلک کی محبت سے سرشار ہوں۔ ہمیں ہمیشہ بڑوں کی عزت اور لوگوں سے پیار کی تلقین کی جاتی ہے لیکن وطن میں کوئی مرد آہن نظر نہیں آتا جو مُلک کو صحیح راستے پر لے کر چل سکے۔ سارا نظام چند لوگوں کے اردگرد گھومتا ہے۔ عوام دیوانہ وار پھر انھیں چہروں کو منتخب کر لیتے بلکہ ان کے اردگرد ناچتے ہیں۔ کیا ہماری قسمت میں ایسے لوگ ہی لکھ دیے گئے ہیں؟ اگر ہمارے مُلک میں یہی نظام چلنا ہے تو بہتر ہے سارے مُلک کا نظام فوج کے حوالے کر دیا جائے۔

(فیصل حمید، لاہور)

اللہ کا فضل و کرم ہے کہ اُردو ڈائجسٹ نے اپنا معیار سالہا سال کی اشاعت کے باوجود گرنے نہیں دیا۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ اس میں مذہب، سیاست، اخلاقیات، عجوبہ واقعات سب ہی شامل ہوتے ہیں۔ جناب الطاف حسن قریشی اب تک معیاری تنقیدی مضامین شائع کر رہے ہیں۔ شمارۂ نومبر میں حلیمہ یعقوب کی داستان ناقابل فراموش ہے۔ مضمون پڑھنے کے بعد اپنے مُلک کی بڑی شخصیتوں بالخصوص سابق صدر اور سابق وزیراعظم کے حرص و ہوس مدنظر رکھتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کا فرمان یاد آتا ہے۔ ''حریص آدمی کا پیٹ قبر کی مٹی کے سوا اور کوئی چیز نہیں بھر سکتی۔''

(سید شہاب الدین احمد، ٹورنٹو، کینیڈا)

فلسطین کے نہتے مسلمان

شمارۂ جنوری گنبدِ صخرا کے خوبصورت سرورق کے ساتھ ملا۔ مسجدِ اقصیٰ کو درپیش خطرات کے حوالے سے انکشافات پر مبنی مضمون فکر انگیز بھی تھا۔ اس کا ایک اور پہلو بھی دردناک ہے اور وہ یہ کہ یہود و نصاریٰ ہمارے دشمن ہیں ہی، ہم خود بھی منافقت والی زندگی جی رہے ہیں۔ بہرحال عالمِ اسلام کے اس حالیہ مسئلے پر ترکی کے صدر طیب اردگان نے نہایت مؤثر کردار ادا کیا۔ دنیا بھر کے مسلمانوں کو خاموش اور بیان بازی تک محدود دیکھ کر انھوں نے او آئی سی کا ہنگامی اجلاس طلب کر لیا۔ قبلۂ اوّل کے تحفظ کے حوالے سے آواز بلند کرنے والے اس اقدام پر دنیا کے ۵۷ اسلامی ممالک میں سے صرف ۱۶ کے سربراہان نے شرکت کی۔ عرب ممالک نے صرف اپنے نمائندے بھیجنے پر اکتفا کیا۔ یہ اعداد و شمار شرمناک ہیں بلکہ لمحۂ فکریہ بھی کہ جب اسلامی ممالک ہی اپنے قبلۂ اوّل کے لیے اکٹھے نہیں تو غیروں سے کیا گلہ۔۔۔؟

کہا جاسکتا ہے کہ قبلۂ اوّل کی اصل حفاظت تو فلسطین کے وہ نہتے مسلمان کر رہے جن کے پاس نہ تو بڑی بڑی توپیں ہیں نہ جدید ہتھیار، صرف زمین پر پڑے پتھر ہیں۔ ایسی ہی کیفیت پر کسی نے لکھا: اللہ کی قسم! اسرائیل اور امریکا نہ تو کسی مسلم ملک کی فوج سے ڈرتے ہیں اور نہ کسی اسلامی ایٹم بم سے۔ وہ خوف کھاتے ہیں تو صرف سنگ باری کرنے والے ان دیوانوں سے، جن کی شہادت کی اُنگلی آسمان بند ہونے کے بعد بھی ربّ کی وحدانیت کی گواہ ہے اور ان کے عشق اور وفا کی گواہی مسجدِ اقصیٰ دے گی انشاءاللہ۔

(رانا محمد شاہد، بورے والا)

کتاب سے بہتر دوست کہاں!!! جُمہوری سے بہتر کتابیں کہاں!!!

ملاقاتیں کیا کیا الطاف حسن قریشی کی معرکہ آرا کتابیں
نایاب قومی اور عالمی شخصیات کے انٹرویوز قیمت 1490 روپے

جنگِ ستمبر 1965ء کی یادیں
دفاعِ وطن کے 17 دنوں کی داستان
نادر تاریخ، پہلی مرتبہ کتابی صورت میں قیمت 1000 روپے

مجھے کیوں نکالا؟ نواز شریف کے فوج سے اختلافات مصنف اسد اللہ خان
انکشافات سے لبریز کتاب۔ سول ملٹری کے تعلقات کے چشم کُشا حقائق قیمت 640 روپے

پاکستان سے بنگلہ دیش۔ اَن کہی جدوجہد	شریف الحق دالیم	860	سلطنتِ عثمانیہ سے جمہوریہ ترکیہ	ضمیر احمد ہاشمی	400
بادشاہی سے جلاوطنی۔ بہادر شاہ ظفر	فرخ سہیل گوئندی	380	تاریخ عالم	ڈاکٹر فیودور کروکن	750
ترکی ہی ترکی سفرنامہ، تاریخ و تہذیب	فرخ سہیل گوئندی	480	اکہتر کے وہ دن (مشرقی پاکستان کے آخری 9 ماہ)	جہاں آراء امام	650
بکھرتا سماج	فرخ سہیل گوئندی	380	امریکہ کی عوامی تاریخ	ہاورڈ زن	600
عالمی بینکاروں کی دہشت گردی	فرخ سہیل گوئندی	180	مسلمان اُندلس میں	سٹینلے لین پول	380
سکندرِ اعظم۔ دنیا فتح کرنے کی تاریخ	ہیرالڈ البرٹ لیمب	540	ناموس ناول	ایلف شفق	650
سلیمان عالیشان۔ تاریخ سلطنتِ عثمانیہ	ہیرالڈ البرٹ لیمب	520	رسولِ کائنات (سیرتِ نبوی)	عبدالکریم شمر	400
صلیبی جنگوں کی تاریخ۔ صلاح الدین ایوبی	ہیرالڈ البرٹ لیمب	590	سرخ میرانام ناول	اورحان پاموک	780
حیاتِ قائداعظم	ہیکٹر بولتھو	580	اُجڑے دیار ناول	انطونیو توریس	500
ایم ٹی وی سے مکہ تک۔ اسلام نے کیسے میری کایا پلٹ دی	کرسٹیان بیکر	990	سرزمین ناول	انطونیو توریس	300
سندھ ساگر اور قیامِ پاکستان	اعتزاز احسن	800	چلتا مسافر ناول	الطاف فاطمہ	800
ایشیا کا مقدمہ (سابق وزیراعظم ملائیشیا کی کتاب)	مہاتیر محمد	300	خواب گر ناول	الطاف فاطمہ	800
دہشت گردی۔ ایک فکری مطالعہ	سلمان عابد	780	شیشے کا آدمی (مختصر روسی افسانے)	ڈاکٹر نجم الحسن	550

مردِ آہن۔ روسی صدر پوتن کی سنسنی خیز سوانح Rs.600

کہانی جلال الدین رومی کی
چالیس چراغ عشق کے (ترجمہ) ایلف شفق
Rs.880 (The Forty Rules Of Love)

Free Delivery ایک فون کال پر گھر بیٹھے کتاب خریدیے

جمہوری پبلیکیشنز۔ 2۔ ایوانِ تجارت روڈ، لاہور 042-36314140
www.jumhooripublications.com

NOTICE INVITING TENDER

Sealed tenders for work mentioned below is invited from WASA, PHE & HUD approved contractors who have deposited the renewal fees for the **Financial Year 2017-18** so as to reach the undersigned office located at near Hakeem Wasti, Lorry Adda, Badami Bagh, Lahore on date given below at 12:00 Noon when the bids properly submitted will be opened, read and recorded. The Bidding Documents can be obtained from office of the undersigned immediately after publication of tender / invitation to the bid {PPRA 2014 Rule 25 (1)} against written request accompanied with attested copies of enlistment/renewal letter. The Bid Security will be 2% of the estimated cost in the shape of DCR (PPRA 2014 Rule 27). Tender without Bid Security will not be accepted.

Tender will be received in office of the undersigned up to 2:00 Noon on date of receiving / opening the tender and will be opened on same date at 01:30 P.M by the undersigned in presence of the bidders or their representatives who may choose to be present, at the time and place announced prior to the bidding {PPRA 2014 Rule 30 (2)}.

Conditional tenders and tenders without attested copies of register partnership deed and power of attorney in case of firms will not be entertained.

The bid will be valid for 60-days.

The Procuring Agency may reject all bids or proposals at any time prior to the acceptance of a bid or proposal {PPRA 2014 Rule No. 35 (1)}

Note: In case the total bid tender amount is less than 5% (five) of the approved estimated amount, the lowest bidder will have to deposit additional performance security from the bank ranging from 5% to 10% whichever is applicable. Any other information can be obtained from the office of the undersigned during working hours.

Last date for purchasing of tender is 19.02.2018

Date opening of tender is 20.02.2018.

Sr	Name of Work	T.S No. XEN(O&M-II)/ RT/& dated	Estimated Cost (Rs.)	Tender Price (Rs.)	Earnest Money as pe PPRA 2014 Rule 27
1	**TENDER NO. XEN(O&M-II)/RT/67/SDGS PACKAGE/DN/2017-18 REHABILITATION / UP-GRADATION OF WATER SUPPLY SYSTEM, CONSTRUCTION OF ADDITIONAL MAHHOLES, MANUFACTURING OF RCC SURROUND SLABS & PCC IN THE AREA OF UC.17,22,29&30, PP-141 NA-119 LAHORE** – REHABILITATION / UPGRADATION OF WATER SUPPLY AT STREET NO.2 MOHAMMADIA COLONY, SHAFIQUE MUGHAL WALI GALI NEAR RAILWAY LINE UC-17, ST NO.7,8,9,10&25 DATA NAGAR MOHAMMADIA COLONY, ST. NO. 12, 16 CHAH MOTIAN & ST NO.29 CHURCH WALI BUND GALI UC-22 IN DATA NAGAR SUB DIVISION WASA, LDA, LAHORE (PART-1)	59-63 10.01.2018	2875144.92	1000.00	2% of estimated cos Rs. 57502.90
2	**TENDER NO. XEN(O&M-II)/RT/68/SDGS PACKAGE/DN/2017-18 REHABILITATION / UP-GRADATION OF WATER SUPPLY SYSTEM, CONSTRUCTION OF ADDITIONAL MAHHOLES, MANUFACTURING OF RCC SURROUND SLABS & PCC IN THE AREA OF UC.17,22,29&30, PP-141 NA-119 LAHORE** – REHABILITATION / UPGRADATION OF WATER SUPPLY SYSTEM AT ST.NO.15,18 HABIB GUNJ, ST NO.8,10, USMAN GUNJ, ST NO. 4&8 FAROOQ GUNJ, ST NO. 5,17-B IRSHAD DHAGHA WALI UC-29, ST NO. 14,15, FAROOQ GUNJ, ST. NO. 4,5 SHARIF ABAD, SHAMAS ABAD ST. NO.25, BUTT R OOLAY WALI GALI MISRI SHAH UC-30 IN DATA NAGAR SUB DIVISION WASA,LDA, LAHORE (PART-2)	64-68 10.01.2018	2593333.47	1000.00	2% Of Estimated Cost Rs. 51866.67
3	**TENDER NO. XEN(O&M-II)/RT/69/SDGS PACKAGE/DN/2017-18 REHABILITATION / UP-GRADATION OF WATER SUPPLY SYSTEM, CONSTRUCTION OF ADDITIONAL MAHHOLES, MANUFACTURING OF RCC SURROUND SLABS & PCC IN THE AREA OF UC.17,22,29&30, PP-141 NA-119 LAHORE** – REHABILITATION / UPGRADATION OF CONSTRUCTION OF ADDITIONAL MANHOLES & MANUFACTURING OF RCC SURROUND SLABS IN UC.-22&30 IN DATA NAGAR SUB DIVISION WASA,LDA, LAHORE (PART-3)	69-73 10.01.2018	2019094.43	1000.00	2% Of estimated Cost Rs. 40381.89
4	**TENDER NO. XEN(O&M-II)/RT/70/SDGS PACKAGE/DN/2017-18 REHABILITATION / UP-GRADATION OF WATER SUPPLY SYSTEM, CONSTRUCTION OF ADDITIONAL MAHHOLES, MANUFACTURING OF RCC SURROUND SLABS & PCC IN THE AREA OF UC.17,22,29&30, PP-141 NA-119 LAHORE** – REHABILITATION / UPGRADATION OF	74-78 10.01.2018	14931575.69	1000.00	2% Of estimated Cost Rs. 298631.51

www.urdudigest.com

	RESTORATION OF PCC AT ST NO.2 MOHAMMADIA COLONY SHAFIQUE MUGHAL WALI GALI NEAR RAILWAY LINE UC-17, ST NO.7,8,9,10&25 DATA NAGAR, MOHAMMADIA COLONY ST.NO.12,16 CHAH MOTIAN, ST.NO.29 CHURCH WALI BUND GALI UC.22 ST.NO.18,18 HABIB GUNJ, ST. NO.9,10 USMAN GUNJ, ST NO.4,8 FAROOQ GUNJ, ST. NO.5,17-B, ARSHAD DHAGA WALI GALI UC-29, ST. NO.14,15 FAROOQ GUNJ, ST. NO.4,5 SHARIF ABAD, ST. NO.26 SURIYA BANO WALI GALI, ALAMGIR ROAD, ST. NO.17 SHAMAS ABAD ST. NO.25 BUTT ROLLAY WALI GALI MISRI SHAH UC-30 IN DATA NAGAR SUB DIVISION WASA, LDA, LAHORE (PART-4)				
5	**TENDER NO. XEN(O&M-II)/RT/70/SDGS PACKAGE/MS/2017-18 REHABILITATION / UP-GRADATION OF WATER SUPPLY SYSTEM AND RESTORATION OF PCC IN UC-31,43,44&46 PP-141 NA-119 LAHORE** - IMPROVEMENT / REPLACEMENT OF WATER SUPPLY SYSTEM AT AHSAN ROAD, & NAULAKHA PARK FAIZ BAGH UC-31 IN MISRI SHAH DIVISION WASA, LDA, LAHORE (PART-1)	79-83 10.01.2018	3583205.44	1000.00	2% Of Estimated Cost Rs. 71664.11
6	**TENDER NO. XEN(O&M-II)/RT/72/SDGS PACKAGE/MS/2017-18 REHABILITATION / UP-GRADATION OF WATER SUPPLY SYSTEM AND RESTORATION OF PCC IN UC.31-43,44&46 PP-141 NA-119 LAHORE** – IMPROVEMENT / REPLACEMENT OF WATER SUPPLY SYSTEM AT MAIN SAWAMI NAGAR ROAD, AND LINK STREET OF UC-43 IN MISRI SHAH SUB DIVISION WASA, LDA, LAHORE (PART-2)	84-88 10.01.2018	6459976.82	1000.00	2% Of Estimated Cost Rs. 129199.54
7	**TENDER NO. XEN(O&M-II)/RT/73/SDGS PACKAGE/MS/2017-18 REHABILITATION / UP-GRADATION OF WATER SUPPLY SYSTEM AND RESTORATION OF PCC IN UC.31-43,44&46 PP-141 NA-119 LAHORE** – RESTORATION OF PCC AFTER IMPROVEMENT / REPLACEMENT OF WATER SUPPLY SYSTEM AT AHSAN ROAD AND NAULAKHA PARK FAIZ BAGH OF UC-31 & MAIN SAWAMI NAGAR ROAD LINK STREETS OF UC-43 IN MISRI SHAH SUB DIVISION WASA, LDA, LAHORE (PART-3)	89-93 10.01.2018	2167080.90	1000.00	2% Of Estimated Cost Rs. 43341.62
	Total		**34629411.67**	**7000.00**	**692588.23**

IPL-1070

(ENGR. M. SHARJEEL HUSSAIN)
EXECUTIVE ENGINEER (O&M-II),
DIVISION RAVI TOWN, WASA.

شوکت علی شاہ

بلوچستان کے رسم و رواج

بلوچی تہذیب و تمدن کی دلچسپ اور معلومات سے بھرپور قلمی جھلکیاں

گزشتہ صدیوں کے دوران بلوچی تہذیب اور کلچر نے خاص حد تک اپنے خدوخال برقرار رکھے ہیں، کیونکہ عہدِ حاضر کی تہذیب ابھی تک صوبے کی سنگلاخ چٹانوں کو سر نہیں کر سکی۔ وہی پرانا لباس، دس گز کی پگڑی، ایک تھان کی شلوار، چار گز کا کُرتا، وہی مخصوص غذا، ستّو کی پوٹلی، پانی کی چھاگل اور حسبِ توفیق چاول۔ وہی دشت نوردی، وہی خارِ مغیلاں، موسم نامہربان، معیشت، دم توڑتی ہوئی، غربت ہاتھ جوڑتی ہوئی، ہمّت، سنگ توڑتی ہوئی اور غیرت، نقش چھوڑتی ہوئی۔

عورت کا مقام

بلوچستان میں عورت کو پاؤں کی جوتی تو تصوّر نہیں کیا جاتا، لیکن وہ سر کا تاج بھی نہیں۔ کوئی ایک آدھ تاج ہو تو انسان پہن بھی لے۔ جہاں تین چار تاج ہر گھر میں بیک وقت جگمگا رہے ہوں تو امتیاز برتنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بہرحال بلوچ معاشرے میں عورت کا ایک خاص مقام ہے۔ اگر دو قبائل میں جنگ شروع ہو جائے تو عورت کی مداخلت پر ختم

www.urdudigest.com

ہوجاتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر کوئی عورت خون بخشوانے کے لیے 'میٹر' کے طور پر چلی جائے تو اُس کے احترام میں خون تک معاف کر دیا جاتا ہے۔

بلوچوں میں دستور ہے کہ وہ غیر بلوچوں میں اپنی عورتوں کا رشتہ نہیں کرتے۔ ایک روایت کے مطابق جب بلوچ ایران میں بستے تھے تو والئ کرمان نے بلوچوں سے خطرہ محسوس کرتے ہوئے یہ خیال کیا کہ ان سے رشتے ناتے کیے جائیں، تاکہ اُس کی سیاسی حیثیت مستحکم ہو؛ چنانچہ والئ کرمان نے بلوچوں کے چوالیس فرقوں میں سے ہر ایک سے ایک ایک رشتہ طلب کیا۔ یہ مرحلہ بلوچوں کے لیے نہایت کٹھن تھا۔ اگر ایک طرف غیرت تھی تو دوسری طرف قہرِ سلطانی۔ 'نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن' والا معاملہ تھا؛ چنانچہ اُنھوں نے ہر قبیلے سے ایک ایک نوعمر لڑکے کو زنانہ لباس پہنا کر حاکمِ وقت کے سامنے پیش کر دیا اور پیشتر اس کے کہ راز فاش ہوتا، یہ مکران بھاگ آئے۔

عام طور پر بلوچوں میں پردے کا رواج نہیں۔ عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتیں اور اُن کا ہاتھ بٹاتی ہیں لیکن بلوچ ضابطۂ اخلاق بہت سخت ہے۔ اگر کوئی عورت اِس آزادی کا غلط استعمال کرے تو پھر 'سیاہ کاری' کی سزا موت ہے۔ ایک خاوند کے لیے یہ اعلان کرنا کافی تھا کہ اُس کی عورت 'سیاہ کار' ہے۔ اس کے بعد اُسے قبائلی قانون کے تحت حق پہنچتا تھا کہ وہ ہر دو زن و مرد کو قتل کر دے۔ اس قبائلی قانون کا بعض بے ضمیر لوگوں نے ناجائز فائدہ اُٹھانا شروع کر دیا اور محض اپنے دشمن کو ٹھکانے لگانے یا بیوی سے چھٹکارا پانے کے لیے بے گناہ عورت پر 'سیاہ کاری' کا الزام لگانا شروع کر دیا۔ حکومت نے اس رواج کو ایک قانون کے ذریعے ختم کر دیا ہے۔

مہمان نوازی

بلوچوں میں مہمان کی خاطر مدارات نہ صرف عام بلکہ عین جزوِ ایمان ہے۔ میزبان، مہمان کے لیے دیدہ و دل فرشِ راہ کرتا ہے۔ بہرحال عزیز از جان مہمان، بلائے جان اُس وقت بنتا ہے جب قیام کی مدّت طول پکڑ جائے۔ ہر بلوچ حسبِ استطاعت مہمان کی خدمت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ سالم دُنبہ ذبح کر کے اُس کی سجی بنائی جاتی ہے۔ دستور کے مطابق کوئی بلوچ مہمان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا نہیں کھاتا تاکہ وہ اُس کی موجودگی میں کوئی حجاب یا تکلّف محسوس نہ کرے۔ دسترخوان چننے کے بعد میزبان مہمان کو دعوتِ کام و دہن دے کر خود چلا جاتا ہے۔ اگر مہمان زیادہ ہوں تو پھر اُن کے خورد و نوش کا بار تمام گاؤں والے مل کر برداشت کرتے ہیں۔

حقِ ہمسایہ

بلوچ معاشرے میں ہمسائے کے حقوق کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ پناہ میں آئے ہوئے شخص کی حفاظت ایک ایسا فرض ہے جو ہر بلوچ مرتے دم تک ادا کرتا ہے۔ بسا اوقات اس فرض کی تکمیل میں اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے، لیکن رسم زندہ رکھی جاتی ہے۔ چونکہ ہر بلوچ بنیادی طور پر غیور ہے، اس لیے پناہ لینے کی نوبت کم آتی ہے۔ بلوچ تاریخ میں دو واقعات ایسے ملتے ہیں جہاں اس رسم کو زندہ رکھنے کے لیے قبائل آپس میں ٹکرا گئے۔ بعد میں یہ تاریخی واقعات رزمیہ شاعری کی بنیاد بنے اور بلوچ شعرا نے اِن میں رومانوی رنگ بھر کے مزید کشش پیدا کر دی۔

مسماۃ گوہر جس کے حسن کے چرچے بلوچستان کی مست آنکھوں والی ہرنیوں تک پہنچ چکے تھے، میر گوہرام

خان لشاری کی ہمسائیگی چھوڑ کر میر چاکر خاں رند کی پناہ میں آ گئی۔ یہ مالدار عورت تھی اور اونٹوں کے بے شمار گلّے اُس کی ذاتی ملکیت تھے۔ کچھ تو اس بُتِ کافر سے بچھڑنے کا غم، کچھ سیم و زر سے محرومی کا دُکھ، کچھ اپنے قبیلے کی تذلیل پر برہم۔ میر گوہرام خان نے بدلہ لینے کی ٹھانی اور ایک دن گوہر کی اونٹنیاں ہانک کر لے گیا۔

جب یہ خبر میر چاکر خان تک پہنچی تو وہ غصّے سے بیدِ مجنون کی شاخ کی طرح لرزنے لگا اور فوراً قبیلے کے سرداروں کو مشورے کے لیے طلب کیا۔ میر بیورغ نے جو ایک جہاندیدہ سردار تھا، رائے دی کہ اس واقعے کو رندوں کے وقار کا مسئلہ نہ بنایا جائے، بلکہ اسے راہزنی کا ایک عام واقعہ تصوّر کیا جائے۔ رند اس واقعے کو کیسے فراموش کرتے؟ چنانچہ اس گرم بحثی میں کسی نے بیورغ رند کو طعنہ دیا: ''بیورغ دشمن کے تیروں سے سہم گیا ہے۔ وہ نیزوں کی اَنی اور خنجر کی دھار سے خائف ہے۔ تلواروں نے اُسے خوفزدہ کر دیا ہے۔ اے بیورغ! ڈرمت۔ جہاں ہم تلوار کے جوہر دکھلائیں گے، وہاں تجھے تیروں کی زد سے بھی بچائیں گے''۔

میر بیورغ کی غیرت کے لیے یہ الفاظ تازیانہ تھے چناں چہ ہر دو قبائل آپس میں ٹکرا گئے اور تیس برس تک جنگ کے شعلے بھڑکتے رہے۔

پابندی عہد

پُرانے زمانے میں کسی شخص کی شخصیت کو جانچنے کا واحد معیار یہ تھا کہ وہ اپنا قول نبھانے میں کس حد تک ثابت قدم رہتا ہے۔ بلوچ سرداروں نے بڑی سے بڑی قربانیاں دیں، لیکن اپنے مسلک سے ایک قدم بھی پیچھے نہ ہٹے۔ رند سردار میر چاکر خاں نے عہد کیا تھا کہ زندگی بھر جھوٹ نہ بولے گا۔ جمعرات کو کوئی شخص اُس سے جو چیز بھی مانگے گا، وہ دے دے گا۔

میر اَن نے عہد کیا تھا کہ وہ جس بلوچ عورت کے سر پر پانی کا مشکیزہ دیکھے گا، اُس کو ایک کنیز ضرور دے گا۔ میر جاڑو نے عہد کیا تھا کہ جو شخص اُس کی ڈاڑھی کو ہاتھ لگائے گا، وہ اُسے قتل کر دے گا۔ میر بیبت خان نے قسم کھائی تھی کہ جس شخص کا اُونٹ اُس کے گلّے میں آ ملے گا وہ اُس کو واپس نہیں کرے گا۔ ان اقوال کے پس منظر سے اتنا عزم و ثبات نہیں ٹپکتا جتنی انا پرستی اور جہالت جھلکتی ہے، لیکن بلوچ تاریخ بتلاتی ہے کہ اُنھوں نے ان اقوال کو پوری طرح نبھایا۔ شاہ مرید اپنی چہیتی محبوبہ حانی تک سے دست کش ہو گیا۔ میر جاڑو نے اپنے بیٹے کو پاسِ عہد کی خاطر ہلاک کر ڈالا۔

کینہ توزی

انتقام ایک ایسا جذبہ ہے جو ہر بلوچ کی سرشت میں ودیعت کر دیا گیا ہے۔ انتقام کی بھٹّی میں بعض دفعہ افراد کی جگہ قبائل کود پڑتے ہیں۔ خاک اور خون کے اس کھیل میں وقت کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ اندھے جذبات جب بھڑکتے ہیں تو فہم و ادراک کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ سوچ، تحمّل اور رواداری کی قوّتیں مفلوج ہو کر رہ جاتی ہیں۔ بچے ماؤں کے سامنے ہلاک ہلاک کر دَم توڑ دیتے ہیں۔ بیویاں ڈوبتی ہوئی نظروں سے اپنے سہاگ لُٹتے ہوئے دیکھتی رہتی ہیں، لیکن کچھ کر نہیں سکتیں۔ اُن کے اردگرد روایات اور بے بسی کے گہرے سمندر حائل ہوتے ہیں، کیونکہ انتقام نہ لینا ایک طرح کی بُزدلی اور کمزوری تصوّر کی جاتی ہے۔ اُس معاشرے میں صرف گردن اُونچی کر کے زندہ رہا جا سکتا ہے۔ جھکی ہوئی گردن کے مقدر میں صرف ٹھوکریں ہوتی ہیں۔ مشہور بلوچی شاعر بالاچھ کا یہ شعر بلوچوں میں ضرب

www.urdudigest.com

المثل کی حیثیت رکھتا ہے۔

دیر ہاں خون او بلوچھانی
چھ رَو بے دائیں لغورانی

''بلوچ، خون کا بدلہ اس لیے نہیں چھوڑ سکتا کہ واقعے کو گزرے ہوئے مُدّت ہوگئی ہے یا بدلہ لینے والا کمزور اور کمسن ہے''۔

ایک بلوچ سردار دو دار ہزنوں سے لڑتا ہوا مارا گیا تھا۔ اُس کا چھوٹا بھائی بالاچھ اُس وقت کمسن تھا۔ اُس نے بچپن ہی میں عہد کیا تھا کہ اپنے بھائی کے خون کا بدلہ ضرور لے گا؛ چنانچہ بڑا ہو کر اُس نے اپنا عہد نبھایا اور دشمن کے قبیلے کے چھیاسٹھ آدمیوں کو قتل کیا۔

بالاچھ شاعر بھی تھا۔ اُس کی شاعری عوامی جذبات کی آئینہ دار ہے۔ بالاچھ کہتا ہے: ''میں اپنے دشمنوں اور دودا پر ظلم کرنے والوں کے ساتھ وہ سلوک کروں گا جو باز کبوتروں کے ساتھ کرتا ہے، جو بادِ سموم چھوٹے چشمے کے ساتھ کرتی ہے، جس طرح سؤر فصلوں کو تباہ کر ڈالتا ہے، جیسے بکری ہری بھری کونپلوں کو چٹ کر جاتی ہے، جو سلوک بھیڑیا بوتے (اونٹ کا بچّہ) کے ساتھ کرتا ہے یا جیسے مچھیرے مچھلی کے ساتھ کرتے ہیں''...

بالاچھ ایک اور جگہ دشمن کو خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے: ''دشمن کے ساتھ ہماری صلح اُس وقت ہوگی جب گز کے درخت کو کانٹے لگ جائیں گے، سانپوں کے پاؤں نکل آئیں گے، کوّے دودھ دینا شروع کر دیں گے، ہاتھ کی ہتھیلی پر بال اُگ آئیں گے، کشتیاں زمین پر چلنا شروع کر دیں گی، جنگلی شیر پالتو بن جائیں گے''۔

توہمات

روزِ اوّل سے اقوام اور افراد توہمات کے اسیر رہے ہیں۔ بلوچ قبائل میں بھی مختلف قسم کے توہمات موجود ہیں۔ اگر کوئی شخص سفر پر جا رہا ہو تو اُس کو پیچھے سے بُلانا یا آواز دینا بدشگونی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ مسافر سفر پر جانے کا ارادہ ترک کر دیتا ہے، کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ سفر کا انجام اچھّا نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ ایک جوتی کا دوسری جوتی پر آنا سفر کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ آنکھ کا پھڑکنا کسی عزیز سے ملنے کی نوید دیتا ہے۔ ہتھیلی پر خارش آمدِ سیم وزر سمجھی جاتی ہے۔ اس طرح بار بار ہچکی کا آنا بھی آمدِ دولت تصوّر کیا جاتا ہے۔

جس طرح پرندوں میں اُلّو نحوست کی علامت ہے، اُسی طرح بلوچوں میں گیانچ نامی پرندے سے سعادت اور نحوست کے دَر وا ہوتے ہیں۔ اگر سفر پر جاتے ہوئے آغازِ سفر میں یہ پرندہ دائیں جانب اُڑتا ہوا نظر آئے تو اسے نیک شگون تصوّر کیا جاتا ہے، اگر اس کے برعکس یہ بائیں جانب نظر آئے تو تباہی و بربادی کی علامت ہوتا ہے۔

شانے کی ہڈی دیکھ کر مستقبل کی پیشین گوئی کرنا

جس طرح ماہرینِ علمِ نجوم ستاروں کی گردش سے مستقبل کے دریچوں میں جھانکتے ہیں، اسی طرح روایات کے مطابق بلوچ ماہرین بھیڑ یا بکری کے شانے کی ہڈی کی لکیریں دیکھ کر تندرستی، بیماری، رزم و بزم اور موسمی حالات کے تغیّر و تبدّل کے متعلق پیشین گوئیاں کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ایک دلچسپ روایت کچھ اس طرح ہے:

ایک ماہر شخص نے سفر کے دوران میں شانے کی ہڈی دیکھی تو بیدِ مجنوں کی طرح لرزنے لگا اور ہڈی فوراً پھینک دی۔ ایک دوسرے شخص نے جو اُس کے قریب ہی بیٹھا ہوا تھا اور اُس سے بہتر سوجھ بوجھ رکھتا تھا، اُس سے پریشانی کی وجہ پوچھی۔ پہلے آدمی نے بتایا کہ شانے کی ہڈی کی لکیریں ظاہر کرتی ہیں کہ اگر وہ سفر پر روانہ ہو گیا تو اُس کی موت یقینی ہے، اور اگر ارادۂ سفر ترک کر کے واپس چلا

جائے تو اپنی بیوی سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔

دوسرے ماہر نے شانے کی ہڈی اُٹھائی۔ اُسے غور سے دیکھا اور پھر اطمینان کا سانس لیتے ہوئے دوست سے کہنے لگا، گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے آٹے کی تھیلی میں انبان (سانپ) گھسا ہوا ہے۔ اگر تم سفر جاری رکھو گے تو لامحالہ آٹا نکالنے کے لیے تھیلی میں ہاتھ ڈالو گے اور سانپ تمہیں کاٹ لے گا اور اگر گھر واپس لوٹو گے تو تمہاری بیوی کو یہی عمل دہرانا پڑے گا اور ظاہر ہے کہ اُس کا انجام بھی تم سے کچھ مختلف نہ ہوگا۔ بہتر یہی ہے کہ تھیلی کا منہ کھول دو اور اس بلائے ناگہانی سے نجات پاؤ۔ چنانچہ جب آٹے کی تھیلی کا منہ کھولا گیا تو اُس میں سے انبان نکلا جس کو فوراً مار دیا گیا۔

چوری اور رسمِ حلف

بلوچستان میں چوری کی وارداتیں بہت کم ہوتی ہیں۔ بالفرض کہیں چوری یا راہزنی کی وارداتیں ہو جائے تو اُس کی جانچ پڑتال نہایت عجیب طریقوں سے کی جاتی ہے۔ اگر مشتبہ شخص کے خلاف عینی شہادت نہ ہو تو اُس سے حلف لے کر تسلّی کی جاتی ہے۔ بعض قبائل کے رسم و رواج کے مطابق ملزم کو آگ اور پانی میں ڈالا جاتا ہے۔ اس کو بلوچی میں 'آس' اور 'آف' کہتے ہیں۔ ملزم کو اس بات کا اختیار دیا جاتا ہے کہ ان دو میں سے اپنی مرضی کا حلف اُٹھا لے۔ اگر ملزم آگ کا حلف پسند کرتا ہے تو اُس کو دہکتے ہوئے انگاروں پر چلنے کے لیے کہا جاتا ہے، لیکن اگر آگ کے حلف سے گریزاں ہو تو ایک مخصوص مدّت تک پانی میں غوطہ لگانا پڑتا ہے۔

آگ کے ذریعے حلف دو طریقوں سے لیا جاتا ہے۔ ایک کھائی میں لکڑیاں ڈال کر آگ لگا دی جاتی ہے۔ جب لکڑیاں جل کر سُرخ انگاروں میں تبدیل ہو جاتی ہیں تو ملزم سے کہا جاتا ہے کہ ننگے پاؤں انگاروں پر چلے۔ اس موقع پر ایک مُلّا آگ کو قسم دیتا ہے کہ اگر ملزم بے گناہ ہے تو اُس کو اللہ کے نام پر محفوظ رکھے اور اگر گنہگار ہے تو فی النار کر دے..... زندگی اور موت کے اس کھیل میں چند منصف مقرّر کیے جاتے ہیں جن کی نگرانی میں تمام کارروائی ہوتی ہے اور وہ بعد میں اپنا فیصلہ صادر کرتے ہیں۔

روایت کے مطابق اگر ملزم بے گناہ ہو تو آگ، ہر چند کہ گلزار تو نہیں بنتی، لیکن اُسے بے قرار بھی نہیں کرتی اور اگر گنہگار ہو تو پھر اُسے جہنّم کے سفر کا تردّد نہیں کرنا پڑتا..... اسی طرح پانی میں ملزم کو ایک خاص عرصے تک ڈبکی لگانی پڑتی ہے یا کھولتے ہوئے پانی میں ہاتھ ڈال کر سکّے نکالنے پڑتے ہیں..... تہذیب کے ارتقا کے ساتھ اب یہ رسومات قصّۂ پارینہ بن گئی ہیں۔

طریقِ علاج

بلوچوں میں علاج کے طریقے بھی نرالے ہیں، کیونکہ ہر طرف اسپتال ناپید، ڈاکٹر مفقود، دوائیں عنقا..... جس ڈاکٹر کے دل میں انگلستان بستا ہو، وہ ظاہر ہے بلوچستان کے نام ہی سے بِدک کے گا۔ جونرس مریض کی بارک تک نہیں پہنچ پاتی وہ بھلا پدراک کیسے جائے گی؟ جن اسپتالوں کا لاہور اور کراچی میں بھی کال ہے، اُن کا وجود پسنی اور گوادر میں محال ہے..... اس لیے ہر چہ بادا باد کوئی جڑی بوٹیوں پر انحصار کر رہا ہے تو کوئی پیروں فقیروں کے اعتبار میں مر رہا ہے۔

بدقسمتی سے جہاں جہالت اور غربت ہمکنار ہوتی ہیں، وہاں تکالیف اور محرومیاں بھی بے شمار ہوتی ہیں۔ بیماری موت کا پروانہ لے کر آتی ہے۔ جاں بلب مریض کچھ تو مرض

www.urdugem.com

سے نڈھال، کچھ نذرونیاز دے کر کنگال ہوتا ہے۔ ادھر بیماری آن گھیرتی ہے تو اُدھر مُلّا اُس کے گھر ڈیرا ڈال دیتا ہے۔ بکرے ذبح ہو رہے ہیں۔ بھوت پریت کو رام کرنے کے لیے دیگیں دم ہو رہی ہیں۔

علاج کے لیے مُلّا کسی مراثی یا ساز ندے کو ساز بجانے پر مامور کرتا ہے۔ جب میراثی تنبورے پر کوئی دُھن چھیڑتا ہے تو مُلّا پر وجد و حال کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ وہ عالمِ جذب میں ساز کے تال پر بے خودی میں رقص کرنے لگتا اور ساتھ ساتھ مریض کو دم بھی کرتا جاتا ہے۔ اس طرح مریض کو دو تین راتیں دم کیا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ بلوچوں میں داغ کی رسم بھی عام تھی۔ نزلے، دردِ سر اور اعصابی تناؤ کے لیے لوہے کی سلاخ گرم کر کے مریض کے جسم کے کسی حصّے کو داغ دیا جاتا تھا لیکن اب اس قسم کے علاج سے بلوچ اجتناب کرتے ہیں۔ بعض قبائل میں نمونیہ، یرقان اور بخار اُتارنے کے لیے مریضوں کو جانوروں کی کھال پہنائی جاتی تھی۔ یرقان کے لیے بکری کی تازہ کھال موزوں خیال کی جاتی جبکہ نمونیے کے لیے بھیڑ کی کھال کو استعمال کیا جاتا تھا۔

چھوٹے بچّوں کے امراض کا علاج انھیں گائے کی اوجھڑی سے نکلنے والے مواد میں پوری طرح لٹا کر کیا جاتا۔ طفلک کو پورے بارہ گھنٹے اُس کے اندر رکھّا جاتا۔ صرف آنکھیں، ناک اور مُنہ کھلے رہتے۔ براہوی قبائل میں خاصی حد تک جڑی بوٹیوں پر بھی انحصار کیا جاتا ہے۔ ان بُوٹیوں کے مختلف نام ہیں..... 'کول مور' اور 'خسین جھر' قبض کشائی کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔ اسی طرح 'ماٹھے ٹو' بوٹی ضعفِ جگر کے لیے اکسیر تصوّر ہوتی ہے۔ حسین بھوا، اور پسین پھلی ہر قسم کے بخار کے لیے مریض کو دی جاتی ہے۔

بجار یا پھوڑی کی رسم

بجار یا پھوڑی کی رسم بجار یا پھوڑی کے پس پردہ جو بنیادی جذبہ کارفرما ہوتا ہے، وہ امداد باہمی کا ہے۔ ایک ایسے معاشرے میں جو بینک بیلنس کی کرامات سے نا آشنا ہو، جہاں ضروریاتِ زندگی کی قلّت ہو اور ذخیرہ اندوزی کی علّت نہ ہو، جہاں انسانی اقدار ابھی تک پامال نہ ہوئی ہوں اور جہاں ضمیر آدمیت ہنوز زندہ ہو، وہاں ایک دوسرے کی امداد کرنا فرض ہی نہیں، قرض بھی سمجھا جاتا ہے۔

جشنِ مسرّت ہو یا مرگِ اندوہناک، قبیلے کے لوگ نہایت فراخدلی اور فیّاضی کے ساتھ مالی امداد کی صورت میں اپنی عملی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں..... اگر کوئی غریب بلوچ شادی کرنا چاہتا ہے اور مروّجہ لب یا زر ولود لہن کے والدین کو ادا نہیں کر سکتا یا اُسے کوئی اور آفتِ ناگہانی آن گھیرتی ہے تو وہ خود یا اُس کے عزیز و اقارب قبیلے کے لوگوں سے امداد طلب کرتے ہیں۔ اس کو بلوچی میں بجار یا پھوڑی کہا جاتا ہے۔

استطاعت رکھنے والے لوگ حسبِ حیثیت نقد یا جنس کی صورت میں اُس کی امداد کرتے ہیں۔ چونکہ کوئی شخص بلا ضرورت بجار نہیں کرتا، اس لیے نہ تو اُس کو گدائے بے حیا سمجھا جاتا ہے اور نہ ہی وہ فقیرِ بے نوا متصوّر ہوتا ہے۔ اس طرح عزّتِ نفس بھی محفوظ رہتی ہے اور معاشی تقاضوں سے بھی نجات ملتی ہے۔ پھوڑی اور بجار میں فرق یہ ہے کہ 'پھوڑی' حاصل کرنے کے لیے خود لوگوں کے پاس جانا پڑتا ہے، جبکہ قبیلے کے لوگ بجار خود بخود اپنے عزیز و اقارب یا سردار کو رضا کارانہ طور پر پیش کرتے ہیں۔ بجار شادی اور غمی دونوں مواقع پر پیش کی جاتی ہے... اس میں دُنبہ، بکری یا نقد رقم دی جاتی ہے۔ ●●●

ڈاکٹر محمد وسیم اکبر شیخ

نافرمان اولاد

جھوٹی انا اور غرور کے مارے دو غافل انسانوں کا عبرت انگیز قصّہ

جمیل احمد گورا چٹا اور لمبا تڑنگا نوجوان تھا۔ جائیداد کی خرید و فروخت کا کام کرتا تھا۔ شہر میں اس کی کافی زمینیں اور دکانیں بھی تھیں۔ پراپرٹی کے کاروبار میں اس نے بے پناہ دولت کمائی تھی۔ وہ ایک فارغ البال اور بے فکرا نوجوان تھا۔ اس میں صرف ایک خامی تھی کہ وہ اپنی ماں کے ساتھ نہایت بدتمیزی سے پیش آتا۔ اس کی ماں کا نام فاطمہ تھا۔ وہ اسے چڑا چڑا کے "پھاتاں" کہا کرتا۔ ماں اس سے پھر بھی پیار کرتی تھی اور اسے کہتی "میں تیرا بیاہ کر دوں گی تو تُو خود ٹھیک ہو جائے گا۔"

بالآخر ماں نے اس کی شادی کر دی لیکن اب اس کی بدتمیزی، اکھڑ پن اور غرور تکبر میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ اس کی ماں نیچے رہتی اور وہ اوپر والی منزل پر بیوی کے ساتھ رہتا۔ جب گھر میں گوشت پکاتا تو ماں کو چڑانے کے لیے بھنا گوشت سامنے رکھ کر خود کھا لیتا۔ اگر بیوی بچوں کے لیے پھل لاتا تو پہلے ماں کو دکھا کر چڑاتا۔ اس کی ماں اب بوڑھی ہو چلی تھی۔ قوت برداشت کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ ایک دن ماں نے بڑی نرمی اور محبت سے اسے سمجھایا تو وہ نہایت کرخت لہجے میں بولا "ماں دراصل میں تیرا بیٹا نہیں ہوں۔ دیکھ میرا رنگ گورا ہے اور تو کالی ہے۔ جمیل احمد کالی ماں کا بیٹا نہیں ہو سکتا۔ میں تو حسین و جمیل ہوں۔ میں تیرا بیٹا نہیں۔

غرض اس نے اپنی تلخ اور طنزیہ گفتگو سے ماں کا جگر چھلنی کر دیا۔ اس نے اسے بددعا دی اور کہا تیرے ہاں نرینہ اولاد نہ ہو گی۔ اگر تیرا بیٹا ہوا تو میری قبر خراب کر دینا اور خدا کرے تیری گوری چمڑی سوکھی پاپڑی کی طرح ادھڑ جائے۔ اس صدمے اور بددعا کے بعد وہ چند دن بعد مر گئی۔ جمیل احمد اس کے جنازے میں بھی شریک نہ ہوا۔ لوگ فاتحہ خوانی کے لیے آتے تو وہ بُرا مناتا۔ وہ اب بھی یہی کہتا "وہ میری ماں نہیں تھی۔"

ماں کے مرنے کے بعد چند اہم باتیں ہوئیں۔ ایک تو یہ کہ اس کی دکانیں اور زمینیں اونے پونے بک گئیں دوسرا یہ کہ وہ ایک پراسرار قسم کی جلدی بیماری کا شکار ہو گیا۔ وہ سارا دن الگ تھلگ بیٹھا رہتا۔ اس نے اپنے ساتھ ایک لکڑی

www.urdu...com

رکھی ہوتی جس سے وہ اپنی کمر اور بازو کھجاتا رہتا۔ اس نے اپنا جسم کھجا کھجا کر اس پر زخم کر لیے تھے۔ وہ کہتا خارش کرنے سے مجھے سکون ملتا ہے حتیٰ کہ اس نے خود ہی اپنے ہاتھوں سے اپنے جسم کی کھال اُدھیڑ ڈالی۔

رفتہ رفتہ وہ نفسیاتی مریض بن گیا۔ ہر کسی کو گالیاں دیتا، بدتمیزی کرتا۔ بالآخر اس کے رشتے داروں نے اسے ہسپتال داخل کروادیا۔ وہاں اسے بجلی کے جھٹکے دیے جاتے تو اس کی چیخیں ساتویں آسمان تک جاتیں۔ ہسپتال والوں نے یہ کہہ کر اسے فارغ کر دیا کہ خارش ایک متعدی بیماری ہے۔ دیگر مریض وارڈ چھوڑ کر چلے گئے کیونکہ وہ کمزور جسم کے ساتھ موٹی موٹی خالی آنکھوں سے جس کسی کو بھی دیکھتا، وہ دور بھاگ جاتا۔ غرض وہ جس گوری رنگت اور خوبصورت جلد پر فخر کیا کرتا تھا، وہ نہ صرف یہ کہ اُدھڑ چکی تھی بلکہ وہ خود نیم پاگل اور جنونی ہو کر دنیا سے رخصت ہوا۔

☆☆☆☆☆

نعیم قریشی ایک سرکاری محکمے میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ اس کے پاس بنگلہ، کار، بینک بیلنس اور حرام کی کمائی بہت تھی۔ وہ دوستوں میں بڑا خوش اخلاق مشہور تھا مگر نجانے کیوں اپنے بہن بھائیوں سے اچھا سلوک نہیں کرتا تھا۔ دراصل اسے اپنی نوکری، دولت اور تعلقات پر بڑا فخر تھا۔ اس کے دو بھائی اور ایک بہن تھی۔ یہ سب متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔

بہن کی جب شادی ہوئی تو اس نے شادی میں شرکت سے معذرت کر لی کہ اسے رشتہ ناپسند تھا۔ دراصل وہ بخالت کی وجہ سے بہن کو جہیز دینے سے گریزاں تھا۔ اس کی غریب بہن کی شادی رشتے داروں نے مل جل کر طے کر دی۔ شادی والے دن شامیانے، قناتیں، قمقمے لگے ہوئے تھے۔ بارات آچکی تھی۔ بہن روئے جاتی تھی کہ ایک دفعہ دنیا والوں کو دکھانے کے لیے ہی بھائی سے کہو، شادی میں شرکت کر لے لیکن سنگدل بھائی نے بہن کی آہ و فریاد پر کوئی توجہ نہیں دی۔

رشتہ داروں نے اس کی ڈولی رخصت کر دی۔ اس کی بہن آج اپنے گھر میں خوشحال ہے لیکن بھائی نے کوئی رشتہ ناتا نہیں رکھا۔ اس کی سنگدلی پر محلے، برادری کے لوگوں نے اسے بہت سمجھایا لیکن نعیم اپنی ضد اور ہٹ دھرمی پر اڑا رہا۔

پھر یہ ہوا کہ نعیم قریشی کا بڑا بیٹا ایک بم دھماکے میں جاں بحق ہو گیا۔ بیوی مختلف بیماریوں کا شکار ہو کر بستر سے لگ گئی۔ چھوٹی بیٹی کو طلاق ہو گئی اور خود نعیم قریشی فالج کا شکار ہو کر زندہ لاش بن گیا۔ اس کے دائیں بازو اور زبان پر فالج کا اثر ہوا تھا۔ وہ بول نہیں سکتا تھا۔ صرف بستر پر لیٹے لیٹے آنسو بہاتا رہتا۔

اس کی جمع پونجی علاج کی نذر ہو گئی لیکن پھر بھی اس نے اپنی بہن سے معافی نہیں مانگی۔ وہ اتنا سنگدل تھا کہ اس حالت میں جب بہن اسے ملنے آتی تو وہ منہ دوسری طرف کر لیتا اور اشارے سے اسے گھر سے نکل جانے کا حکم دیتا۔ بستر پر پڑا وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا۔ لوگ اسے دیکھتے تب توبہ توبہ کرتے۔ اس کی اولاد بھی اس سے تنگ آچکی تھی۔ بالآخر اسی حالت میں وہ دنیا سے رخصت ہو گیا۔

قارئین کرام! آپ نے دو سچے واقعات ملاحظہ فرمائے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لوگ اتنے سنگدل، مغرور اور انا پرست کیوں بن جاتے ہیں؟ دراصل شیطان، ہر انسان کا دشمن ہے۔ یہ اسے کرسی و اقتدار اور مال و دولت کے پُرفریب جال میں پھنسا کر تنگ نظر، متکبر، حاسد اور غصہ ور بنا دیتا ہے۔ یوں انسان دنیا کو مستقل ٹھکانہ سمجھنے لگتا ہے۔ دوسری طرف اللہ کی مرضی ہے یعنی قرآنی تعلیمات سے راہنمائی جو انسان کو سیدھی راہ دکھلاتی ہیں۔

شیطان کا فریب خوردہ شخص قرآن فہمی سے بہت دور ہوتا ہے، اسی لیے اس کے دل میں ماں باپ، بہن بھائی، رشتے داروں اور دوستوں ماتحتوں کی کوئی عزت نہیں ہوتی۔ انسان کی غفلت اور کم فہمی اُسے ظالم اور متکبر بنا دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو عاجزی، تواضع اور انکسار کا رویہ پسند ہے۔ جو لوگ محبت اور رواداری کو اپنا لیں، دنیا و آخرت کی نعمتیں انھی کے حصے میں آتی ہیں۔ ●●●

رونی فرنانڈس۔ انجم فاروق ساحلی

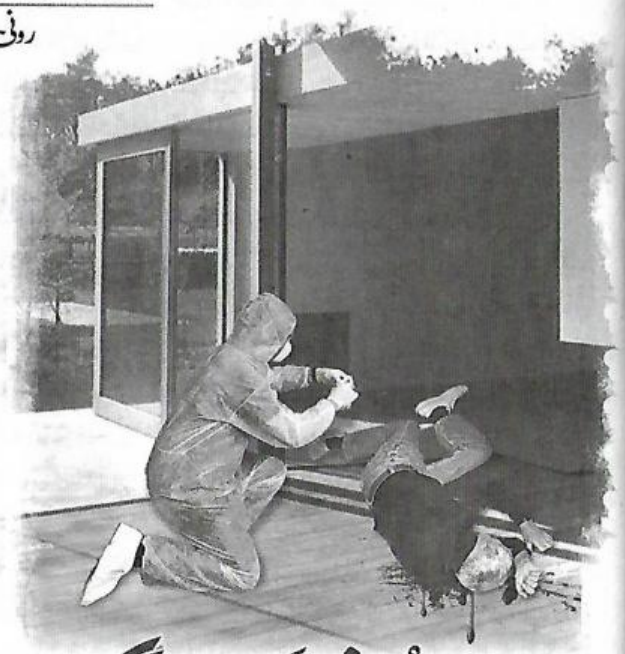

رُخِ مَرگ

مجرم کی معمولی سی لرزش نے قانون کو اُسے دبوچ لینے کا سنہرا موقع عطا کر دیا

کمرے میں داخل ہونے کے بعد سراغ رساں اسٹیو محتاط ہو کر قدم اٹھانے لگا، مبادا قیمتی اور نازک فرنیچر میں سے کوئی چیز اُس کے بھاری بھاری ہاتھ، پیروں کی زد میں آ کر ٹوٹ جائے۔ کمرے سے گزر کر وہ دھوپ سینکنے والے برآمدے میں آ گئے جہاں اسٹیو نے قدرے اطمینان محسوس کیا۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں لاش پائی گئی۔

''ذرا مجھے اپنی رپورٹ دکھاؤ''۔ اسٹیو نے اپنے اسسٹنٹ ہرلے سے کہا۔

ہرلے چھوٹے چھوٹے بالوں والا میانہ قامت شخص تھا۔ اُس نے چھپے ہوئے کاغذوں پر اپنی تیار کردہ رپورٹ اُس تھما دی۔ رپورٹ کے مطابق اس گھر کے مالک اگسٹ پیل کی لاش نو بجے دھوپ سینکنے والے برآمدے میں پائی گئی تھی۔ اُسے گولی مار کر ہلاک کیا گیا تھا اور لاش سب سے پہلے گھر کی خادمہ برتھا نے دیکھی تھی۔

مسز اگسٹ پیل اس وقت اپنی صبح کی ڈرائیو کے لیے باہر گئی ہوئی تھی۔ جیسے ہی وہ واپس آئی، خادمہ نے اُسے قتل کی واردات کے بارے میں مطلع کیا اور اُس نے ٹھیک نو بج کر آٹھ منٹ پر پولیس کو اس کی اطلاع دی۔ مکان میں ان میاں بیوی کے علاوہ صرف ایک اور فرد رہائش پزیر تھا۔ اس کا نام جون رابرٹ تھا۔ وہ مسز اگسٹ کا بھائی تھا۔

www.urdugem.com

اسٹیو نے یہ معلومات ذہن کے کسی نہاں خانے میں محفوظ کرلیں اور عملے کے ان لوگوں کو دیکھنے لگا جو فنگر پرنٹس تلاش کرنے اور لاش کی تصاویر اُتارنے کا کام تقریباً مکمل کر چکے تھے۔ ان ماہرین میں سے ایک نے تو باقاعدہ نقشہ بھی تیار کرلیا تھا جس سے پتا چلتا تھا کہ گولی برآمدے کی کھلی کھڑکی سے جنوب کی سمت سے آئی تھی۔ وہ اگست اپیل کی پیشانی میں اُتر گئی تھی۔

اگست اپیل اپنی میز کے قریب، گھومنے والی ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ اُس کی پشت پر دو کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ اس کے سامنے یعنی جنوب کی سمت کھڑکی سے باہر ایک مختصر سا لان اور درختوں کا چھوٹا سا جھنڈ تھا۔ میز پر لکھنے پڑھنے کا سامان تھا۔ میز عام سی ہی تھی۔ اس کی درازوں میں کوئی خاص چیز نہیں تھی، بس کاغذ پنسلیں وغیرہ ہی رکھی تھیں۔

''ہرلے''۔ اسٹیو نے اپنے اسسٹنٹ کو مخاطب کیا۔ ''وہاں کون رہتا ہے؟'' اس کا اشارہ گیراج کی طرف تھا جس کی چھت پر ایک چھوٹا سا اپارٹمنٹ موجود تھا۔ اس کا فاصلہ یہاں سے تقریباً پچاس فٹ تھا اور مقتول اگست کا چہرہ اس طرف تھا۔

گویا مرنے سے قبل وہ کھڑکی کے راستے اُدھر ہی دیکھ رہا تھا۔ ہرلے نے اپنی رپورٹ پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔ ''ولیم ڈین! وہ ڈرائیور ہے اور کسی زمانے میں قید کاٹ چکا۔ اُس کا کہنا ہے کہ وہ یہ بات ہمیں بتانا چاہتا تھا لیکن ہم نے اُس سے پہلے ہی معلوم کرلی''۔

''اُس کے کمرے میں صندوقوں کے نیچے سے بائیس بور کی رائفل برآمد ہوئی ہے''۔ اسٹیو نے پوچھا۔

''جی ہاں، اُسے رگڑ کر صاف کردیا گیا ہے۔ اُس پر کسی قسم کے انگلیوں کے نشانات موجود نہیں۔ البتہ چیمبر میں ایک خالی کارتوس ملا ہے''۔

''اس وقت ولیم ڈین کہاں ہے؟'' ہرلے نے انگوٹھے سے اپنے عقب میں اشارہ کیا اور بولا۔ ڈائننگ روم میں۔ کیا آپ اُس سے بات کریں گے''؟

''بعد میں کروں گا''۔ اسٹیو نے کہا۔ ''پہلے میں برتھا سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ لاش اُس نے دریافت کی تھی نا؟

وہ رہائشی کمرے میں آگئے۔ وہاں برتھا کو بُلایا گیا۔ وہ ہچکچاہٹ آمیز انداز میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی کمرے میں داخل ہوئی۔ اُس کے کان میں آلۂ سماعت لگا ہوا تھا۔ اُس کی گھبراہٹ دُور کرنے کے لیے اسٹیو مہربان انداز میں مسکرایا اور نرم لہجے میں بولا ''تمہارا کہنا ہے کہ تم نے نو بجے کے قریب لاش دیکھی تھی۔ اُس وقت تمہیں دھوپ والے برآمدے میں جانے کی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی؟''

''میں نو بجے وہاں صفائی کرتی ہوں''۔ اُس نے لرزتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ اُس کی آنکھوں میں نمی نظر آرہی تھی۔

مسٹر اگست وہاں آٹھ بجے جاتے تھے اور ایک گھنٹے تک دھوپ سینکنے کے علاوہ وہاں کام بھی کرتے ہیں..... معذرت! میرا مطلب ہے، کہ کرتے تھے''۔ ''لاش دیکھ کر تم نے سب سے پہلا کام کیا کیا''؟ اسٹیو نے پوچھا۔

''میں نے ہیٹر بند کردیا۔

''کیا؟''

''میں نے ہیٹر کا سوئچ آف کردیا۔ میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ مسٹر اگست مرنے کے بعد دھوپ میں جلتے رہیں''۔ برتھا نے تھوک نگل کر جواب دیا۔

''پھر تم نے مسز اگست کو بلایا؟''

''نہیں جناب، میں پولیس کو اطلاع دینے اندر جارہی

تھی کہ بیرونی دروازے کی طرف سے مسز اگست آگئیں۔ میں نے انھیں بتایا کہ مسٹر اگست کو گولی ماردی گئی ہے۔ انھوں نے آکر لاش دیکھی پھر انھوں نے ہی پولیس کو اطلاع دی۔ میں اپنے کمرے میں چلی گئی اور دروازہ اندر سے مقفل کرلیا کیونکہ مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا''۔

''گویا اس کے بعد سے اب تک تم نے کسی سے کوئی بات نہیں کی!''

''نہیں جناب''! اس کے بعد جون رابرٹ کو بُلایا گیا جو مسز اگست کا بھائی تھا۔ اُس کے اندازِ گفتگو سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ پولیس کی زیادہ سے زیادہ مدد کرنے کا خواہش مند ہے۔ اس کی عمر تقریباً چالیس سال تھی۔ اس کا لباس صاف ستھرا اور استری کیا ہوا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ابھی ابھی شیو بنا کر اور نیا دھو کر آرہا ہے۔ تجسّس کے مارے اُس کی بھنویں کمان بنی ہوئی تھیں۔

وہ پولیس کو بتانے لگا ''مجھے اس سلسلے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ میرے کمرے کے دروازے پر میری بہن یوجین یعنی مسز اگست نے دستک دی اور بتایا کہ کیسا سانحہ ہوچکا۔ میں جب نیچے آیا تو آپ لوگ موجود تھے''۔ اُس کے لہجے میں قدرے افسردگی شامل ہوگئی۔ ''میں آپ کو سچ سچ بتاؤں مسٹر اسٹیو! میں اپنے بہنوئی کی فرم میں ایک عام سیلز مین ہوں۔ گو میں آج تک کسی عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کرسکا لیکن میرے بہنوئی کے ماتھے پر کبھی بل نہیں آیا۔ اُس نے میری مراعات میں کمی نہیں کی۔ اُس کی موت میرے لیے بلاشبہ زبردست سانحہ ہے''۔

''کیا مقتول کا کوئی دشمن بھی تھا؟'' اسٹیو نے سوچتے ہوئے پوچھا۔

جون نے استخوانی کندھے اُچکائے ''شاید کوئی کاروباری رقیب رہا ہو''۔ اُس نے کہا۔ پھر دفعتاً جیسے اُسے کچھ یاد آگیا اور وہ اُنگلیاں چٹخاتے ہوئے بولا۔ ''یہ جو سزا یافتہ مجرم ولیم ڈین ہے۔ میں نے اور یوجین نے اسے ملازم رکھنے کی مخالفت کی تھی لیکن مسٹر اگست مرحوم نے اسے ملازم رکھ لیا۔ یوجین بتا رہی تھی کہ جس وقت لاش دریافت ہوئی اگست کا چہرہ جنوبی کھڑکی کی طرف تھا۔ ہوسکتا ہے ولیم نے اُس طرف سے گولی چلائی ہو''۔

''لیکن ولیم کا کوارٹر دوسری منزل پر ہے جبکہ یہ برآمدہ گراؤنڈ فلور پر ہے''۔ اسٹیو نے کہا۔

''بہرحال وہ ایسا کرسکتا تھا۔ مجھے یقین ہے اُس کی کھڑکی زمین سے صرف ساڑھے تیرہ فٹ کی بلندی پر ہے۔ اگست کے قریب تو ہیٹر بھی آن تھا۔ اُس کی روشنی نے قاتل کا نشانہ اور بھی آسان کردیا ہوگا''۔ جون نے کہا۔

''ہم اس مکان کا بھی جائزہ لیں گے مسٹر جون!'' اسٹیو نے کہا۔ اس نے ایک بار پھر بغور اُس نقشے کو دیکھا جس میں گولی چلنے کا زاویہ دکھایا گیا تھا۔ نقشہ دیکھتے وقت اس نے پُرخیال انداز میں ٹھوڑی کھجائی پھر جھک کر اس نازک کرسی کو دیکھا جس پر وہ بیٹھا تھا کہ کہیں وہ ٹوٹ تو نہیں رہی۔ نقشے کے لحاظ سے امکان یہی نظر آتا تھا کہ گولی گیراج کی طرف سے چلائی گئی ہے۔

مسز اگست کمرے میں آئی تو اس کا انداز جارحانہ تھا۔ اُس نے نفرت آمیز انداز میں ناک سکیڑ کر کہا۔ ''تم پولیس والوں کو تفتیش کی اتنی بے صبری ہوتی ہے کہ کسی کو صدمے سے سنبھلنے کا موقع بھی نہیں دیتے''۔ وہ بہت کچھ بولتی چلی گئی لیکن اسٹیو کے اندازے کے مطابق اُس کے لہجے میں صدمے کے تاثرات کے علاوہ باقی ہر تاثر نمایاں تھا۔

www.urdugem.com

''مسٹر اگسٹ کی وصیت یا انشورنس وغیرہ سے آپ کو کافی کچھ ملے گا؟'' اسٹیو نے سنجیدگی سے پوچھا۔

مسز اگسٹ کے گال غصّے سے تمتما اُٹھے تاہم اُس نے سوال کا جواب ضرور دیا۔ ''یقیناً.. لیکن بمشکل''۔

شکریہ مسز اگسٹ!'' اسٹیو نے اُس کی بات کاٹ دی اور اُسے رخصت ہونے کی اجازت دے دی۔ مسز اگسٹ حیرت زدگی کے عالم میں کمرے سے نکل گئی۔ اس کے جاتے ہی ہرلے نے کمرے میں جھانکا۔ ''اب آپ ولیم ڈین سے بات کریں گے!'' اس نے پوچھا۔

''نہیں''۔ اسٹیو نے جواب دیا۔ ''جون رابرٹ کو پولیس حراست میں لے کر پولیس لیبارٹری جاؤ اور اُس کے ہاتھوں کا معائنہ کراؤ۔ میں شرط لگانے کو تیار ہوں کہ اس کے ہاتھوں پر بارود کے ذرّات ضرور ہوں گے۔ کیونکہ اسی نے آٹھ اور نو بجے کے درمیان بندوق سے گولی چلائی ہے''۔

☆☆☆

حوالات کی کوٹھری میں جون رابرٹ پُرسکون نظر آنے کی کی کوشش کر رہا تھا لیکن اسٹیو نے دیکھا کہ سگریٹ سلگاتے وقت اس کی انگلیوں میں ہلکی سی لرزش تھی۔

''ٹھیک ہے مسٹر اسٹیو!'' جون نے گہری سانس لے کر ہار مانتے ہوئے کہا۔ ''یہ بتاؤ کہ تمہیں معلوم کیسے ہوا؟''

''تم ضرورت سے زیادہ معصوم بن رہے تھے''۔ اسٹیون نے کہا۔ تم بڑی شدّ و مد سے ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ تم اگسٹ کو اس لیے قتل نہیں کر سکتے کہ وہ تمہارے لیے سونے کے انڈے دینے والی مُرغی تھی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ موت کے بعد ساری دولت اور جائیداد تمہاری بہن کے ہاتھ میں آجاتی اور اس صورت میں یہ سب کچھ تمہارے لیے زیادہ سہل الحصول تھا''۔

''لیکن یہ کوئی ثبوت تو نہیں''۔ جون نے کندھے اُچکائے۔

''اس کے علاوہ تم نے مجھے ولیم ڈین کی کھڑکی کی صحیح صحیح بلندی بتادی۔ عام حالات میں تمہیں اس کا علم نہیں ہونا چاہیے تھا، تم محض اندازہ ظاہر کر سکتے تھے۔ پھر تم نے ایک بڑی غلطی یہ کی کہ باتوں باتوں میں اس کا اظہار کیا کہ تمہیں دھوپ کا ہیٹر چلنے کا علم تھا۔ جب کہ یہ بات ملازمہ برتھا نے میرے علاوہ کسی کو نہیں بتائی تھی''۔ اسٹیو نے کہا۔

''لیکن دھوپ کے ہیٹر سے جسم سینکنا اُن کا معمول تھا''۔ جون نے کہا۔

''درست لیکن جس وقت اگسٹ کی لاش دیکھی گئی تب اُس کا تاریک شیشوں والا چشمہ میز کی دراز میں تھا، جسے وہ ہیٹر کی چمک سے بچنے کے لیے لگایا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ کرسی گھما کر ہیٹر کی سمت اُس کی پشت کر دی گئی تھی۔ تم یقیناً فائر کرنے کے لیے ایک درخت پر ٹھیک ساڑھے تیرہ فٹ کی بلندی پر چڑھے ہو گے تاکہ ولیم کے کوارٹر کی کھڑکی سے اس کی مماثلت پیدا ہو جائے۔ اس وقت مسز اگسٹ گھر سے باہر تھیں۔ برتھا چونکہ بہری ہے اس لیے وہ فائر کی آواز نہیں سن سکی۔

اگسٹ کو گولی مارنے کے بعد تم برآمدے میں آئے اور کرسی گھما کر تم نے اس کا چہرہ دوسری کھڑکی کی طرف کر دیا''۔

جون رابرٹ تھکے تھکے انداز میں سر ہلا کر رہ گیا۔ اس کی انگلیوں کی لرزش کچھ اور بڑھ چکی تھی۔ ●●●

رانا محمد شاہد

ہم سب جانتے ہیں کہ صابن لگانے کی چیز ہے۔ کھانے کی نہیں لیکن یہ پڑھ کر یقیناً آپ حیران ہوں گے کہ امریکی ریاست فلوریڈا سے تعلق رکھنے والی ایک انیس سالہ لڑکی صابن بڑے شوق سے کھاتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اسے صابن کا ذائقہ بہت میٹھا محسوس ہوتا ہے۔

آپ نے مشاہدہ کیا ہوگا کہ ایک چھوٹا ڈھائی، تین سال کا بچہ اکثر چوری چھپے چھوٹے چھوٹے پتھر یا مٹی منہ میں ڈال لیتا ہے۔ اسے فوراً روکا جاتا ہے کہ اسے منہ سے نکالو۔ میری اپنی بیٹی دُعا جو تقریباً ۳ سال کی ہے، کھیلتے کھیلتے اچانک منظر سے غائب ہو جاتی ہے تو میں اُس کی ماں سے کہتا ہوں۔

صابن کھانے والی لڑکی

اس نے صفائی ستھرائی کی شے کو زبان کا چٹخارہ بنالیا

''دیکھو، دُعا کیا کر رہی ہے۔ یقیناً کوئی پتھر یا مٹی کھا رہی ہو گی'' اور عموماً ایسا ہی ہوتا ہے۔ دروازے کے پیچھے چھپ کر یا کمرے کے کونے میں الگ سے کھڑے ہو کر وہ یہ کام کر رہی ہوتی ہے۔ بچے تو بچے ہوتے ہیں۔ انھیں پتا ہی نہیں ہوتا کہ اُن کے لیے کیا چیز فائدے مند ہے اور کیا نقصان دہ۔ اِسی لیے اکثر وہ جو چیز بھی ملے، منہ میں ڈال لیتے ہیں۔

مشاہدے میں یہ بات بھی آئی ہے کہ جب ان ننھے بچوں کو ان کی مائیں نہلاتی ہیں تو وہ صابن اور شیمپو سے بننے والا جھاگ بھی کھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کچھ بچّے تو باقاعدہ جھاگ کھانے کے شوقین بن جاتے ہیں۔ اکثر نہانے کے دوران جھاگ کھاتے رہتے ہیں۔ تبھی مائیں ایک دن کہتی نظر آتی ہیں کہ جب یہ چھوٹا تھا تو جھاگ بہت کھاتا تھا۔

امریکی ریاست فلوریڈا سے تعلق رکھنے والی ۱۹ سالہ لڑکی ٹیمپسٹ ہینڈرسن بھی صابن اور سرف کھانے کی شوقین ہے۔ دلچسپ بات یہ کہ وہ اس کی اس حد تک عادی ہو چکی کہ صابن اور سرف کھانے سے اسے کبھی نقصان نہیں پہنچا۔

ہینڈرسن بتاتی ہے کہ اسے یہ عادت پانچ سال کی عمر میں پڑی۔ اس نے پہلی دفعہ جھاگ منہ میں ڈالا جو اسے بہت میٹھا محسوس ہوا۔ تب اس کی ماں گھر میں کپڑے دھو رہی تھی۔ ہینڈرسن ان دونوں اشیاء یعنی صابن اور سرف کی اتنی عادی ہو

www.urdudigest.com

چکی کہ ان سے چھٹکارا ممکن نہیں۔ وہ ہفتے میں پانچ صابن تک کھا جاتی ہے۔

ہینڈرسن اب ایک سمجھدار لڑکی ہے۔ نرسنگ کی طالبہ ہے اور یہ بات اچھی طرح جانتی ہے کہ صابن کھانا اس کی صحت کے لیے نقصان دہ اور خطرناک ہے لیکن وہ عادت سے مجبور ہے۔ صابن کے ڈبے پر لکھا انتباہی پیغام بھی نظر انداز کر دیتی ہے۔ وہ روزانہ صبح اُٹھ کر مہلک واشنگ پاؤڈر چاٹتی ہے۔

ٹیمپسٹ ہینڈرسن کی باتیں دلچسپ اور حیران کر دینے والی ہیں۔ وہ کہتی ہے ''مجھے سبز صابن زیادہ پسند ہے اور خاص طور پر اس کے بلبلے۔ مجھے صابن کھانے سے اتنی ہی صفائی محسوس ہوتی ہے جتنی کہ سرف سے کپڑے دھونے پر ملتی ہے۔''

صابن ہمارے روزمرہ استعمال کا حصّہ ہے۔ اٹلی کے قدیم دانش ور ایلڈر پلنی (Elder pliny) نے اس کے لیے لاطینی زبان کا لفظ سوپ (SOAP) استعمال کیا۔ عام طور پر صابن سے مراد ایک ایسی شے ہے جو نہانے دھونے یعنی صفائی کے لیے استعمال ہو۔ یہ ٹیکسٹائل انڈسٹری میں بطور چکنا مادہ (LUBRICANT) بھی استعمال ہوتا ہے۔

تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ صابن کے استعمال کی ابتدا ۲۸۰۰ قبل مسیح'' میں عراق کے شہر بابل سے ہوئی۔ بے بی لون کا مطلب ہے ''خدا کی جانب جانے والا راستہ''۔ ۱۵۵۰ قبل مسیح میں مصریوں نے حیوانی و نباتاتی تیل، الکلی (ALKALI) کی مدد سے صابن تیار کیا۔ اس کے بعد مختلف ممالک میں صابن تیار کیا جانے لگا۔ بارہویں صدی میں چین، ۱۳ ویں صدی میں شام اور نابلوس جبکہ پندرہویں صدی میں اہل یورپ صابن تیار کرنے لگے۔

محققین کا یہ بھی کہنا ہے کہ دنیا میں صدیوں پہلے صابن شام کے شہر حلب سے تیار ہونا شروع ہوا۔ حلب میں بنایا جانے والا یہ صابن مشرق وسطیٰ کے ساتھ ساتھ دنیا بھر میں مشہور ہوا۔ آج بھی شام کا یہ شہر زیتون اور ناریل کے تیل سے بننے والے صابن کے حوالے سے اپنی الگ پہچان رکھتا ہے۔ اس سے شام کو کروڑوں ڈالر آمدن حاصل ہوتی ہے۔ البتہ گزشتہ کئی سالوں سے شام میں جاری جنگ کی وجہ سے جہاں دوسری بہت سی چیزیں متاثر ہوئی ہیں، وہیں صابن کی صنعت کو بھی شدید نقصان ہوا۔

صابن کے حوالے سے یہ بات دلچسپی کی حامل ہے کہ حلب میں نسل در نسل صابن بنانے کی ترکیب اہم راز سمجھی جاتی ہے۔ حلب شہر میں تیار کردہ صابن کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ بغیر کسی کیمیائی اجزاء کے تیار کیا جاتا ہے۔ اس کی تیاری کے لیے کم از کم ایک سال کا عرصہ درکار ہوتا ہے۔ صلیبی جنگجوؤں نے گیارہویں صدی عیسوی میں پہلی بار حلب شہر کے اس صابن کو یورپ میں متعارف کروایا۔ صابن بنانے کا عمومی طریقہ یہ تھا کہ زیتون کو جمع کیا پھر اسے اُبال کر دوسرے اجزا سے ملایا جاتا۔ پھر ایک مخصوص طریقے سے فرش پر ڈال کر سات ماہ تک ٹھنڈا کیا جاتا۔ یوں صابن تیار ہوتا۔

۱۸۶۵ء میں صابن کے حوالے سے ایک اہم پیش رفت ہوئی جب ''ولیم شے پرڈ'' نے مائع (Liquid) صابن متعارف کروایا۔ پھر ۱۸۸۹ء میں ''بی جے جانسن'' نے ''PALMOLIVE'' نامی صابن متعارف کروایا۔ جس میں پہلی بار زیتون کا تیل استعمال ہوا۔ اس کے بعد صابن کی تیاری میں گلیسرین کا اضافہ بھی کیا گیا تاکہ جلد نرم اور ملائم رہے۔

آج کے جدید دور میں صابن کی تیاری میں جراثیم کش مادے اور خوشبودار مادے شامل کیے جاتے ہیں۔ صابن کی بہت سی اقسام ہیں۔ جو مختلف کاموں کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ جیسے ہاتھ منہ دھونے، نہانے، کپڑے دھونے اور برتن دھونے کے لیے الگ الگ قسم کے صابن استعمال ہوتے ہیں۔

گل رعنا

تکلیف دہ تکلّف

ایک شرمیلے نوجوان کی کہانی، میزبان کی مہمان نوازی اس کے لیے وبالِ جان بن گئی

ہم اور آپ کسی کے گھر جائیں تو عام طور پر اپنے ذہن میں کوئی مقررّہ وقت سوچ کر جاتے ہیں۔ اس کے بعد ہم میزبان کو آرام سے اللہ حافظ کہہ کر واپس آجاتے ہیں لیکن بعض لوگوں کے لیے یہ اتنا آسان کام نہیں ہوتا۔ جب اللہ حافظ کہنے کا وقت آئے تو ایسے شرمیلے مہمان اچانک کھڑے ہو کر کہتے ہیں ''اچھا! میرے خیال میں اب مجھے.....'' یہ سُن کر میزبان کہتا ہے ''ارے! ابھی سے جا رہے ہیں؟'' اتنی جلدی؟'' اور مہمان کو دوبارہ بیٹھنا پڑتا ہے۔

اس صورت حال کی سب سے دردناک داستان میرے دوست جونز کی ہے۔ وہ تئیس برس کا سیدھا سادا شرمیلا نوجوان تھا۔ وہ لوگوں سے دُور نہیں بھاگ سکتا تھا۔ وہ خود اتنا سچّا تھا کہ دوسروں کی اخلاق میں کہی بات کو بھی سچ سمجھ لیتا۔ اس قدر ایمان دار تھا کہ کسی سے جھوٹ نہ بول پاتا اور تمیز دار اتنا کہ کسی سے بداخلاقی کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

ایک دفعہ اُس نے دفتر سے چھ ہفتے کی چھٹیاں لیں۔ پہلی چھٹی والے دن ہی وہ اپنے ایک عزیز سے ملنے چلا گیا۔ اُس نے تھوڑی دیر گپ شپ کی، دو کپ چائے پی اور پھر آخر کار اچانک کہا ''اچھا! اچھا! میرے خیال میں اب مجھے...''

مگر میزبان خاتون نے کہا ''اوہ نہیں مسٹر جونز! کیا آپ تھوڑی دیر کے لیے مزید نہیں رُک سکتے؟''

جونز نے سچ بولتے ہوئے کہا ''اوہ ہاں! کیوں نہیں۔ میں... میں رُک سکتا ہوں''۔

''تو پھر مت جائیں پلیز!'' میزبان نے کہا اور وہ رُک گیا۔ میزبان ہر تھوڑی دیر بعد اُسے چائے پیش کرتے رہے۔ اُس نے پورے دن میں گیارہ کپ چائے پی۔ شام ہونے والی تھی۔ وہ پھر کھڑا ہو گیا۔ ''اب'' اُس نے شرماتے ہوئے کہا ''میرا خیال ہے کہ مجھے واقعی...''

''اوہ! کیا آپ کا ابھی جانا ضروری ہے؟'' میزبان خاتون نے اخلاق سے کہا ''میں نے سوچا اگر آپ ہمارے ساتھ آج رات کا کھانا کھاتے تو...''

''اوہ اچھّا! میں کھا لوں گا مگر.....'' جونز نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''بس تو پھر رُک جائیے! میرے شوہر بھی بہت خوش ہوں گے''۔ میزبان بولیں۔

''جی بہتر! میں رُک جاتا ہوں''۔ جونز نے مَری مَری آواز میں کہا اور دھم سے اپنی کرسی پر گر پڑا۔ وہ اب پریشان ہو چکا تھا۔ چائے پی پی کر اُس کا معدہ باہر اُلٹ رہا تھا۔ اُس کے

www.urdugem.com

پاس کرنے کے لیے کوئی بات بھی نہیں رہی تھی لیکن وہ میزبانوں کے اخلاق کے آگے خود کو مجبور پا رہا تھا۔ بالآخر خاتون کے شوہر گھر آ گئے۔ انھوں نے رات کا کھانا کھایا۔ کھانے کے دوران سارا وقت جونز ساڑھے آٹھ بجے اُٹھنے کا منصوبہ بناتا رہا۔ اُدھر میزبان خاندان یہ سوچتا رہا کہ مسٹر جونز ہماری باتوں میں دلچسپی نہیں لے رہے۔ کیا وہ بدمزاج ہیں یا محض احمق؟

کھانے کے بعد میزبان خاتون اپنے خاندانی البم دکھانے لگیں جن سے جونز کو ذرا بھی دلچسپی نہیں تھی۔ اپنے اور شوہر کے رشتے داروں کی تصاویر، شوہر کے چچا کے دوست کی بنگالی فوجی یونیفارم میں تصویر، اپنے بھائی کے بچوں کے ٹیوٹر کی فوٹو، شوہر کے دادا کے بزنس پارٹنر کے کُتّے کی تصویر، چچا کی بیگم کے بھائی کی بیوی کی تصویر اور اپنی دوست کے شوہر کے دوستوں کی تصاویر!

رات کے ساڑھے آٹھ بجے تک جونز اکہتّر (۷۱) تصاویر دیکھ چکا تھا اور انہتّر (۶۹) دیکھنا باقی تھیں۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ ’’مجھے شب بخیر کہنے کی اجازت دیجیے‘‘۔ اُس نے التجا کی۔ ’’شب بخیر؟ لیکن ابھی تو صرف رات کے ساڑھے آٹھ بجے ہیں؟‘‘

’’کیا آپ کو کوئی اور ضروری کام ہے؟‘‘ میزبانوں نے کہا۔

’’جی...... جی نہیں تو!‘‘ اُس نے تسلیم کیا اور اُس کے ذہن میں چھ ہفتے کی چھٹیاں گھوم گئیں۔ جن میں اُسے واقعی کوئی ضروری کام نہیں کرنا تھا۔ اسی وقت پتا چلا کہ میزبان خاندان کے سب سے شرارتی بچّے نے مسٹر جونز کا ہیٹ کہیں چھپا دیا ہے، لہٰذا بچّے کے والد نے کہا کہ اب ہیٹ ملنے تک تو اُسے ان کے ساتھ رُکنا ہی پڑے گا۔

انھوں نے جونز کو سگار پینے اور گپ شپ کی دعوت دی جس میں سگار خود انھوں نے پیا اور جونز کے حصّے میں صرف گپ شپ آئی جو صاحب خانہ کے بچوں اور دفتری مصروفیات پر مبنی تھی اور اس سب سے اُس غریب کو مطلق دلچسپی نہ تھی۔

جونز ہر تھوڑی دیر بعد اُٹھنے کی کوشش کرتا مگر ناکام رہتا۔

جب باتیں کر کر کے صاحب خانہ تھک گئے تو انھوں نے جونز سے کہا کہ وہ آج رات یہیں ٹھہر جائے کیونکہ رات کافی ہو چکی۔ اس وقت گھر جانا مناسب نہیں۔ جونز کچھ نہ کہہ سکا اور مہمان خانے میں جا کر سو گیا۔ میزبان نے اپنی بیگم سے کہا، ’’یہ عجیب چپکو آدمی ہے بھئی! ذرا سا اخلاق کیا دکھایا، یہ تو رہنے پر ہی تُل گیا‘‘۔

اگلے دن ناشتے کے بعد صاحب خانہ اپنے کام پر چلے گئے اور جونز اُن کے بچوں کے ساتھ کھیلتا رہ گیا۔ وہ بار بار اجازت لینے کے لیے مناسب جُملے سوچتا رہا مگر ہر دفعہ ناکام رہا۔ شام کو صاحب خانہ نے اُسے اپنے گھر پر ہی پایا تو حیران رہ گئے۔ پھر بظاہر مذاق میں بولے، ’’لگتا ہے آپ سے ہمیں گھر میں رہنے کا کرایہ لینا پڑے گا‘‘۔ سیدھا سادا جونز اسے حقیقت سمجھا اور ایک مہینے کا کرایہ نکال کر صاحب خانہ کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

اگلے چند روز اُس نے ڈرائنگ روم میں خاموشی سے بیٹھ کر گزار دیے۔ ورزش اور تازہ ہوا کی کمی سے اُس کی صحت خراب ہونے لگی۔ وہ اپنا وقت چائے پینے اور تصاویر دیکھنے میں گزارنے لگا۔ اُس کی ذہنی حالت خاصی خراب ہو گئی۔ وہ گھنٹوں صاحب خانہ کے چچا کے دوست کی تصویر سے باتیں کرتا رہتا۔ آخر کار اُسے بہت تیز بُخار ہو گیا۔ وہ اب کسی کو نہیں پہچان رہا تھا۔ کبھی کبھی ایک دم بستر میں اُٹھ کر بیٹھ جاتا اور چلّا کر کہتا، ’’میرے خیال میں اب مجھے...‘‘ اور پھر تکیے پر گر پڑتا۔ پھر اُٹھ کر چلّاتا ’’چائے کا ایک اور کپ اور مزید تصاویر لائی جائیں‘‘۔ اُس کی چھٹی کے آخری دن اُس کا انتقال ہو گیا۔

میزبانوں نے لوگوں کو بتایا۔ ’’جب آخری وقت آیا تو وہ بستر پر اُٹھ بیٹھا۔ اُس کے چہرے پر اعتماد بھری مُسکراہٹ تھی اور پھر اُس نے کہا، ’’مجھے فرشتے بُلا رہے ہیں۔ اب مجھے اجازت دیجیے۔ اللہ حافظ!‘‘ اور اُس کی رُوح جسم کی قید سے اس تیزی سے نکل گئی کہ پیچھے پلٹ کر بھی نہ دیکھا!!!

ROSHAN
Packages Limited.

سالانہ خریداری فارم

نام .... فون نمبر ....

پتا .... ای میل ....

میں ماہ .... 20ء سے اُردو ڈائجسٹ کا سالانہ خریدار بننا چاہتا ہوں۔ مجھے اُردو ڈائجسٹ ارسال کر دیجیے۔

1۔ بذریعہ وی پی میں سالانہ قیمت پوسٹ مین کو ادا کر دوں گا۔ یا

2۔ میں مطلوبہ رقم .... روپے کا بینک ڈرافٹ / منی آرڈر ارسال کر رہا ہوں۔ یا

3۔ میں نے .... روپے اُردو ڈائجسٹ کے اکاؤنٹ نمبر IBAN#-Pk18 BPUN 1100 0280 0380 0000 بینک آف پنجاب سمن آباد میں آن لائن جمع کروا دیے ہیں۔ یا

4۔ خریداری کے لیے ہمیں ای میل کریں subscription@urdudigest.pk۔ یا

5۔ ہمیں 0333-4713631 پر ایس۔ ایم۔ ایس کریں۔ ہمارا نمائندہ آپ سے رابطہ کرے گا۔

تاریخ .... دستخط ....

اُردو ڈائجسٹ۔ سرکولیشن منیجر۔ 325,G-III جوہر ٹاؤن لاہور پاکستان
فون نمبر: +92-42-35290734-8, +92-42-35290707

CHANGING DNA OF YOUR BUSINESS
www.roshanpackages.com.pk
info@roshanpackages.com.pk
RoshanPackages.LTD
Roshan Packages Limited
roshan_packages
HEAD OFFICE
325 G-III, M.A. Johar Town, Lahore - Pakistan
Ph: 92 42 35290734-8, 0308-8882368

www.urdugem.com